DUE DATE

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

اردو کے معیاری ادبی رسائل کا انتخاب پیش کرنے والا ماہنامہ

شاہ کار

خاص نمبر

۱۹۵۷ء کا بہترین ادب

قیمت

سالانہ مع خاص نمبر
دس روپے

فی پرچہ
ایک روپیہ

خاص نمبر
تین روپے پچاس نئے پیسے

مکتبہ شاہ کار، الہ آباد ۲





افکار
جوش نمبر

صہبا ادب













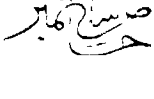
شاہکار خاص نمبر













रजिस्टर्ड
कुदरती तेल
قدرتی تیل رجسٹرڈ
QUDRATI TEL
REGISTERED
QUDRATI TEL
कुदरती तेल
रजिस्टर्ड
हर इलाके के
लोगों का घरेलू डाक्टर
यह तेल जोड़ों के दर्द, कटने, जलने,
चोट मोच, छाती पीठ कमर आदि
के दर्दों में लाभदायक हैं
KARKHANA DARUSSEHAT
KDS
रजिस्टर्ड ट्रेड मार्क
DARUSSEHAT
कारखाना दारुस्सेहत (रजिस्टर्ड)
मऊनाथ भंजन, यू.पी.

ابوالفضل صدیقی

باپ

عمر ساٹھ سے متجاوز تھی پھر بھی وہ جانے والا نہ تھا۔ کھیتی باڑی میں بیٹے کا دست راست بنا ہوا تھا۔ ایک چیت کے گرم دن میں اچھا خاصا دو بیگہ کھیت کاٹ کر پلٹا گھر پہنچ کر سیدھا ہاتھ سن سا محسوس ہوا۔ گھر میں کسی سے ذکر بھی نہ کیا اور دوسرے روز کام پر پہنچ گیا۔ جب دن میں اس کیفیت کا عادی ہو گیا۔ کام میں کوئی قباحت تو تھی ہی نہیں اور ابھی فصل کھلیان ہی میں تھی کہ دوسرا ہاتھ جیسے سو گیا۔ کام زیادہ تھا، پرانا آدمی بیٹے سے بیان کرنا اپنی کسر شان سمجھا۔ جب اناج اٹھ کر گھر آ گیا تو گھر والوں سے بیان کیا۔ ارنڈ کے پتے تیل چپڑ کر باندھے ہلکا سینک کیا مگر کوئی فرق نہ پڑا اور پھر ہلکی جھنجھناہٹ محسوس ہوئی جو کچھ عرصہ بعد سوزش میں تبدیل ہو گئی اور ہاتھ پاؤں اور بدن پر جگہ جگہ جھائیاں سی اچھل آئیں جو چینت دار کھال میں نمایاں ہو تی ہو گئیں۔ مگر حرکت میں کوئی دقت نہ ہوتی، البتہ لامسہ غائب ہو گئی۔ یہاں تک کہ پہلے ناخنوں کا رنگ خراب ہوا اور پھر جھڑنے لگے، پاؤں اور ہاتھوں پر کھال پھٹنے لگی اور سب سمجھ گئے کہ بڈھے کا خون دوکھا گیا اور بدن پھوٹ رہا ہے۔

دیہات میں ہیضہ اور طاعون کی عالمگیر وبا سے اتنا نہیں ڈرا کرتے جتنا کوڑھ سے خائف ہو چھوت کرتے اور گھناتے ہیں۔ پہلے مادھو کے گھر میں بینک پھیلی اور خاموشی کے ساتھ بڈھے کو چوپال کی ایک بغلی کوٹھری میں منتقل کر دیا۔ ساتھ ہی پڑوسیوں میں بات پہنچی اور تمام بستی میں چرچا ہو گیا۔

"کوڑھ اڑ کر لگتی ہے!"
"کوڑھ لاعلاج ہے!"

"کوڑھ سات گھر چاروں طرف پھیلتی ہے!"

جتنے منہ اتنی باتیں۔ پانچ چھ سو نفوس کی مردم شماری کے چھوٹے سے گاؤں میں یہ راس سی پھیل گئی۔ اور مادھو تو سامنے پڑتا ہی نہ تھا، لوگ مادھو سے اجنبیت سی محسوس کرنے لگے جیسے کچھ غالباً ... متعدد ہوئے۔ مادھو نے پہلے تو گاؤں کی چہ میگوئیوں کو اس کان سن اس کان اُڑایا اور گویا ... لیکن اس سے کچھ کھلم کھلا ہمیشہ آفیسر کی طرح مطالبہ تو کر ہی نہ سکتے تھے، بعض بوڑھے ہمدردانہ الفاظ میں مربیانہ انداز کے ساتھ خود اس کو اور اُس کے بیوی بچوں کو چھوت لگ جانے کے ڈر سے آگاہ کرتے اساتھ ہی ساتھ بڈھے کی حالت زار پر افسوس کر کے مٹی عزیز ہوتی ہے بڈھے کی دعا دیتے اور دبے لفظوں میں دو ایک احتیاطی تجویزیں جو اُن کے تجربہ میں علم سینہ کے راوید پہنچی تھیں بیان کر ہی دیتے۔ بعض کھرے جوان کھلم کھلا دو ایک لفظ چست کر دیتے اور کچھ زیادہ منہ پھٹ اور گہرے دوست اور کچھ نہیں تو چلتے چلتے سلام دعا کے ساتھ بیٹے سے باپ کی طبیعت تو پوچھ ہی لیتے رسمی فرض میں لپیٹ کر خلوص کا میٹھا سا تیر پھینک دیتے اور جتنا اور جہاں سے مادھو کتراتا رہا اتنی ہی سب کی ہمدردیاں بہی خواہیاں اور نصیحتیں بڑھتی گئیں۔ یہ سب کسان تھے اور مادھو بھی کسان تھا اور یہ ایک دل پر باپ، راجہ اور ایشور کے پالہ راست شجرہ کا نقشہ پتھر کی لکیر کی طرح کھنچا ہوا تھا اور ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا کہ مادھو کی زمین کہ وہ باپ کی ملکیت ہے اور باپ کی وراثت سے اسے زمین پہنچتی ہے اور زمین راجہ کی ہے اور راجہ کو ایشور نے دی ہے اور اس رشتہ سے باپ ایشور کا اوتار ہے۔

کوڑھ ایشور نے بھیجی ہے

مگر بات اپنی بستی سے چل کر ارد گرد دیہات میں جا پہنچی اور بڑی بات تو آگ کی طرح پھیلتی ہے گھر میں سہتر زبانی مگر گاؤں میں پھیل ہی گئی اور اب جیسے دیہات کی اندھیری کوٹھری میں سے کوئی بھوت پریت اُٹھتا اور مادھو اپنا گاؤں چھوڑ آس پاس کے گاؤں تک میں اپنے باپ کے ایک ایک زخم اور ناسور کا نقشہ بڑے پیمانہ میں ہر کس و ناکس کی زبانی سنتا۔

"اس حیلت میں بڈھے کی سیدھے ہاتھ کی تین انگلیاں جھڑ گئیں!"

"بھادوں میں سنا ہے اُپلے پاؤں میں کیڑے پڑ گئے تھے!"

"اب تو سنتے ہیں سو تولہ پر ٹیک رہی ہے!"

"گیہوں پر کھاج بھی شروع ہو گئی!"

"پاؤں کی تو سنتے ہیں دس ٹیک پڑیں!"

"الٹی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ نئے سدھا ہاتھ ڈنڈ ہو گیا ہے۔ ناک پر ٹیک رہی ہے۔"

اور کوئی کوئی بہت ہی زیادہ ہمدرد کہتے سنائی دیتا ہے "جنم کرم بگڑ گئے بچا دئے ایسا چھڑا ہے"، اور بعض نہایت لفظی صاف صاف بول رکھا ہے "جی پچھلے جنم کی بھوگ بھاگ رہے ہیں۔"

برابر کے گاؤں میں اٹھواڑے میں آٹھویں دن بیس گاؤں کی بھاری پینٹھ لگا کرتی ہے۔ پینٹھوں سے دیہاتیوں کی کاشتکارانہ تجارت کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گاؤں کی چھوٹی پنچایتیں نمٹتی ہیں۔ دیہاتی "قانون پالیسی" اور بازار کے بعض مسائل بھی کبھی کبھی طے ہو جاتے ہیں۔ اجناس کے مقامی بھاؤ کھلتے ہیں۔ ذاتی کاموں کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ صفائی جھگڑوں کا تصفیہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اکثر پٹواریوں کے فیصلوں اور زمینداروں کی زیادتیاں سربازار ہوتی ہیں اور بیٹھے بیٹھے ساہوکاروں کے قرضے ایک گوشے میں بیٹھ کر چپکے سے چکائے جاتے ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیجیے ایک دو مرتبہ جب سے گیہوں کی گرد میں پیٹ سے زیادہ زمیں پر چڑھ جاتی ہے تو حسب ضرورت گھنٹہ آدھ گھنٹہ لٹھ بازی بھی ہو لیتی ہے اور لاٹھیوں سے ٹھنسا بھی نکال دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑا بہت فاضل اناج اور ہفتے کے ہفتے پابندی سے ساتھ اپنی بھینسوں کا گھی اور اپنی ایکھ کا گڑ لے کر مادھو پینٹھ جایا کرتا۔ پینٹھ کی معمولی تجارت میں نہ تو کمپیٹیشن ہوا کرتا ہے، نہ معاصرانہ چشمک اور نہ اقتصادی جوڑ توڑ۔ خالص ضرورت کی اسپرٹ سارے دیہاتیوں کو جمع کرتی ہے اور زیادہ تر لین دین تبادلے کی شکل میں ہوتا ہے اور گاؤں گاؤں اور گھر گھر کی ایک آدھ چیز کی "گڈوِل" اور شہرت سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے اور باپ دادا کے زمانے سے مادھو کے گھی اور گڑ کی کوالٹی سے معاملات تمام دیہات میں ممتاز چلا آرہا تھا۔ ایک دو پینٹھ چھٹے ہی پیچھے کچہری کی اور مادھو کو تو بڑی حیرت ہوئی کہ اس کی ساکھ کو دھکا پہنچ گیا۔ شروع شروع میں مستقل گاہکوں اور بیوپاریوں کے

قدرے سرد رویہ سے اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس کے بعد دوسری تیسری پینٹھ سے اُسے اندازہ ہو گیا کہ گاہک اس سے کترانے لگے ہیں اور معلوم ہو گیا کہ اس کے باپ کی کوڑھ کی خبر پینٹھ کے حلقے کے چوبیسوں گاؤں میں وبا کی طرح پھیل چکی ہے اور اس نے غور کیا کہ عورتیں ڈری ڈری نظروں سے اس کے گھی کی مٹکیاں اور گڑ کی بھیلیاں دیکھتی نکل جاتیں اور اس کے محاذ سے چند قدم نکل کر سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں۔ پرانے مستقل گاہک اس کے بیوپاری سے کترا کر نکل جاتے ہیں اور دوسری جگہ سے خریدتے ہیں اور اگر دور سے کسی سے نگاہیں چار بھی ہو جاتیں تو آنکھ چرا کر منہ پھیر لیتے ہیں اور شہر کے بیوپاری جو سب سے پہلے جھپٹ کر بھاؤ بڑھا کر اس کے گھی کی بوند بوند ٹپکا کر اپنے کنستر بھر لیا کرتے اور ہاتھوں ہاتھ گڑ کی ڈلی ڈلی اٹھا کر بوری بند کر لیا کرتے تھے، آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں ہی ڈھٹائی کے ساتھ سامنے سے نکلے چلے جاتے اور اگر زیادہ متوجہ کرنے کے لئے مادھو نے پہل کر کے "لالہ سلام" کہہ کر ذرا ہاتھ اُٹھا دیا تو لالہ بجائے گھی گڑ کا بھاؤ پوچھنے کے پُرخلوص انداز میں گھر کی خیریت دریافت کرتے اور مادھو کے "بھگوان کی کرپا ہے" کے رسمی جواب کے جواب میں لالہ نہایت پُر رقت لہجے میں ہمدردی کے ساتھ باپ کی طبیعت پوچھنے لگتے۔ اس عیادت کے پردہ ہی میں دعا سلام خیریت پرسش ہمدردی سب کا میزان بازار اور ساکھ پر آ لگتا۔ ساتھ ہی ساتھ لالہ مادھو کے مال پر نگاہ ڈال کر بات کرتے کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں تول لیتے کہ کتنی پینٹھ سے مال صاف نہیں ہوا ہے اور دل ہی دل میں مادھو کی خسیہ فروشی کی نوبت آ جانے کی امید لگاتے۔ پھر مادھو کی مجبوری بھینسوں کا چاندی سا گھی کڑوے تیل کے بھاؤ اور سونا سا گڑ کالے شیرے کے رخ سے خریدیں گے اور بازار اور پینٹھ کے دن کے علاوہ کسی اور دن علیحدہ اندھیرے اجالے کہیں جنگل یا کھیتوں میں چپکے سے سودا چکانے کی سوچتے۔ بھولے بھالے دیہاتی گاہکوں کے تیوروں میں معذرت ہوتی۔ چری چری آنکھیں کہتی گزر جاتیں "مادھو بھیا تمہارا گھی امرت سا! تمہارا گڑ کندن سا! اور ہم تو برسوں سے تمہارا ہی گھی گڑ کھاتے چلے آئے ہیں۔ پر اب کیا کریں ـــ تم تو ایک کوڑھی کو گھر میں ڈالے بیٹھے ہو" اور مادھو کے کلیجے میں بچھو سے ناچ جاتے ـــ وہ اپنے

گھی پر نگاہ ڈالتا پینٹھ بھر میں سب سے زیادہ مہکتا دانہ دار گھی اس کا ہوتا۔ وہ اپنے گڑ کی بھیلیوں کو دیکھتا یوں تو چوبیسوں گاؤں گھر گھر گڑ بنتا تھا اور ساری پینٹھ گڑ سے پٹی رہتی تھی، پھر ایسا سفید، مصری سا گڑ، اپنی پینٹھ تو در کنار بارہ بارہ کوس آس پاس کی پینٹھوں میں بھی کہیں نظر نہ آتا اور وہ بازار میں بیٹھا مکھیاں مارا کرتا۔ مکھیاں جو اسے اپنے گڑ کی کوڑھ اور گھی کے ناسوروں پر بھنبھاتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور چوتھی پانچویں ہی پینٹھ مادھو کو بھی اور شہر کے سب بیوپاریوں، بنیوں اور پینٹھ کے چوبیسوں گاؤں کے ایک ایک آدمی کو بھی مادھو کے گھر کی گھی، گڑ جیسی نعمتوں میں جذام کے کیڑے بجبجاتے دکھائی دینے لگے اور کیڑوں پڑے مال پر گاہک ہنس پڑا کرتا اور مادھو تو ایک ٹٹ پونجیا کسان تھا۔ تجارتی بائیکاٹ کا دھکا تو بڑی بڑی سلطنتوں اور قوموں کو سرنگوں کر دیتا ہے۔ بیٹے نے کوڑھی کو گھر میں رکھنے کا خطرہ برداشت کیا۔ پردیسوں کی ٹھیس اور گاؤں والوں کے طعنے سنے تشکایتیں سہیں، ورنہ سماج نے تو کوڑھی کو خارج کر دینے کا فتویٰ روزِ ازل سے لگا رہا ہے۔ کیونکہ سماج میں نہ کوڑھی باپ ہوا کرتا ہے نہ بیٹا، نہ بھائی برادر نہ پڑوسی اور نہ ہم وطن۔ صرف کوڑھی ہی کوڑھی ہے اور اب تک تو مادھو کو باپ پہلے نظر آتا تھا اور دھندلا دھندلا سایہ سا بڑھی بعد کو۔ لیکن اب اس کو بھی صرف کوڑھی ہی کوڑھی دکھائی دینے لگا اور بڈھا بھی کوڑھی کو خوب پہچانتا تھا۔ خود ہی سوچ سمجھ کر تجویز پیش کر دی اور جگہ بھی بتا دی۔ بستی سے آدھے کوس پر جنگل میں ایک ٹیلا تھا جس پر گھاس اگتی تھی اور جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ اور ایک نیم کے درخت کی چھاؤں میں باپ کی جھونپڑی چھا دی اور چوپال کی کوٹھری سے منتقل کر دیا۔ سب کو مادھو کا یہ اقدام بڑا اچھا معلوم ہوا اور سب سے اچھا خود مادھو کے حق میں ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد دوسری تیسری پینٹھ گاہکوں کی نگاہ میں گڑ کی مٹھاس اور باتوں میں گھی کی چکناہٹ پیدا ہو گئی اور چوتھی پانچویں پینٹھ تک دیہاتی بے تار برقی کے ذریعے تمام حلقے میں بات پہونچ گئی اور ساکھ بحال ہو گئی۔ گاؤں کا کوئی آدمی حتیٰ کہ ہمیشہ سے ٹیلے پر مویشی چرانے والے چرواہے آس پاس کے گاؤں کے بھولے بھٹکے راہگیر تک اب اس ٹیلے کی جانب نہ جاتے۔ البتہ بستی کا واحد انسان مادھو صبح شام آتا۔ تنومند تندرست بیٹا نحیف و نزار خستہ باپ کے لئے روٹی لے کر سیدھے کندھے پر

[illegible] مٹی کھڑے پتے کی گھنی تیز کی لپکتی روٹی بندھی ہوتی
[illegible] کی جھاگل [illegible] کی تھال کا یہ نالے روزانہ دونوں وقت
[illegible] دروازے پر پہنچ کر آہستہ سے کھکارتا اور کھٹا پر
[illegible] کا کٹھوا بڑھا دیتا بٹیا احتیاط
سے [illegible] تیکھے [illegible] ہوتے [illegible] لاٹھی سیدھی کر دیتا۔ کبھی
[illegible] اپنی لاٹھی سے سر کے سرک کر بڑے کے کٹھوے
[illegible] کٹھورا گھڑے کے منہ پر جما دیتا۔ اس سرے
[illegible] کی تیز [illegible] کا مرتبہ ہر دم ہوتا جس پر
[illegible] گھر سے تاک [illegible] دوسری مرتبہ
[illegible]

[illegible] بیٹیا!
[illegible] افسوس [illegible] عادت ہو گئی جو تو الفت [illegible] مگر پھر تو یہ
معمولات زندگی میں شامل ہو گیا تھا جیسے بیلوں کو چارہ ڈالنے اور زمین جوتنے، تلائی
گوڑائی کرنے جیسے معمولات میں نہیں [illegible] زمین پر رکھا دینے [illegible] سینچائی کرنے جیسا بیکار
عمل۔ سماجی بیگار۔ مگر ڈیوٹی پر جل پڑھانے والی بات بھی نہیں مگر کبھی کبھی آتے جاتے یک دم
پیچھے سے روٹی پیڑ کی آواز سنائی پڑ جاتی "بابو" [illegible] بات کا جواب ہوتی اور وہ
[illegible] بس جیتا ہی بیٹا! — اور پھر اس سے خوب دو پہر [illegible] احساس بھی
[illegible] شروع میں بڈھے کو چویال کی کوٹھری سے کی ٹھوکر [illegible] پہنچانے کے
[illegible] والوں اور [illegible] والوں کے [illegible] سے پیدا ہوتا تھا۔ کیونکہ [illegible] بھول گئے
تھے [illegible] گھر میں رکھے [illegible] گاؤں والوں کو یاد نہ رہا تھا کہ کوڑھ اندر لگتی
[illegible] میں سے کوڑھ کے کیڑے چپکے ہی چپکے رینگ گئے تھے۔ خوشبودار گھی کا زمانہ
[illegible] گیا تھا کیونکہ ان سے گڑ کی بھیلیاں گاہکوں کو ترکیب سے لگی تھیں۔

(۳)

اور جیسے مادھو اچھل سا پڑا۔ اسے کسی نے پانچ سال پیچھے ... وہ گویا پڑے زور سے للکارا " او کوڑھی کی اولاد! " "کوڑھی کے گھناؤنے بچے!" اس سے پہلے ... دار اتنا پیٹ ہوتا دیکھا کہ سب کے سب کوڑھی کے گھناؤنے بچے تو ... لوگ دکھائی دے گئے۔ اور جب تین تر لوگ دکھائی دیتے ہیں تو نگاہوں کے آگے ... ناچتی ہیں۔ سر پتنگو کی طرح گھومتا ہے اور پھر آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ ... کے سیٹھ نے خبر سنائی کہ جب وہ اس کی بیٹی کی بات لے کر اور بیٹے کی بات لانے ... میں گیا تو ہر جگہ لڑکے لڑکی والوں نے جواب دیا کہ ہم کوڑھی کے گھر کی ... کوڑھی کے گھر بات بھیجیں گے اور یہ بات سن کر تو باپ کی کوڑھ کا ایک ایک ... مادھو کے رونگٹے رونگٹے پھوٹ پڑا۔

اور گاؤں کے سیٹھ نے مادھو کی نگاہیں اپنی بسنتی اور اپنے رگھو کی ... میں میٹھا میٹھا نشہ جیسا اٹھان اٹھتی ہوئی بیٹی۔ بسنت کی بیٹی شرمائی شرمائی سی ... کلی کی طرح آہستہ آہستہ مسکراتی سی ——— اور بھادوں میں جھومر مٹی کو چیرتا پھاڑتا بانس کا اٹھتا ہوا کلّا سا بیٹا ——— جیسے بھگوان نے بیٹا اور بیٹی بناتے وقت بنانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہاتھ پاؤں کے ایسے کہ گیارہ اور تیرہ ہی کی عمر میں پہاڑ جیسا اٹھان اور چٹان جیسی سختی۔ گھر کے اندر بیٹی ذرا سی عمر میں ماں کا سیدھا ہاتھ تھا اور کھیت میں ابھی سے باپ سے زیادہ بیٹے کے مارے مٹی دھکے۔ بسنتی پڑوسیوں اور گاؤں والیوں تک کے چار کاج سنبھال دیتی اور کچھ گھر بھی بکھیرتی پھرتی۔ رگھو " دھر بھیتوں " اور " منڈھیتوں " کے کھیتوں میں پہنچ کر ہاتھ بٹا دیتا اور پسینہ ٹپکا دیتا۔ گھروں میں چرخوں کی روں روں کے ساتھ بسنتی کی دعائیں گونجتیں — چوپالوں پر رات میں الاؤ کے کنارے رگھو کی کارگزاریوں کے تذکرے سنائی پڑتے۔ لیکن سیٹھ کی بات ابھی گاؤں میں عام نہ ہوئی تھی۔ صرف مادھو کے کان میں پڑ کر اس کی بیوی کے کان تک پہنچی تھی اور سنتے ہی دونوں سن ہو گئے تھے اور انھیں اپنی گھی کی ہونٹا

سی بیٹی اور گڑ کے بھیلے سے بیٹے میں کوڑھ کے کیڑوں کے انڈے نظر آ رہے تھے اور بلدیو بسیٹھ کی بے پناہ لسی دار قوتوں پر امید لگی ہوئی تھی۔ یوں بھی شادی بیاہ کے معاملے میں دیہات کے اندر بسیٹھ کی پوزیشن قاضی الحاجات قسم کی ہوا کرتی ہے اور خیر مخمل میں تو ٹاٹ کا پیوند لگتے سنتے ہی چلے آئے ہیں۔ مگر بلدیو بسیٹھ کا علم تو تمام علاقہ میں سمندر کی چھائی مانا جاتا تھا اور بلدیو بسیٹھ کے ججمانوں تک کو اس پر ناز تھا کہ پرانے زمانہ کے مہابلی راجاؤں کی راج دھانی میں تو شیر اور بکری ایک گھاٹ صرف پانی ہی پیا کرتے تھے مگر بلدیو بسیٹھ کے پرتی ججمانی کے علاقے میں کئی مثالیں شیرنی اور بکرے کے جوڑے مل جانے کی پائی جاتی تھیں۔
بسیٹھ کی باتیں کچھ یوں بھی آسمانی کتابوں کی طرح کچھ مبہم سی ہوا کرتی ہیں اور پھر بیٹے بیٹی والے اس کام کو عقیدت اور مجبوری کے تحت کلیتاً بسیٹھ پر چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ مادھو بلدیو بسیٹھ کی نوک سی بات پر اچھل ضرور پڑا مگر بعد کی چڑھتی اترتی گفتگو سے امید و بیم میں پڑ گیا اور اتنا سمجھ گیا کہ اس کام میں بجائے ایشور کے یہی مختار کل ہیں اور بجز ان کے کار برآری محال ہے۔

اور شادی بیاہ منگنی سگائی منہ کا نوالہ نہیں ہوا کرتیں۔ معمولی سے معمولی اور غریب سے غریب گھر میں دونوں جانب سال چھ مہینے تو لگ ہی جاتے ہیں اور پہلا سال تو بالعموم بسیٹھ کے جھٹکوں ہی میں بیت جاتا ہے۔ ویسے بسیٹھ چاہے تو گھڑی کے چھٹے انش میں چٹکی بجاتے گھر بسوا دے مگر بکسر سال کے بارہ مہینوں کے تیسوں دن بلا ناغہ دعوتیں کیسے ہوں۔ فصلانے کیسے آئیں، جوڑے کہاں سے بنیں، اور جیسی لوچ دار تر اسامی پھنس جائے اس کے کھنچاؤ کے مطابق بسیٹھ جب اتنی تان لیتا ہے کہ ٹوٹنے پر نوبت آجائے تو پھر شادی طے کرا کر طرفین سے طے شدہ نذرانہ وصول کر لیتا ہے اور اگر بسیٹھ کی خوش نصیبی سے شادی کے بعد کچھ الجھنیں ازدواجی زندگی میں پیدا ہو جائیں تو رفع کرانے میں اپنے علم سفینہ کی لسانی سے لے کر علم سینہ والے گنڈے فلیتے منتر تک ہر چیز کے زور سے رفوگر کی طرح جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اس جوڑ توڑ میں دو طرفہ نوازا جاتا ہے۔ مشہور بات تھی کہ مدت العمر میں بلدیو بسیٹھ نے اپنے چولھے کی پکی نہ کھائی تھی اور ان کے چولھے پر بھی چھٹے چھماہے کبھی پکتی تو دوسروں کے گھر سے چل کر پکنے جایا کرتی تھی اور سب

سیٹھوں کی طرح بلدیو سیٹھ کے بھی کچھ مل بیل تو چلتے ہی نہ تھے۔ خوش نصیب ہوتے اور بیٹے بیٹیاں پیدا کرتے اور نہ بلدیو سیٹھ بلا جوتے بوئے گھر بیٹھے کھاتے۔ بلدیو سیٹھ نے مادھو کو سیٹھی کا پہلا جھٹکا دیا تھا اور انھیں شاید جھٹکا دیتے وقت خود جھٹکے کی شدت کا اندازہ نہ ہوا اور نہ وہ یہی اندازہ کرسکے کہ یہ جھٹکا جو ان کے بائیں ہاتھ کا ادنیٰ کرتب ہے ان کے اپنے فن کی بنیادیں ہلانے والا ثابت ہوگا۔ دکھتی رگ پر ہاتھ پڑتے ہی مادھو تو خیر بلبلا اٹھا اور دن رات بلدیو سیٹھ کی "بزرگ داشت" میں لگ گیا۔ خوش حال کاشتکار گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی کھلانا پلانا، پہنانا، نہلانا دھلانا، بڑھ چڑھ کر ہونے لگا۔ اس سال ہولی دیوالی پر یا تیوہاروں والا جوڑا بلدیو سیٹھ نے مادھو کے یہاں بھیجا۔ فصل فصل پر کھیت کھیت کی نعمتیں جتنے ہی جیسے مادھو کے یہاں پہنچتی رہتیں۔ ہوش سنبھال سے "کرپا" کرکرکے اور میاں بیوی سے چھپا چھپا کر علیحدہ تو الگ رہے، دور کھلا کھلا الگ دیتے لیتے رہتے۔ بلدیو سیٹھ جنگل میں کھلیان سے قریب کہیں نظر پڑ جائیں، اور مادھو کچھ نہیں تو تل کی گٹھری اور گڑ کا بھیلا چلتے چلتے لا دے۔ مادھو کھیت پر ہو یا پینٹھ بازار کہیں باہر راستہ چلتے، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں آتے جاتے بلدیو سیٹھ چوپال پر ذرا کے ذرا ستانے کے لئے ٹھہر جائیں اور پہلی مٹھار سن کر مادھو کی بیوی باہر آجائے اور پانی مانگتے ہی دودھ کا لوٹا پیش کردے۔ اور یہ منع ہی کرتے رہیں اور چلتے چلتے بیسن یا میدہ پوٹ، چاول کی گٹھری مٹیا کے تھیلوں میں ڈال کر، گھی ملسا ہاتھ میں دیدے۔ بستی کے آس پاس کہیں آتے جاتے راستہ پر مادھو کو گشت پر نکلے ہوئے بلدیو سیٹھ کا سایہ بھی نظر آجائے اور مادھو بلدیو سیٹھ کو پکڑے کھیتی کسانی کا کام تج تجا کر گھر لے آیا۔ کڑھائی چڑھوا دی، پوری پکوان ہونے لگا۔ کھوجن پر دودھ کی ہانڈی، دہی کی جھونی او گھی کی مٹکی گھر کے اندر سے چوپال پہ یونہی اٹھی چلی آتی— دیہاتی تواضع کی جبلت اس پر اپنی غرض سونے پر سہاگہ ہوجاتی۔ ایک دن، دو دن، تین چار دن جتنی بھی کھینچ تان کر بلدیو سیٹھ کے وقت میں گنجائش نکل سکتی اصرار کرکے روکتا اور چلتے وقت پڑے اور پوٹلیاں ساتھ باندھ دیتا۔ بھادوں کی جھڑی والے لمبے لمبے چھٹی کے دنوں میں چوپال کی چوکی پر بیٹھ کر اور پوس کی لمبی لمبی راتوں میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کے کنارے جم کر مادھو اور

بلدیو سیٹھ میں تمام تمام دن اور ساری ساری رات باتیں ہوئیں۔ تھیلی تھیلی بھر تمبا کو چلم چلم ہو کر پھنک گئی۔ بلدیو سیٹھ نے لمبی چوڑی باتوں میں خوب خوب بھاؤ بڑھائے اور مادھو کے کام میں جو جو مشکلات پیش آرہی تھیں ان کی من گڑھت تفاصیل سنا سنا کر اور اچھے اچھے گھروں کے سبز باغ دکھا دکھا کر پوری طرح اپنا نذرانہ تان کر طے کیا۔ مادھو نے بیٹی کو بھاری بیر، جتنا بھی بلدیو سیٹھ طے کرائیں اتنا دینے کا وعدہ کیا اور ربھو بول ہی ایک جوڑے میں دالی نبھا دی چھلنی کے ساتھ سر آنکھوں پر رکھ کر بیاہ لانے کا اقرار کیا اور لڑکی پڑکے سیاہ سپید کا کل اختیار بلدیو سیٹھ کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ ادھر بلدیو سیٹھ نے دیکھا کہ اب کی مرتبہ مادھو کی فصل بڑی اچھی اٹھ رہی ہے اور تھیلکی ہی بھٹے ہیں دوسرا سال لگ گیا۔ خوب کما لی ہے۔ اور کام تو آج نہیں تو کل انھیں انجام دینا ہی ہے۔ سمبت بھی اچھا ہے۔ دونوں طرف سے ایک کی جگہ سوا ہو سکتا ہے اور ان کا روپیہ کھرا ہیں آنے میں کھٹن سکتا ہے۔ بس استاد کا نام لیکر بیٹ بیٹ اٹھ کھڑے ہوئے اور جس جال کے ایک سرے میں مادھو پھنسا ہوا تھا اس کا دوسرا سرا پکڑے پکڑے فربہ شکار کی تلاش میں نکل پڑے۔ مگر سفید بھوؤں کے پیچھے سوکھے حلقوں میں ہمہ وقت شکرے کی طرح متحرک آنکھیں پتھرا سی گئیں۔ پہلے ہی گشت میں اندازہ ہو گیا کہ جس چیز کو گڑ کی ڈلی منہ میں سمجھ کر چلے تھے وہ اتنی آسان نہیں ہے اور دوسرے تیسرے گشت میں تو لوہے کے چنے ہو گئی اور انھیں معلوم ہوا کہ گوڑھ کے سلگتے ہوئے ناسوروں کی چراند تو پہلے ہی سے دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک مہینہ دو مہینے چار مہینے بلدیو سیٹھ کو اپنی بیر تی اور جمانی کے سو سوا سو گاؤں گھومتے گزرے۔ کنوارے جیت آگئے۔ آج پورب میں کل پچھم میں بڑی گنگا کی ترائی سے چھوٹی گنگا کی کھڑی تک اتر سے دکھن اور دکھن سے اتر چالیس کوس لمبے چوڑے جنگل کے اندر نہ معلوم کتنی زور آزمائیاں کیں، جنگل جنگل خاک چھانی، گھر گھر جھانکا، بیچارے کی ٹانگیں بھی گئیں اور ٹٹیا کے پاؤں بھر گئے اور دلالی کی ساری توندیں تھک گئیں اور انھیں پتہ چلا کہ اپنے سودے کا بھاؤ بڑھانے کے لئے جو جھوٹ سیٹھی نے جھٹکے کے طور پر وہ مادھو کے سامنے ڈیڑھ سال سے بول رہے تھے وہ پہلے ہی سے عین سچ تھا اور جھٹکا واقعہ تھا۔

اور چھ بیت گئے چھ مہینے اور بیتے اور بلدیو سیٹھ نہ مادھو کی بیٹی کی بات کہیں بٹھا سکے اور نہ مادھو کے بیٹے کی منگنی کہیں سے لا سکے۔ ان کے پچاس سالہ تجربے میں ایسا بے ڈھب معاملہ نہ پھنسا تھا۔ انھوں نے تین تین مرتبہ کی بھاگی ہوئی اور دو دو پیٹ گرائے کھائی کھیلی لونڈیاں کنواری کنیا اور ستی سیتا بنا کر پار لگائی تھیں۔ بڑے بڑے بے راہ بگڑے ہوئے ٹھاکر راجپوتوں کے تماشبین لونڈے جو دن رات نٹنیوں پتریوں میں دھت پڑے رہتے تھے چٹکی بجاتے ہاں برہمچاری بنا کر چاند سی کنواری لڑکیوں سے بھاری بھاری جہیزوں کے ساتھ ایسے صاف بیاہ کر لائے تھے کہ سمدھی سمدھن اور دولہا دلہن دونوں طرف بلدیو سیٹھ کو دیوتا مان کر عمر بھر پوجا کرتے رہے تھے اور معمولی سیدھے سادے گھر بسانے کا تو شمار ہی نہ تھا۔ ہزاروں دادے سے لے کر پوتے تک تین تین پشتیں بیاہ دیں اور کچھ ہی نہیں کہ وقت وقت پر مالدار خوشحال گھرانوں میں پہلے پوتے کا بسایا اور اس کے بعد ضرورت پڑنے پر اس سے چار سال کم والی کے ساتھ دادا کا۔ ساٹھا سو پاٹھا بنا کر۔ بیٹے کی منگنی طے ہو جانے کے بعد اگر حادثاتی طور پر ماں گھر سے غائب ہو گئی اور جملہ معترضہ باپ کا درمیان میں آپڑا تو بیٹے سے پہلے باپ کا اور موقع پڑے باپ بیٹے کا ساتھ ساتھ ایک منڈھے کرا دیا۔ بیویوں کے تبادلے اور لڑکیوں کے خوش خرید سودے تو نہ معلوم کتنے بغیر نخاسہ ہی لگائے پلک مارتے گائے بکری کے بھاؤ پر کرا دیئے۔ غرض چھ سے لے کر چھیاسٹھ تک ہر عمر میں شادی کرانے کی لسن دار قوت بلدیو سیٹھ کے اندر قدرت نے یکساں چمک کے ساتھ ودیعت کی تھی۔ مگر مادھو کے بیٹی بیٹے کے پیوند کرنے کی تگ و دو میں بلدیو سیٹھ کی ٹیٹا اور ٹانگوں کے ساتھ زبان بھی تھک گئی تھی اور انھوں نے اپنے نصف صدی کے تجربہ میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ان کا فن بے بس جواب دے گیا۔ بیچارے حال کی نا در دشا اور مستقبل کے انجام سے مایوس ہو گئے اور کورا جواب دینا تو سیٹھ قسم کے لوگوں کی شان کے منافی ہوا کرتا ہے۔ مگر مادھو کو جو کچھ جواب دیا اس سے وہ یہ سمجھ گیا کہ فی الحال برادری سے کیسے گھر میں رشتہ کرنے کو کوئی تیار نہیں ہے بلدیو سیٹھ سے جواب پا کر مادھو نے گھبرا کر اپنی بستی پر نظریں ڈالیں، وہ تیرہ کی ہو چکی تھی، اور لڑکی کو تو ککڑی کی بیل سے ناپا جاتا ہے اور یہ تو ککڑی

کی حل سے بڑھ کر ریل کی جھاڑی بن گئی تھی اور بیٹا بندرھویں برس ساگون کے کندے سے بے گند کا پیڑ ہو گیا تھا۔ اگر بیٹی کی چھاتی ابھر گئی اور بیٹے کے منہ پر مونچھیں آ گئیں تو کون بیاہنے آئے گا۔ اس کی ہونی ہر وقت اسی فکر میں کڑھتی اور جل جل کر مادھو کے سامنے اپنے باپ ماں کی ریا میں کیڑے ڈالتی جو اسے اپنے گھر چھوڑ کر گئے تھے جیسے کوڑھ لگنے کو تھی جس کے باپ کی کوڑھ سے اس کے تیاں ستے بیٹے کے شریر میں کوڑھی کے کیڑے ڈال دیئے تھے اس کی پدمنی سی کورن بیٹی کی چاند سی پیشانی پر کلنک لگا دیا تھا۔ اس نے گھی کی لوندا سی بیٹی، ورگڑ کا کھیلا سا بیٹا جن کر بھی کوڑھی ... بڑھا ... شیشہ سا ... تلے سا لمحے کوڑھی ہے ... اور اسے ... آگ کی طرح جل کھاتی، منہ پر ذحول بیٹے کی بھیگی مسوں کا روشنگا کوڑھ کے رستے ہوئے ... تیر دوشیزہ کا ابھرتا شباب ... سماجی کوڑھ کے دو پھوڑے ... دونوں ... روٹی پکاتے وقت دامنتا ... اور مادھو چتا میں لپٹے ذوق مجوب زمادم سا سرجھکائے ... پھٹکارتی بڑبڑاتی اور جیسے باپ کے تصور میں بیٹا خود کو مجرم سا محسوس کرتا گویا وہ سانپ کو دودھ پلانے جا رہا ہے جس نے خود اس پر چھاپا مارا ہے اس رہزن کو ——— گر پھیکی روٹی کی دبیز تہہ میں بیٹے کا دل دھڑکتا تھا اور وہ جیسے روٹی چھین کر لے بھاگتا۔ باپ کے لئے روٹی .....!

اور دو بسنت اور بیتے اور بسنتی کی سکھیاں ایک چھوڑ دو دو بچوں کی ماں بن گئیں۔ رتنا کے ساتھ کے چرانے والے لونڈے بیٹے کے باپ ہو گئے اور ہر بسنت بسنتی نیا روپ پا پا کر کھلتی گئی۔ بیساکھ کے بیساکھ رتنا میں دن دونا رات چوگنا خون اینڈ اینڈ کر اچھلتا اور مادھو کے گھر نہ بیٹے کی منگنی آئی اور نہ بیٹی کی سگائی گئی۔ اور اب تو بھی دونوں سیانے تھے زبان نہ کھلے تو کیا آنکھیں تو جواب طلب کرتیں اور باپ کی نگاہ چار نہ ہوتی جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتے۔ تم کوڑھی کے گھر کیوں جنے؟ جو ہم تمہارے گھر جنم لے کر دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا ہو گئے۔ اس کا جواب تو اب بلدیو سیٹھ کے پاس بھی نہ رہا تھا۔ تھکے ہوئے بلدیو سیٹھ، گھبرائے ہوئے مادھو اور مادھو کی بیوی اور دو ایک ہمدرد پڑوسی سب مل کر جتنا اس

معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے اتنا ہی جالے میں پھنسی مکھی کی طرح الٹا الجھتا گیا۔ اور کہتے ہیں کہ کوڑھی کی تو یوں بھی عمر بڑھ جاتی ہے۔ کوڑھ کے سات سال!! بڈھے کی تو جیسے موت کو موت آگئی تھی اور پھر شاید وہ گنگا پار نیا میدان ہموار کر کے "تل اوٹ پہاڑ اوٹ" بلدیو سیٹھ کسی غریب برادری کو اتار چڑھاؤ دکھا کر ٹیا سکتے تھے۔ ورنہ جب تک یہ پاپ کی پوٹ سامنے دھری تھی دکھ دکھاتی۔ جیتی مکھی نگلوانا ان کی قوت سے باہر تھا.....!

(۳)

ڈھلتی رات کے مہیب اور تاریک سناٹے میں جھونپڑی کے قریب پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ ہوئی اور بڈھا تو برسوں سے اکھڑی اکھڑی ڈوبتی نیند سویا کرتا تھا۔ پہلے کھٹکے پر چونک پڑا اور بیلوں کی ٹاپ اور تانگے کی گھڑ گھڑاہٹ پر بستر سے کھسک کے دروازے کے قریب آکر بیٹھ سا گیا۔ "کیا" مادھو کیوں آیا اس وقت۔ تانگے کی ؟" مادھو نے بیلوں کو ٹھہرنے رہنے کا ہونکارا دیا۔ اور تانگے سے اتر کر جھونپڑی کے قریب آیا، اور بڈھا تو خود ہی آواز دینے والا تھا کہ مادھو نے دروازے کے قریب پہنچ کر بڑے شیریں لہجے میں پکارا "بابو" اور ایسی میٹھی لوچ دار آواز تو بڈھے کے کانوں میں مدت سے نہ پڑی تھی ——"بابو!"—— جیسے بچپن میں اس کا ننھا منا مادھوا صبح ہی صبح خربوزے کے کھیت پر جاکر پکارا کرتا تھا۔ جب خربوزوں کی مست خوشبو سے دور دور تک فضا بھری ہوتی تھی اور مادھو کا پیٹ خالی ہوتا تھا۔ اور اب تو نہ معلوم کتنی مدت سے بجز ایک کرخت بیزار سی سٹھار کے بیٹے کی کوئی آواز ہی کان میں نہ پڑی تھی۔ روٹی کے وقت کی مخصوص سٹھار، جیسے تلخ گھونٹ پی کر حلق صاف کرنے کو سٹھارتا ہے جسے سُن کر ہی بغیر دیکھے اندر ہی بیٹھے بیٹھے باپ کی نگاہ کے سامنے بیٹے کا سنگین چہرہ اور دھار دار تیور گھوم جاتے جیسے کوئی نادہند مقروض اپنے بیاج خورے بے ایمان ساہوکار کو سود در سود کی رقم ادا کرنے آتا ہے اور آواز سن کر بڈھے نے برجستہ جواب دیا:-

"کیوں بیٹا مادھوئے خیر تو ہے ؟"

"ہوں" مادھو کے حلق سے بے معنی سا ہونکارا نکلا اور بڈھے نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا کہیں جا رہے ہو بیٹے؟"

"آں، نا، ہاں، نہیں، ایں، تمھیں لے جاؤں گا بابو۔ اوں" جیسے مادھو کسی اور کے منہ سے بولا۔

"کہاں بیٹے؟" بڈھے نے حیرت سے استفسار کیا۔

"ا۔ ا۔ اسے۔ علاج کروانے" مادھو نے سٹھار کر حلق صاف کیا۔

"علاج! علاج؟ کہاں بیٹے؟"

"گنگا پار قصبہ میں" مادھو نے تھرتھرائی آواز میں مختصر سا جواب دیا اور بڈھا جیسے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہتے نہ بن پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ "کوڑھ لا علاج مرض ہے۔" کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک مرتبہ اس کو بیٹے کی زبانی مجملاً یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ بلدیو بسیشر نے صاف جواب دیدیا کہ برادری والا کوئی رشتہ کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس کی لڑکی اور لڑکے کا بیاہ منگنی سے تھک گئے، خیال کیا کہ شاید اسی اُمید پر علاج کرانا چاہتا ہے کہ شفا کی کوئی صورت یا کچھ نہیں تو علاج کا بہانہ ہی پیدا ہو جائے تو تانتا، رکاوٹ دور ہو جائے۔ یہ خیال آتے ہی بڈھا باوجود معذوری کے تن کر کھڑا ہو گیا۔ گودڑ میں لپٹے ہوئے ہاتھ میں لکڑی تھامے پٹیوں پر پٹیاں چڑھائے پاؤں سے لنگڑاتا ہوا چل کر تانگے پر آ بیٹھا اور مادھو نے بیل ہانک دیئے۔

رات اندھیری تھی اور کنوار کی رات تھوڑی نم اور بوجھل ہوتی ہے۔ سیلن اور تاریکی میں نامانوس راستہ پر بیل ذرا بھاری پاؤں ڈالتے چل رہے تھے مگر مادھو نہایت تسلسل کے ساتھ "تخارتا" اور ہنٹر کے ڈنڈے سے پیٹتا چلا جا رہا تھا۔ جنگل میں پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ بیلوں کے کھروں کی بھد بھداہٹ، تانگے کی چرخ چوں اور مادھو کی تخاریوں کے باوجود بھی سناٹا تھا، موت جیسا سناٹا! بڈھا اندھیرے میں آگے پیچھے دائیں بائیں نظریں پھینکنے کی کوشش کرکے ماحول پڑتالنا چاہتا تھا۔ مگر وہ تو سمت کا تعین بھی نہ کرسکا۔ تقریباً گھنٹہ بھر چلنے کے بعد تاروں کی چھاؤں میں صبح کاذب کے سپیدے کی پہلی لکیر ابھرنا شروع ہوئی اور بڈھے کو

کچھ ماحول کا اندازہ ہوا۔ اتنی دیر ساتھ چلنے کے باوجود بیٹے اور باپ میں بات چیت کی نوبت نہ آئی اور دو ایک سوال بڈھے نے کیا بھی مگر نادھوے نے مہمل قسم کے ہونکارے میں اڑا دیا اور بیلوں کی رفتار اور تیز کر دی۔

مشرق سے سپیدہ بڑھا، ایک خطِ نور بیچوں بیچ آسمان سے گزرتا مغرب تک چلا گیا اور قریب کی چیزیں دھندلی میں مٹی مٹی سی نظر آنے لگیں اور بڈھے کو ماحول کا پورا اندازہ ہوگیا۔ اس نے بار بار چونک کر بیٹے کی جانب دیکھا مگر اس کی تو ادھر کو پشت تھی اور بڑی دھن کے ساتھ بیلوں کو ہانک رہا تھا۔

اور ادھر کچھ دھندلکا چھٹا ادھر ماحول کے متعلق بڈھے نے تیقن کیا اور مشتبہ مستفسرانہ سی نظریں بیٹے کی پشت پر گاڑ دیں اور بار بار دور بہت دور نگاہیں پھینکیں اور سمجھ گیا کہ بیٹا اسے گنگا پار قصبہ کے راستہ پر نہیں لئے جا رہا ہے بلکہ اس کا تانگہ اس بند کے راستہ پر چل رہا ہے جس کے عین نیچے عمودی انداز سے کرارے کی جڑ سے لگی ہوئی گنگا بہتی ہے اور بند کی روک کے سبب یہاں پر دریا بقا وہمی سے انتہائی بے رحمی اور تند اٹھنے کی وجہ سے بند کے نیچے بہت گہرا کنڈ اپنی ہے جس سے لگا ہوا مضبوط کرارا کھڑا ہے۔

اور باپ کا دل پہلے ہی ٹھنک گیا تھا۔ پچھلے پہر کے کہرے دھندلکے میں سمت اور راستہ کا تعین کر کے سمجھ لیا کہ اس کے بیٹے کی منزلِ مقصود کہاں ہے اور اس نے بند کی جانب ایک لمبی نگاہ پھینکی اور بند کی چوٹی سے اتر کر آہستہ آہستہ راستہ کے بیچ و خم پہ اٹھتے پاؤں اپنے مضبوط بیٹے کے آہنی ہاتھوں پہ آ کر ٹھہر گئی جو بیلوں کو بہت زور سے ہانک رہے تھے اور مشینی حرکت میں تھے اور پھر بیٹے کے آہنی ہاتھوں سے کھسک کر بہت بند کے بلند ترین خط تک جا پہنچی اور ہاتھوں سے بند کی چوٹی تک اور چوٹی سے ہاتھوں تک اترنے چڑھنے لگی اور ایک مرتبہ جب بیٹے کے بل کھاتے ہوئے آہنی پنجوں اور سنگیں کلائیوں کی حرکت میں آکر الجھی تو ڈر کے مارے بڈھے کو پسینہ آ گیا۔ ایک جھرجھری سی آئی کر کوٹھی کے اندر باپ بول پڑا:-

"ہوں میرے بیٹے ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے" اور شاید لفظ "میرے بیٹے" ادا کرتے وقت

باپ کے [illegible] میں تنکری کھل گئی اور مادھو ایسی نظریں پڑتیا جیسے کنجوس سرمایہ دار کی اپنے [illegible] ڈھیر پر۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا، اس کی آواز سے طویل علالت والی مخصوص [illegible] ہوگئی "[illegible] تیرے لئے بڑا اچھا ہے۔" اور بڈھے کے حلق سے ایک جھٹکا [illegible] آواز کی [illegible] بڈھا جیسے جھٹکے کے ردعمل والی آواز میں کہا" اور پھر پھر بیٹا دھوتے [illegible] باپ کی زبان بیٹے کے مستقبل کے خوف سے لڑکھڑا گئی۔ دل [illegible] کے بیٹے کے مضبوط ہاتھوں کے ہنکانے میں گرم ہو رہے تھے [illegible] پاؤں مستعدی سے بڑھ رہے تھے [illegible] تانگے کے پہیے [illegible] اور وہ کپکپا اٹھا۔ شاید [illegible] خیال میں سے [illegible] کی پرواہ نہ ہو سکی تھی۔

[illegible] اب گرم ہو چکے تھے۔ [illegible] کا احساس [illegible] پاؤں پوری مضبوطی سے اور تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ باپ کی بات سن کر بیٹا [illegible] ہونکا لا نکالا جو ہانکنے کی ٹخ ٹخ سے جا ملا اور بیل دو تین [illegible] اور باپ پھر گڑگڑایا "بیٹا مادھو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اپنی جیسی ہوئی جان پیاری ہے اور میں اپنے لئے ڈر رہا ہوں میرے لئے تو اس سے بڑی بھلائی سنسار میں نہیں ہے۔" اور یہاں پر بڈھے کی آواز گویا ڈر کے مارے گھگھیا سی پڑی اور مادھو کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا البتہ اتنا سمجھ گیا کہ بڈھا بیت خالق سے اور "مادھو" بیٹے اور "باپ" چکی کے دو پاٹوں بیچ آگیا "چھوتا" چکی کا متحرک پاٹ! "باپو" چکی کا جما ہوا پاٹ! کھچر کھچر کھچر! جیسے اس کی کھوپڑی کھچڑی کی ہانڈی کی طرح پک اٹھی۔ اس نے گردن کو ایک جھٹکا سا دیا۔ بیلوں کو ٹٹخنا ر کر [illegible] سے ڈنڈا مارا اور بیلوں نے چند ہی قدم اٹھا کر ڈالے تھے کہ رفتار مدھم ہوگئی جیسے اس کے [illegible] سے خون کی بوند بوند الٹ کر قلب میں جمع ہوگئی ـــ اس کا دل خون کے دباؤ سے پھٹا جا رہا ہے [illegible]

بیلوں کی رسیاں تن گئیں۔ اور چند قدم سست سست ڈالے اور جیسے اسے معلوم ہوا کہ تنگے کے پہیے پیچھے گھوم رہے ہیں اور اس خود فریبی میں اسے ایک گونہ طمانیت سی محسوس ہوئی۔ بیٹے جھنجھلا کر گردن جھٹکی اور پھر باپ کی آواز کان میں آئی جیسے آ ہستہ سے سوئے سوئے جاگ کر بڑبڑا رہے ہوں "دیکھو بیٹا ہم تو کلاپ سے چھوٹ جائیں گے اور تمھیں دعائیں دیتے جائیں گے پھر جاتے وقت بھی اطمینان سے نہ جائیں گے میرے چندا ــــ" بیٹے نے سنبھل کر بات کی بات کے مغز تک پہنچنا چاہا اور باپ نے ایک گھونٹ لے کر کہا "مجھے سب معلوم ہے جو تم نے بتایا وہ بھی اور جو نہیں بتایا وہ بھی۔ تمھیں ذات برادری سے نکال دیا۔ تمھارا کام رک گیا۔ بل پوسٹ تمھیں تنگ کرنے لگے موئے بیٹی بیٹا سنتی ماہ سے تھک گئے۔ تم بھائی برادری سے گر گئے۔ تمھارے مال کا ستیا ناس ہو گیا اور تم تو کبھی دو چار باتیں جیسی ہوئی روٹی لے کر آتے جاتے بتا جاتے اور میں بہت کچھ سمجھتا ہوں اور سات برس سے میری آتما بے چین ہے اور آج جب میں اس کوٹھی سے نکلا رہا ہوں تو بھی آتما بے چین ہی جا رہی ہے۔" اور باپ کی تقریر نے جیسے بیٹے کا خون بلو دیا۔ اس سناٹے میں آپ دونوں کی ہچکی سے لے کر شہر کے باہر تک طوفان سا اٹھ کر چڑھنے لگا کنپٹیوں کی رگیں پھڑکنے لگیں۔ گردن کی سلاخیں ابھر گئیں، چہرہ لال، پھر نیلا اور پھر پیلا ہو گیا۔ ایک جھرجھری سی آئی اور جیسے تاشہ پر پانی کی بوند ٹپک پڑی۔ وہ پورے تن سے بجھ گیا اور بمشکل عاجز بیٹے نے گوڑھی باپ سے مخاطب ہو کر روہانسی آواز میں دو جملے ادا کیے "تو پھر میں کیا کروں بابو، میرے تو جنم کرم میں کیڑے پڑ گئے" اور پیچ پیچ سے اپنے رونگٹے رونگٹے میں چیونٹیاں سی کاٹتی محسوس ہوئیں۔

"ہوں بیٹا، اور مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرے مرنے کے بعد کہیں ہنگامہ نہ ہو جائے۔ میری تم کا سب جانی ہے کبھی کبھی ایسی جنم بھی بھوگنی پڑ جاتی ہے......" اور یہ باپ بولا اور یہاں خود غم اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا شکار بن گیا۔ ماضی کا تاسف، حال کی پریشانی سب کی سب مستقبل کے خوف سے ابتر ہو رہی تھی اور ڈر کے مارے نحیف خستہ جسم پسینہ پسینہ تھا۔

اور "ہنتیا" "سراپ" اور "بھوگنی" پڑ جانے کے خوف سے نہیں۔ باپ کی طرز کی ملکوتی تیوروں نے جیسے اس کی گدی پکڑ لی اور رادھو کی رگ رگ میں میٹھا میٹھا چھن چھنا اٹھا

بیلوں کی رسیاں اپنے آپ سختی کے ساتھ کلائیوں پر لپٹ گئیں۔ اس نے پورے زور سے بیلوں کو کھینچ دیا۔ تانگہ ٹھہر گیا۔ جیسے سینے کے اندر دل کی تمام رگیں اور ریشے کسی نے مونجھ کی رسّی کی طرح مروڑ کر رکھ دیئے اور اس کے منہ سے بیلوں کو پیچھے موڑنے والی مخصوص ٹٹکاری ہوائی کی طرح چھوٹ گئی، جو گردن پیچھے مڑنے سے قاصر تھی۔ اسپرنگ جیسے جھٹکے کے ساتھ نہ جانے کیسے مڑ گئی۔ باپ بیٹے کی آنکھیں چار ہوئیں اور نہایت تڑاخے کے ساتھ زبان بول پڑی۔

"بابو میں لوٹے چلتا ہوں۔"

باپ بیٹے کی کتاب میں بیٹے نے ایک نادر باب کا اضافہ کیا۔ بڈھے کی آواز سے سوئی ہوئی [illegible] کی مخصوص رفتار یک دم غائب ہو گئی۔ پہلے تو رسی کھینچی تھی [illegible] زیادہ جھٹکا۔ بڈھا تانگے میں بیٹھے ہی بیٹھے کھیل کر تن سا گیا جیسے [illegible] سوختہ [illegible] کا ایک ایک آنسو [illegible] کے مارے کہیں جب چھپا [illegible] اب کی مرتبہ [illegible] بیل مڑتے مڑتے پھر سیدھے ہو گئے [illegible] شکل [illegible] دو نقطے [illegible] جیسے اپنے زمانے میں کاشتکاری کی کوئی [illegible] ہوئے موسم کے مزاج اور وقت کی پہچان کرنا تجربہ کار بیٹے کو قطعی [illegible] دیا کرتا تھا [illegible] ہاں بڈھے بیلو [illegible] میں بیٹھے ہوئے ہاتھ کے ٹھڈے کو مضبوطی کے ساتھ [illegible] کی جانب اشارہ کیا اور [illegible] میں پوری رفتار چلنے لگے۔ صبح صادق کے آثار پھوٹ پڑے [illegible] کنواری شفق۔ رات کے دھندلکے اور تاروں کی مدھم مدھم سی روشنی سے دست و گریباں ہو گئی۔ ذرا دیر جدوجہد اور آویزش کا سماں رہا، پھر رفتہ رفتہ رات کا نظام کچھ منتشر سا ہونے لگا۔ مضبوط بیل [illegible] اس رخ میں کھلا ہوا چھپ چھپا پانی طے کرتے دلدل کاٹ کر ڈھلوان چلنے لگے [illegible] جوان بیٹے کا ڈھیلا ڈھیلا گھلتا موم کا بت جیسا بدن اپنی پشت پر لدا رہا۔ مفلوج [illegible] لٹکتا رہا۔ بے جان سے ہاتھ ٹھہر گئے اور جیسے دو بیلوں کے ساتھ جتا ہوا تیسرا بیل بھی مشین کا ایک پرزہ ہو گیا جو بڈھے کے اشارہ پر بیل ہانکنے کی جگہ لگا ہوا تھا اور جیسے بیل اس کے ہانکے بغیر ہی تیزی سے بڑھتے ہی رہے۔ بیٹے کی جوانی اور تندرستی

کے سارے دم خم باپ کے بوڑھے علیل خستہ ڈھانچے میں آ کر چھپ گئے تھے اور ایک مقام پر پہنچکر بوڑھے نے نہایت تحکمانہ انداز میں کہا۔ "رُکو" اور تانگہ ٹھہر گیا۔ یہاں سے عین نیچے بند کی جڑ سے لگا کنڈا اُبل رہا تھا اور اس جگہ سے ذرا اور اوپر کو بڑھ کر بند کی چوٹی کے خط کا ایک مخصوص مقام تھا جہاں سے بند کی دیوار کنڈے کے کنارے کے ساتھ عمودی انداز میں ایستادہ تھی۔ شفق کائنات پر قابو پا چکی تھی، تا حدِ نظر گلال افشاں سی چھڑکی ہوئی تھی۔ کنڈے کے خشم ناک پانی میں خون کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ بڈھے نے بالکل اس انداز میں جیسے ایک پرانا کمانڈر اپنے ادنیٰ سپاہی کو حکم دیتا ہے آواز نکالی۔

"بیلوں کے آگے کھڑے ہو جاؤ، بڑھ نہ جائیں۔" اور مادھو جیسے سوچ سے ساجد خالی الذہن سرزم کا معمول، بڈھے کی آواز کی تان پر چپ چاپ اتر کر بیلوں کے آگے جا کھڑا ہوا۔ اپنے بکھرے بکھرے سے وجود کو سمیٹتا ہوا، مخمور مارگزیدہ سا نیچی نیچی آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا۔ اور شام نے جھکائے ہمہ تن تعجب! سوالیہ نشان کی صورت ایستادہ۔ تانگے کے تختے پر بڈھا اٹھ کھڑا ہوا بغیر لکڑی کی ٹیک کے۔ جھنجھنا کر مٹکے کے چھینکے کو سہارا بھی نہ لیا اور تن کر سیدھا ہو گیا، چاق چوبند، ذرا بانکپن کے ساتھ دائیں سے بائیں گردن گھمائی بڑے اطمینان سے اور استقامت سے لمبی سانس لی اور آہستہ سے جھرجھری لے کر ذرا ہلکا سا اور پھر ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ڈھیرا سا ہو کر اک ثانیہ جیسے کچھ ٹھٹکا اور یک دم پھر پھرتی کے ساتھ سنبھل کر ایک جست میں تانگے سے نیچے آ گیا اور جیسے ٹکر لینے والے زور کے ساتھ لپکا کر کنڈے کی جانب جھپٹا اور بیٹے کے پاؤں میں جیسے بچھوے ڈنک مار دیا ہو۔ بجلی کی طرح تڑپ کر باپ کی جانب جست لگائی "بی، نہیں نہیں بابو نہیں چھلو" اور بند کی چوٹی کے بلند ترین خط پر پہنچتے پہنچتے مادھو کے پہلو میں سے بیٹے کے دونوں ہاتھوں نے کہربائی انداز میں یکا یک ہو کر باپ کو دبوچ لیا۔ پدریت نے پسریت کو زور سے دھکا دیا۔ بڈھا مچھلی کی طرح مادھو کی گرفت سے نکل گیا...... م تمہارا دوا۔ بیٹے کا حلق موت کی چیخ دھاڑ! اور بند کی مہیب بلندی سے کنڈے کی اتھاہ گہرائی میں جاتی ہوئی باپ کی گٹھڑی کا لوہے کی لاٹ سے کھڑے بیٹے کی نگاہ

بقیہ دیکھئے صفحہ ٦٩

احمد ندیم قاسمی

وحشی

"آگئی" ہجوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھ گئے جیسے دو دو قدم پیچھے کھڑے رہتے تو بس ان کو چھوڑ جاتی۔

"کتنی دیر ہوئی بس آئی؟" ہجوم کے پیچھے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔

"پانچ منٹ ہوئے" ایک صاحب نے بڑی بیزاری سے کہا۔

وہ بڑھیا ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور سب لوگ بس کو چھوڑ کر بڑھیا کو دیکھنے لگے۔

"عجب وحشی عورت ہے" ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔ "لے کے جبڑا توڑ ڈالا"

"ہائے اللہ ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی" ایک اور نے فریاد کی۔

اتنے میں بس رکی، کنڈکٹر نے کھڑکی سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "پہلے عورتیں"

ہجوم کے وسط میں پھنسی ہوئی بڑھیا اکڑ گئی اور ہجوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

بڑھیا نے سر پر سے چادر اٹھا کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلو کو مٹھی میں پکڑ لیا اور دو ٹکڑے ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر کنڈکٹر سے کہنے لگی "تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے!"

"چل آ بھی مائی!" کنڈکٹر نے شرما کر کہا۔

"رستہ تو میں ویسے بھی بنا لیتی۔ آدھا تو بنا بھی لیا تھا پر تو نے جو بات کہی ہے وہ ہزار روپے کی ہے۔" بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ دوسری سیڑھی کو ہاتھ سے جکڑ کر بیٹھ گئی جیسے بہت بلندی پر پہنچ کر تھک گئی ہے۔ کنڈکٹر نے اسے تھام لیا اور ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کے سامنے ہی ایک سیٹ پر بٹھا دیا۔ بھیڑ

سب لوگ بس میں بھر دئے گئے اور اس ریلے میں کنڈکٹر بس کے پرلے سرے پر پہنچ گیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اٹھ کر سیٹ کو ہاتھ سے ایک دو بار دبایا اور آہستہ سے بولی۔ "بڑی نرم ہے" بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا ایک گوری چٹی عورت۔ دودھیا رنگ کی صاف ستھری ساڑی پہنے سنہری فریم کی عینک لگائے، سفید چمڑے کا پرس ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اور ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا کھینچ کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک سامنے دیکھتی رہی، پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی طرف دوبارہ دیکھا پھر اپنی انگشت شہادت سے شیشے پر بجا دی۔ عورت نے بھنویں سکیڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی "چکر آ جاتا ہے باہر دیکھ کر"

گوری چٹی عورت مسکرائی اور بولی۔ "مجھے چکر نہیں آتا"

"مجھے تو آ گیا تھا" بڑھیا بولی۔

"تمھیں آ گیا تھا تو تم باہر مت دیکھو۔ مجھے نہیں آتا اس لئے میں تو دیکھوں گی" عورت نے کہا اور بڑھیا نے پوچھا "تو کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمھیں چکر آ جائے گا؟"

عورت کی مسکراہٹ یکایک غائب ہو گئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آ رہا تھا۔ اس نے بالوں میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے ذرا سا آگے جھک کر پھول کو غور سے دیکھا۔ پھر انگلی سے اپنی ہمسائی کا گھٹنا بجا کر بڑی رازداری سے بولی "یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی ہے؟"

"نقلی ہے" عورت بولی۔

"نقلی ہے تو سونے کا ہو گا" بڑھیا نے رائے ظاہر کی۔

"رنگ تو سونے کا سا ہے" عورت نے کہا۔

"مجھے تو اصلی لگتا ہے۔ کسی جھاڑی سے اتارا ہے" بڑھیا بولی۔

"تو پھر اصلی ہو گا" عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے ذرا سا حیران ہو کر گوری چٹی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اس کا گھٹنا بجا دیا "کیا ہے؟" عورت نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

بڑھیا بولی: "عجیب بات ہے۔ باہر نظر دیکھتی ہوں اور چکر مجھے آتا ہے۔"

عورت ذرا سی مسکرائی۔

"سنو!" بڑھیا نے کہا۔

"کیا بات ہے؟" عورت نے جبیں سکیڑ لیں۔

"استانی ہو؟" بڑھیا نے سوال کیا۔

"کیا؟" عورت نے حیرت سے بات کر پوچھا۔

"بتاؤ لڑکی پڑھاتی ہو؟" بڑھیا نے وضاحت کی۔

"نہیں۔" عورت بولی۔

"تو پھر کیا ہو؟"

"کیا؟"

"کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں کرتی۔"

"کچھ تو نہ کرتی ہو۔" بڑھیا نے دائیں بائیں سر ہلا کر کہا۔

"ٹکٹ لے لو مائی!" بڑھیا کو اپنے سر کے اوپر سے کنڈکٹر کی آواز سنائی دی۔

"دے دو۔" بڑھیا نے یاد سے پلو کو مٹھی سے آزاد کر دیا۔

"کہاں جاؤ گی؟" کنڈکٹر نے پوچھا۔

"گھر جاؤں گی بیٹا۔" بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

کنڈکٹر زور سے ہنسا۔ گاڑی میں بیٹھی عورت بھی بڑھیا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

کنڈکٹر نے جیسے تمام مسافروں کو مخاطب کر کے کہا: "میں نے اماں سے پوچھا کہاں جاؤ گی؟ بولی۔ گھر جاؤں گی۔"

اس پر مسافروں نے بھی کنڈکٹر کے قہقہے کا ساتھ دیا۔

کنڈکٹر بہت محظوظ ہوا تھا اس لئے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا: "گھر تو سب لوگ جائیں گے مائی۔ یہ بتاؤ میں کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟"

"والٹن کا؟" وہ بولی۔ "میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔"

مسکراتے ہوئے کنڈکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا۔ "ساڑھے پانچ آنے دے دو۔"

"ساڑھے پانچ آنے۔" بڑھیا نے چادر کے پلو کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ "ساڑھے پانچ آنے کیسے؟ سنا تو یہ رہا تھا کہ صرف چار آنے لگتے ہیں۔ اس نے مجھے صرف یہ گول مول چونی ہی دی ہے۔" اس نے چونی دو انگلیوں کی پوروں میں تھام کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کنڈکٹر بولا "نہیں مائی چار آنے نہیں۔ ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں۔"

بڑھیا کی آواز پیر ہو گئی۔ "ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں۔ میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے ہیں کیوں؟ ہڈیوں کا توڑ صیر ہوں نہ پوچھ ہی گیا۔ لے یہ چار آنے۔"

"عجب مصیبت ہے۔" کنڈکٹر کے تیور بدل گئے اور وہ مسافروں کو مستعین بنا کر تقریر کرنے لگا "میں تو کہتا ہوں کہ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو بڑا مرن پاس نہ ہو وہ بس میں سفر نہ کرے۔ اس مائی کو دیکھئے۔ مہو ہسپتال کے سٹینڈ پر بس میں بیٹھی ہے۔ والٹن جا رہی ہے اور کہتی ہے واہمن بھی جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی اس لئے کہ کسی نے اسے چار ہی آنے دئے ہیں۔"

بڑھیا بچے کی طرح بولی۔ "کسی نے کیوں۔ اپنے غوثتے نے دئے ہیں۔"

کنڈکٹر نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے ـــــ اور اب کے ذرا مسکراتے ہوئے کہا "اس لئے کہ صرف غوثتے نے اسے چار آنے دئے ہیں۔ بھلا سے کون سمجھائے کہ بس سرکار کی ہے غوثتے کی نہیں ہے۔ غوثتے کی ہوتی تو وہ تم سے چار ہی آنے لیتا۔"

"کیوں؟ وہ کیوں لیتا چار آنے؟" بڑھیا بولی۔ "وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے۔ کما رہا ہے۔ روزانہ بڑھیا ہر دودھ لاتا ہے۔ آج میں اسی کے رڑھے پر تو آئی تھی۔ چار آنے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں مانگے اسکی مجال تھی جو مانگتا۔ گودیوں میں کھلایا ہے اس کی سالی یہاں ہسپتال میں بیمار پڑی ہے میں نے کہا چلو۔ اسے دیکھ لوں اسی رڑھے پر واپس آ جاؤں گی۔ مگر آج اس کی حالت اچھی نہیں ہے اس لئے غوثتا وہیں رہ گیا ہے اور مجھے یہ چونی دے کر کہا ہے کہ گھر چلی جاؤں۔ اب تم ساڑھے پانچ آنے مانگ رہے ہو تو یوں کرو مجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دو۔ میں تو کسان عورت ہوں نیچے بھی بیٹھ جاؤں گی۔ تم نہیں اس پر ہم

عورت نے نوٹ سا ہاتھ [illegible] نہیں مانگا۔ جیب میں ہو؟

"نہیں بی بی۔ کنڈکٹر نے کہا۔ سب سواریوں کے پیچھے ایسے ہی لگتے ہیں۔"

"اب [illegible] پوچھا: تو پھر میں کیا کروں؟"

"[illegible] نکالو [illegible]"

"کہاں سے نکالوں [illegible] بولی [illegible] میں گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ یہ چونی بھی عورت نے [illegible] دی ہے۔ کل اسے [illegible] دوں گی۔"

کنڈکٹر بڑھیا کی صورت [illegible] ہنسا [illegible] بولا: "مجھے تو آج ہی چاہئے اماں۔ میں تو ٹکٹ کاٹ [illegible] کر چکے ہیں۔ اتنی بہت سی [illegible] ہیں۔ سب کے [illegible] آفت میں کر دے گا۔ [illegible] سمجھاؤ [illegible] ہی۔ کہہ رہی ہے جوتی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔"

بڑھیا کے سامنے والی سیٹ پر بالوں میں پھول سجائے بیٹھی ہوئی عورت نے پلٹ کر کہا۔ "ایسیوں کی [illegible] جیبیں [illegible] دواتیوں سے بھری ہوتی ہیں۔"

بڑھیا اس کے سر کے اوپر چیخ اٹھی: "کیا تو میرے بیٹے کی گھر والی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔ سر میں کوڑی کا پھول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی بی بی رانی۔"

پھول والی عورت دانت کچکپا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پکڑ کر اسے سیٹ کی طرف کھینچا اور بڑھیا بیٹھ گئی۔

"عجیب وحشی عورت ہے" کسی کی آواز آئی۔

"یہ کون بولا؟" بڑھیا نے پلٹ کر بس کے آخری سرے تک نظریں دوڑائیں۔ "ذرا ایک بار پھر بولے کہ میں اس کی زبان یوں لمبی لمبی کھینچ کر اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں!"

گوری چٹی عورت کو جھرجھری سی آگئی اور وہ یوں سمٹ گئی جیسے بڑھیا نے بیچ بیچ لٹکتی ہوئی اور خون ٹپکاتی ہوئی زبان اس کے اوپر سے گزار کر کھڑکی سے باہر اچھال دی ہے۔

"دیکھ مائی!" کنڈکٹر جو اس دوران میں دوسرے مسافروں کے ٹکٹ کاٹنے لگا تھا۔ اس کے قریب آکر

حتیٰ سے بولا۔ "ساڑھے پانچ آنے دے گی یا نہیں؟"

"تو تو تھانیداروں کی طرح بولنے لگا لڑکے۔ کہہ جو رہی ہوں کہ جوتی پہ رکھی۔ باقی رہے چھ پیسے تو وہ میں تم کو جھنڈ دوں گی کل والٹن میں آکر بیٹھ جاؤں گی اور تو آئے گا تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ کھرے کر لینا۔"

"لو اور سنو" کنڈکٹر نے سب مسافروں سے فریاد کی۔

پھر یکایک اس کے تنے ہوئے تیور ڈھیلے پڑنے لگے اور وہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر جھک گیا۔

بڑھیا نے کنکھیوں سے گوری چٹی عورت کا تکنا تاڑ لیا اور جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔ "دیکھ رہی ہو؟ [illegible] کہا "نکلے تو بالی ساڑھے پانچ آنے نہیں۔ چھ پیسے بس [illegible] کا ہی ہے۔ [illegible] کا [illegible] ایک آدھ بھی کسی سے کم لے لیا تو اپنی جیب سے ڈالنے کا یا نوکری چھوٹ جائے گی غریب کی۔"

"بیٹا ہے بے چارہ" بڑھیا نے بڑے پیار سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔ "بیٹے، عمر بھر اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ پر کبھی کسی کے رزق پر ڈاکہ ڈالوں؟ چھ پیسوں کے پیچھے۔ مجھے کیا خبر تھی وہ خوشامدی دھوکا دے [illegible] کیا پتہ۔ وہ بیچارا کبھی تو پڑھے پہ لا ہوا آتا ہے۔ اب کیا کروں؟"

"ہوں کرو" گوری چٹی عورت نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ لو بھئی ـــــ"

اتنے میں کنڈکٹر آگیا۔ بڑھیا بولی۔ "بس لڑکے مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح ـــــ"

کنڈکٹر بولا۔ "بس مائی اب سارا حساب ٹھیک ہوگیا ہے۔ تجھے والٹن ہی پر اتاروں گا"

بڑھیا کھل گئی۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کے جنا ہے۔ پر یہ بتا لڑکے۔ جو تو چھ پیسوں ہی پر راضی ہوجانا تھا تو ساڑھے پانچ آنے کا جھگڑا کیوں چلایا؟"

"حساب تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے سے پورا ہوا ہے" کنڈکٹر بولا۔

"تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟" بڑھیا پھر اداس ہوگئی۔

"چھ پیسے مجھے مل گئے" وہ بولا۔

"کہاں سے ملے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"اس چودھری نے دیئے ہیں" کنڈکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں دیئے ہیں؟" بڑھیا نے حیران ہوکر پوچھا۔

کنڈکٹر بولا۔ "ترس کھا کر دے دیئے۔"

بڑھیا اٹھنے کی کوشش میں سیٹ پر گر پڑی۔ "کس پر ترس کھایا؟" وہ چلائی۔

"تم پر اور کس پر؟" کنڈکٹر بولا۔

بڑھیا بھڑک کر اٹھی اور چیخ کر بولی۔ "ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو۔"

گوری چٹی عورت فوراً پرس بند کر کے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا چھت کی راڈ اور سیٹوں کی پشتوں کے سہارے سفید پوش بزرگ کی طرف جانے لگی۔ "یہ پیسے دیئے کیا تیری جیب میں بہت کود رہے تھے۔ تو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیئے جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے۔"

"کیسے بہت [illegible] ہے" کوئی بولا۔

سفید پوش [illegible] اور بڑھیا بولتی رہی۔ "ارے سخی داتا! کہیں کے تو مجھ پر ترس کھاتا ہے [illegible] کے آگے اور نوٹوں کے [illegible] انتظار میں کاٹ دیتے ہیں۔ [illegible] جنہوں نے اپنی مٹی [illegible] ہو تو پہاڑ بن جاتے [illegible] ترس کھانے [illegible] ترس نہیں آتی مجھے ایک کسان عورت پر ترس کھانے آیا ہے۔"

پھر وہ کنڈکٹر کی طرف مڑی۔ "یہ چند پیسے جو [illegible] ہیں اسے واپس دے دے اور مجھے یہیں اتار دے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ مجھے بہت دور نہیں جانا ہے۔"

بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بس میں صرف بس چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد سٹینڈ پر رکی تو بڑھیا سفید پوش کی پروا کئے بغیر دروازے میں سے لٹکی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر وہ اٹھی کپڑے جھاڑے اور ناقابل یقین تیزی سے والٹن کی طرف جانے لگی۔

اور بس میں سے کسی کی آواز آئی۔

"عجیب وحشی عورت ہے۔"

اقبال متین

بیمار

رام دیال نے میڈیکل سرٹیفکٹ کے ساتھ پھر رخصت بیماری میں مزید پندرہ دن توسیع کے لئے درخواست بھیج دی۔ اس کا چھوٹا بھائی سہما سہما پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اگزامنر صاحب کے اجلاس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار بالکل اسی انداز سے وہ آفس آچکا تھا۔ رام دیال کی بیماری کی پرچھائیاں اس کی گھر والی پر اور اس کے چھوٹے بھائی دونوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس دیکھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی غذا زیادہ تر ابھی رام دیال کی دواؤں اور انجکشنوں کی صورت میں ڈسپنسری ہی سے خریدے جاتے تھے۔ وہ جب بھی آتا تو دیدہ نگاہوں سے آفس کے کلرکوں اور آڈیٹرس کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھتا جیسے انہیں یقین دلا رہا ہو کہ میرا بھیا بہت جلد صحت مند ہو جائے گا۔ وہ موت سے لڑ رہا ہے، اس کی جیت ہوگی۔ وہ پھر اپنی خدمت پر رجوع ہوگا، وہ پہلے سے زیادہ تن دہی سے کام کرے گا، وہ گورنمنٹ کا احسان چکا دے گا، وہ مفت خور نہیں ہے، وہ مرے گا نہیں جناب آپ حضرات اس طرح گھور گھور کر نہ دیکھیں۔

میں نہایت بے چینی سے صیغہ میں اس کی واپسی کا منتظر تھا اس لئے بھی کہ ایک ہفتہ پہلے میں رام دیال سے ہاسپٹل میں مل آیا تھا۔ وہ روبہ صحت تھا لیکن طویل بیماری کی وجہ سے اس کا جسم پیلا پڑ گیا تھا اور نقاہت زیادہ تھی۔ بہت ہی آہستہ اس نے کہا تھا کہ کل مجھے یہاں سے DISCHARGE کر دیا جائے گا اور دس دن گھر میں آرام لینے کے بعد گیارھویں دن آفس میں رجوع ہو جاؤں گا کیونکہ میری رخصت ۳۱ر کو ختم ہو رہی ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ میں اس طویل بیماری سے تنگ آچکا ہوں۔ سروپ اور اس کی بھابی

ہوتے تو مجھے اپنی زندگی اس قدر عزیز نہ ہوتی۔ زندگی واقعی بہت حسین ہوتی ہے۔ بہت پیاری ہوتی ہے۔ لیکن تنگ دستی میں صحت جواب دے دے اور آدمی اس کی طرف سے ناامید ہو جائے اور کبھی کبھی موت اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میری زندگی میں ایسے مواقع آ چکے ہیں لیکن سروپ اور اس کے بھائی کے خون نے مجھے موت سے مبرا اور زندہ رہنے کی خواہش دی اور اب میں اپنے گھر کو لوٹ جاؤں گا۔ رسوئی گھر سے پھر دھواں اٹھے گا۔ بجلی کے سوئچ پر جمی ہوئی گرد میری انگلی کے لمس سے صاف ہو جائے گی اور کھڑکیوں میں سے گزر کر روشنی پھر سڑک سے گزرنے والوں تک پہنچے گی۔ سروپ کی بھابی کی دھوتی پھر الگنی پر لٹکی ہوئی دکھائی دے گی۔ [illegible] پھر سے آ جائے گی اور میرے کوٹ کے بٹن پھر مضبوط ہو جائیں گے۔ سروپ دیال کا نام اس کی ماں اس طرح پکارا کرے گی تو وہ غیر حاضر نہ رہے گا۔ اس کی [illegible] جس کے تعلقات اس کے ڈیپارٹمنٹ کی فائل کو نپٹانے کے لئے ترسیں گے اس کی نگاہیں جو مدت سے [illegible] زرد چہرے پر [illegible]۔ [illegible] پھر اپنی کتابوں کے صفحوں کو گدگدائیں گی۔ میری [illegible] پھر چمک اٹھے گی۔ [illegible] پھر گونجیں گے میرے دروازے پر پھر دستک ہو گی۔ [illegible] کھڑکنے لگا۔ میں نے رام دیال سے وعدہ کیا تھا اب کی ملاقات اس کے گھر پر ہو گی کیونکہ وہ ابھی ہاسپٹل میں تو نہیں ہے لیکن ابھی اس کا رسوئی گھر، بجلی کا سوئچ، اس کا کوٹ، اس کی سائیکل، اس کے گھر کا دروازہ اس کے منتظر ہیں۔ سروپ گردن جھکائے ہوئے انگزامنر صاحب کے کمرے سے نکلتا ہوا دکھائی دیا تو میں اس کی طرف لپکا تاکہ اس کے سیکشن میں پہنچنے سے پہلے ہی تفصیلات معلوم کر لوں کیونکہ میرے سوا میرے بعض ساتھی بھی اس کے منتظر تھے اور سیکشن میں داخل ہو کر اس کو حسب معمول یکے بعد دیگرے جوابات دینے ہوتے تھے کہ بھیا اب اچھے ہو رہے ہیں، بھیا اب نسبتاً بہتر ہیں۔

سروپ دیال چونکہ زیادہ پریشان تھا۔ اس لئے وہ بغیر کسی سے ملے چلا گیا اور ویسے وہ اس قدر شرمیلا واقع ہوا تھا کہ ہمیشہ ہی اس امر کی کوشش کرتا کہ کم سے کم لوگوں سے ملے اور چلتا بنے۔ وہ دفتر میں داخل ہوتا تو خود کو ایک مجرم محسوس کرنے لگتا۔ اپنے بھیا کی طویل بیماری میں بغیر نوکری کئے ہر ماہ نصف تنخواہ لینے پر شرمندہ سا رہتا۔ سروپ سے مجھے معلوم ہوا کہ

رام دیال کی طبیعت یکایک اس رات خراب ہوگئی۔ جس دن میں اس سے مل کر آیا تھا۔ دواخانے سے اس کو خارج نہیں کیا گیا۔ اور آج کے تیسرے روز اس کا آپریشن ہوگا۔ تنخواہ کے لئے میرے نام AUTHORITY LETTER دیتے ہوئے سروپ نے کہا تھا کہ بھیّا آپ کا بہت انتظار کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے کہ آپ ضرور گھر گئے ہوں گے اور دروازہ مقفل دیکھ کر پریشان ہوئے ہوں گے لیکن دوسرے روز جب آپ ہاسپٹل نہیں آئے تو انھیں یقین ہوگیا کہ آپ گھر نہیں گئے ورنہ آپ ہاسپٹل ضرور آتے۔ کل پہلی ہے۔ تنخواہ ہمیں کل ہی دلوا دیجئے۔ ہمیں شدید ضرورت ہے۔ آج اگزامنر صاحب نے مجھ سے کچھ ترش روئی برتی۔ بھیّا کی بیماری کی طوالت سے وہ مجھے کچھ بیزار سے نظر آتے۔ درخواست میری طرف بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا کہ آپ ہی اس کو اسسٹنٹ صاحب کے پاس پیش کر دیجئے کیونکہ اگزامنر صاحب نے FILE طلب کیا ہے۔ جب میں صیغہ میں واپس پہنچا تو بعض ساتھیوں نے رام دیال کی خیر خیریت پوچھی۔ اکثر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن سیوانندم آج بھی اپنی خباثتوں کے ساتھ اپنے ہم عمر چچا سے سرگوشی کرنے لگا۔ میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں مجھ سے ملیں اور جھک گئیں۔

رام دیال ۳۵، ۳۶ سال کا لم ترنگ آدمی تھا۔ چھوٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں رخساروں کے اوپری حصے پر دونوں جانب کچھ اُودے اُودے دھبے جو ابھری ہوئی ہڈیوں کے ساتھ بالکل نمایاں تھے۔ بے حد تا ہد خشک، کٹر مذہبی اسی لئے دفتر کے بہت کم لوگ اس سے مانوس تھے، اس لئے بھی کہ اس سے مانوس ہونا بہت مشکل تھا کیونکہ وہ یا تو آروند گھوش کی تعلیمات سے متعلق بات چیت کر سکتا تھا یا عہدہ داروں کی تجاویز سے متعلق یا پھر ضابطۂ ملازمت کی دفعات سے متعلق، اگر آپ اس سے کسی کرنٹ ٹاپک CURRENT TOPIC پر گفتگو کرنا چاہتے تو صرف اس کی وہ فائلس جو زیر غور رہتیں، وہ انھیں سے متعلق گفتگو کرتا، پھر اس پر طرہ یہ کہ وہ مذہب پر بات چیت شروع کرے گا تو دفتریت تک لے جائے گا دفتری بات چیت ہوگی تو آروند گھوش کی تعلیمات پر ختم ہوگی اور پھر دوران گفتگو میں

اس کے جملوں میں ربط نہ رہے گا وہ بات کرتا رہے گا اور سوچتا رہے گا اور سوچتے سوچتے خیالات کی رو میں اس طرح بہہ جائے گا کہ زبان اس کا ساتھ نہ دے سکے گی۔ قوت اظہار جواب دے دیگی اور وہ کچھ مجوب مجوب سا منہ تکنے لگے گا۔ یہاں تک کہ آپ کو خود اس پر ترس آجائے گا اور آپ تقریر دیں گے کہ ہاں بھئی ہم نے آپ کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ آپ اپنی فرض شناسی کو مذہب کی صحیح تعلیمات کا سبب سمجھتے ہیں۔ جن میں آپ کی انفرادیت کا بھی دخل ہے۔ لیکن یہ انفرادیت بھی مذہب ہی کی روشنی میں پروان چڑھی ہے۔ وہ بہت خلوص سے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے گا اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ اس طرح آپ کو دیکھے گا جیسے آپ اس کے محسن ہیں کیونکہ آپ نے اس کی بے ربط باتوں سے اس کے مقصد کو متعین کرلیا ہے اور وہ صرف اسی لئے آپ سے مرعوب بھی ہو جائے گا کیونکہ آپ بہت زود رس ہیں اور آپ نے اسکی اوٹ پٹانگ باتوں کا مفہوم سمجھ لیا ہے اس کے علاوہ اس کی اور بھی کئی خصوصیات تھیں اپنے عہدیداروں کی نظروں میں وہ بہت محنتی بہت فرض شناس تھا اور اس کے کام سے سب مطمئن تھے کسی کارروائی میں خود اس کو اختلاف ہوتا تو پھر عام طور پر یہ بات سمجھ لی جاتی تھی کہ اب یہ کارروائی نہیں ہوگی اور اسی لئے سارے دفتر میں یہ کہاوت بن گئی تھی کہ رام دیال کا کاٹا بچ نہیں سکتا۔

وہ بہت پابند وقت تھا۔ بقول آفس کے چپڑاسی کے کہ رام دیال بابو آئے ہیں تو اس وقت پورے دس بجے ہوں گے، آپ کی گھڑی غلط ہے۔ آپ اسے صحیح کر لیجئے۔ اور پھر رام دیال بابو پورے دس بجے اپنی میز پر ڈٹ جاتے تو پھر ساڑھے پانچ بجے تک اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اس آدمی کو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیشاب ہی آتا ہے۔ میز پر لگی ہوئی فائلوں کی ڈھیر کے پیچھے وہ معہ اپنے مذہب اور اپنی انفرادیت کے سات ساڑھے سات گھنٹے تک دفن رہتا۔ کوئی الجھی ہوئی کارروائی ہوتی تو دفتر کے لوگ اسی سے مشورہ لیتے۔ وہ نوٹ پین پر عینک چڑھا کر گردن اٹھاتا اور ٹھوڑی کو ہتھیلی پر رکھ کر گردن کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا اور آپ اعلانیہ اس کی گردن کی ہڈی کے چٹخنے کی آواز سنتے اور آپ کو یقین ہو جاتا کہ اب وہ آپ کی دشواریوں کو سہل تر کر دے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کارروائی کو سجھاتے وقت وہ اپنے عہدیداروں کی نظرت

سے لیکن ان کی تجاویز کی خامیوں تک ہر چیز پر روشنی ڈالے گا اور پھر اس بات میں مذہب آ جائیگا آدمی کی اصلیت آ جائے گی، دنیا کی بے ثباتی آ جائے گی، روح اور جسم کا رشتہ موضوع بحث بن جائے گا اور کیا عجب کہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہنے پر مختصر سی نصیحت بھی آپ کو سننی پڑے۔ اور آپ یہ سب کچھ نہایت سعادت مندی سے برداشت کریں گے کیونکہ وہ آپ کو کارروائی سمجھانے کے لئے راضی ہو گیا ہے اور آپ جب کارروائی سمجھ کر اٹھیں گے تو ایک نکتہ آپ پر واضح ہو چکا ہوگا اور آپ کے نوٹس کی تیاری کے لئے کئی آرٹیکلس آپ کے سامنے ہوں گے جن پر صاد کر کے وہ ضابطے کی کتاب آپ کے ہاتھ میں تھما دیگا۔ جب پہلے پہل میرا اپائنٹمنٹ ہوا تھا تب بھی وہ رخصت بیماری پر تھا۔ میں نے اس کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں سنی تھیں کہ وہ عجیب الخلقت آدمی ہے اور خرابی صحت کی وجہ سے کچھ چڑچڑا پن بھی اس کے مزاج کا جز بن گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ رجوع ہوا تو میں نے اس کے قریب ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی اور چار پانچ دن معمولی آداب سلام کے بغیر ہی گزر گئے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ وہ کس طرح مجھ سے مانوس ہوتا گیا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ وہ مجھ سے کچھ متاثر سا نظر آنے لگا جس کی سوائے اس کے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس کی باتیں اخلاق و مروت بلکہ صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ صبر و تحمل سے سن لیا کرتا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی کٹر مذہبیت اس کی خرابی صحت کا ردعمل ہے اور وہ اپنی مفلوج نفرانیت کا پھٹا ہوا لبادہ اوڑھے کبھی کبھی مذہب سے ستیزہ کار رہتا ہے لیکن بار ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اور مذہب کی گرفت اس کے دل و دماغ پر زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ زیادہ دیر یا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ دو زانو ہو کر عہد کرتا ہے کہ کج خلقی اور تنگ مزاجی بھی کسی مذہبی برگزیدہ شخصیت سے رجوع کر دیتا کہ وہ ان کے دونوں میں رحم و کرم پیدا کر سکتی ہے وہ انھیں اچھا انسان بنا سکتی ہے انھیں راہ راست پر لا سکتی ہے۔ اس کو دو چیزوں سے بہت پیار تھا۔ آروند گھوش کی نظموں اور مضامین کے مجموعوں سے اور اپنے فائل سے۔ پانڈیچری آشرم کی مطبوعہ کتابوں کا وہ شدید احترام کرتا تھا اور اپنے فائلس سے اس کو شدید محبت تھی۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی دونوں چیزیں اس کی شخصیت کی پناہ گاہیں ہیں۔ وہ صرف ان کا احترام نہیں کرتا صرف

سے پیار نہیں کرتا بلکہ ان میں پناہ لیتا ہے۔ فائلس کو وہ بہت سجا کر رکھتا۔ کلنڈر کے نمبر کاٹ کاٹ کر نام سی پرچیاں کرتا۔ پورے دفتر میں رام دیال کی متعدد فائلس آنکھ بند کر کے چن لی جا سکتی تھیں۔ نوٹنگ بہت اور احتیاط سے کرتا کہ لکھتے وقت ایک لفظ بھی نہ کاٹتا۔ کچھ حذف کرنے کی ضرورت ہوتی تو نہایت چابکدستی سے ربر یا بلیڈ کے ذریعہ قلم زدنی الفاظ مٹا دیتا اور پھر کاغذ کے اس حصے پر اس احتیاط سے لکھتا کہ روشنائی نہ پھیلنے پاتی۔ فائلس بہت قرینے سے فائل بورڈس میں بندھی ہوئی اس کی الماری میں سجی رہتیں۔ میں نے کبھی اس کو فائل تلاش کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس فائل کی ضرورت ہوگی وہ فوراً ہی رجسٹر کھولے گا، فائل نمبر دیکھے گا اور ایک منٹ الماری کے پاس ٹھہرنے رہنے کے بعد دو سال پرانا فائل بھی اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ رام دیال کے خوابوں کی دنیا میں بھی فائل کا دخل تھا۔ میں نے اس ذہنیت کا آدمی نہیں دیکھا۔ اس کے شعور اور تحت الشعور میں بھی اس کے فائلس بس گئے تھے۔ صدر دفتر کی آڈٹ پارٹی تنقیح کے لئے آئی تو ایک فائل باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوئی۔ ہم سب کو حیرت ہوئی کہ رام دیال کی متعلقہ فائل اور وقت پر نہ ملے اور پھر ایسی صورت میں جبکہ رام دیال اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اس دن وہ بہت دل گرفتہ رہا۔ صیغہ کی ساری الماریاں چھان ماریں اور کوئی سات بجے شام گھر لوٹا۔ دوسرے دن وہ بہت پہلے چینی سے اسسٹنٹ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو اس نے بہت رازدارانہ انداز سے کہا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ بہت مسکراتے ہوئے کھویا ہوا فائل اسسٹنٹ صاحب کی الماری کے دوسرے خانے سے نکال کر مجھے دے رہے ہیں۔ آپ نے خواب میں بھی مجھ سے ہمدردی کی ہے اور میرے ساتھ فائل کی تلاش میں اپنا سارا دن خراب کیا ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں بھولوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا خواب غلط نہ ہوگا۔ رات کو جب آنکھ کھلی ہے تو پھر میں سو نہ سکا۔ جی چاہتا تھا کہ فوری صبح ہو جائے اور میں دفتر پہنچ جاؤں۔ آپ یقین کیجئے کہ رات ہی کو دفتر پہنچ کر اسسٹنٹ صاحب کی الماری کھولنا میرے بس میں ہوتا تو میں رات ہی کو اس کام سے نپٹ لیتا۔ لیکن اس بدقسمتی کو کیا کروں کہ اسسٹنٹ صاحب اب تک نہیں آئے ہیں

اور دوسری کوئی چابی ان کی الماری کو نہیں لگ سکتی۔ مجھے اس بیوقوفی پر ہنسی آنے لگی۔ دفتری کام سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے۔ اسسٹنٹ صاحب کی الماری سے فائل برآمد ہو بھی جائے تو کون سی بڑی بات ہو جائے گی۔ ہمدردی تو رام دیال سے ہے کہ فائلیں اس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی ہیں۔ چپراسی نے اسسٹنٹ صاحب کے آنے کی اطلاع دی تو ہم دونوں الماری کھولنے کی غایت سے ان کے اجلاس پر پہونچے۔ چابیاں حوالے کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انھیں یقین ہے کہ فائل ان کے پاس نہیں ہے لیکن رام دیال نے ان کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی الماری کھول دی اور منٹ دو منٹ بعد وہ فائل نکال کر اسسٹنٹ صاحب کے سامنے رکھ دی۔ وہ کچھ پشیمان سے ہو گئے اور زور سے گھنٹی بجا کر چپراسی کو چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ جب کمرے سے باہر نکلے تو رام دیال کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جانے کیوں وہ رو پڑنے کو تھا اور اپنے تحت الشعور کو بشارت ایزدی سمجھ رہا تھا۔ ایک دن قبل جس فائل کے لئے سارے دفتر میں تہلکہ مچا ہوا تھا وہ آتے ہی بغیر کسی جستجو کے رام دیال کے خواب کی تعبیر بن گئی تو یہ بات سارے دفتر میں جیسے گونجنے لگی۔

ایک بار یرقان ہو جانے کی وجہ سے اس نے رخصت لے رکھی تھی۔ میرا اس زمانے میں اس کے گھر آنا جانا تھا کیوں کہ دوسروں کی طرح خود میرے لئے بھی یہ مسئلہ بہت اہم تھا کہ اس سے کس قسم کی باتیں کی جائیں اور اس خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ میں عیادت اور مزاج پرسی کے معمولی فرائض کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ باوجودیکہ اس کے اپنے بارے میں میری رائے معلوم کئے بغیر ہی وہ مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ مجھے اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا اپنا دکھ درد مجھ سے بیان کرتا تھا اور کم از کم نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے شد و مد سے نصیحت کرتا۔ اس نے ایک دن میرے پاس آدمی بھیجا کہ وہ شام کی ٹرین سے پانڈیچری جا رہا ہے اس لئے میں اسٹیشن پر ضرور ملوں۔ میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹنے میں دو چار منٹ باقی تھے۔ میں نے تاخیر سے پہنچنے پر معافی مانگی تو اس نے کہا کہ آپ کو میں نے بے وجہ تکلیف دی۔ میری صحت چونکہ خراب ہے اس لئے میں نے سوچا کہ مرنے سے پہلے کم از کم یہ حسرت تو نکل ہی جائے کہ میں نے پانڈیچری

کے آشرم کی زیارت نہیں کی۔ پتہ نہیں کہ میں واپس آ بھی سکوں گا یا نہیں۔ اسی لئے آپ سے ملے بغیر چلے جانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ واقعی رام دیال اب واپس نہ آسکے گا اور یہی اس سے آخری ملاقات ہے ـــــ لیکن رام دیال خلاف توقع واپس آیا اور اپنے ساتھ دو ایسی چیزیں پانڈیچری سے لیتا آیا جو بعد کو اس کی شخصیت کا اہم جزو بن گئیں اور آج آپ ان کا تصور کئے بغیر رام دیال کے چہرے تک نہیں پہونچ سکتے۔ اس کے دل و دماغ تک نہیں پہونچ سکتے۔ اور یہ اہم چیزیں اس کی ڈاڑھی اور زلفیں تھیں۔ البتہ یہ کھوئی ہوئی صحت اس کو پانڈیچری کے آشرم میں بھی نہ مل سکی تھی۔ اس لئے اخراجات زیادہ [illegible] مقروض ہو گیا تھا

[illegible] اور [illegible] پانڈیچری سے [illegible] چھوڑ دی ہے۔ وہ رام دیال جو [illegible] ادا [illegible] تو آتا تھا کہ وہ [illegible] مجھے [illegible] تو اس بات کا [illegible] کی وجہ سے [illegible] ایسا [illegible] کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس کی [illegible] سے بہت [illegible] اور اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اس [illegible] اگر وہ [illegible] ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ اس کے نہ ڈاڑھی ہوتی، [illegible] ـــــ ایک بار مدرگا متعلقہ [illegible] صاحب نے رام دیال سے جواب طلب کیا، اور [illegible] رام دیال کی ڈاڑھی اور زلفوں کا زمانہ تھا۔ اس [illegible] تک کوئی جواب نہیں [illegible] بلا ناغہ حسب معمول وقت۔ دفتر آتا اپنی میلی سی تھیلی میں سے [illegible] میز کی آدھ کھلی دراز میں رکھ لیتا اور دو دو تین تین منٹ تک بغیر پلک جھپکے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا رہتا۔ پھر آنکھیں بند کر لیتا اور دو تین منٹ اسی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا۔ پھر آنکھیں کھول دیتا اور اپنے چہرے کو آئینے میں تکتا۔ لوگ اس کی طرف اشارہ

کرتے، اس پر ہنستے، پھبتیاں کسی جاتیں۔ لیکن یہ سب کچھ بہت آہستہ آہستہ ہوتا اس لئے کہ اگر رام دیال سُن پائے تو شاید کوئی نیا فتنہ جاگ اُٹھے۔ دو دن اسی طرح گزر گئے۔ دوسرے سکشن سے لوگ آ آ کر اس کو دیکھتے زیرِ لب مُسکراتے اور دوسرے تماشہ بینوں کے لئے جگہ خالی کر دیتے۔ یہاں تک کہ رام دیال نے اس کے خلاف ہونے والے تبصروں کو تاڑ لیا۔ لیکن کسی سے اُلجھنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی، کیونکہ اگر بات بڑھتی تو یکہ و تنہا رام دیال کو پورے دفتر سے مخاصمت مول لینی پڑتی جس کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار نہ کر سکا۔ ان دنوں میں بھی اس سے انجان رہا۔ لیکن دوسرے دن دل کڑا کر کے میں نے پوچھ ہی لیا کہ آخر اس آئینہ بینی کا مقصد کیا ہے۔ رام دیال نے جواب دیا کہ ــــــ

"I want to cultivate my individuality"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ شخصیت اور انفرادیت کی نشو و نما آئینہ بینی سے کس طرح ہوتی ہے اور مددگار نے جو "جواب طلب" کیا ہے اس پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بات کو طول دینا میں نے مناسب نہ سمجھا اور چپ ہو کر اپنی میز پر آ کر فائلوں پر جھک پڑا۔ تیسرے دن رام دیال آئینے کی بجائے آرونڈ گھوش کی فریم میں جڑی ہوئی چھوٹی سی تصویر اپنے ساتھ لے آیا، اور اگلے دو دنوں کی طرح آئینہ بینی کی بجائے تصویر بینی میں لگا رہا۔ دفتر ختم ہونے سے پہلے مددگار نے ایک دن کی مہلت دیتے ہوئے سختی سے جواب طلب کیا تو رام دیال زندگی میں پہلی بار منتظم سے اجازت لے کر وقت سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ چھٹے دن اس کے ساتھ نہ آئینہ تھا نہ آرونڈ گھوش کی تصویر۔ مددگار کے اجلاس پر بند عذرت نامہ چھوڑ آیا تھا اور اس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔

آپ کو شاید رام دیال سے ہمدردی نہ ہو لیکن آنتوں کی بیماری کا شکار ہو کر اس نے لمبی رخصت لے لی تو مجھے اس کی جائداد پر منصرانہ ترقی دے دی گئی کیوں کہ وہ سکنڈ گریڈ آڈیٹر (Auditor) تھا۔ ترقی ملی تو آپ یقین کیجئے کہ مجھے خوشی نہ ہوئی۔ میری دلی تمنا تھی کہ رام دیال صحت پاکر جلد واپس آجائے اور یہیں سے میری ہمدردیاں اس سے وابستہ ہو گئیں۔ وقتاً فوقتاً میں اس کی مزاج پُرسی کے لئے جانے لگا۔ جب بھی جاتا اس کو یقین دلاتا کہ وہ جلد ہی صحت پاکر لوٹے گا اور اس کی بجی ہوئی مثلیں زیادہ دن اس کے ہاتھوں کے لمس کی منتظر نہ رہیں گی۔ شروع شروع میں تو میں نہیں

کہہ سکتا کہ اس نے میرے خلوص کی صداقت کو سمجھا بھی یا نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ میری ہمدردی کا معترف ہوتا گیا۔ کسی ساتھی کی طویل رخصت بیماری کے سلسلہ میں منصرمانہ ترقی مل جائے تو آپ اس کا اندازہ غالباً نہیں کر سکتے کہ ایسی ترقی سے خوشی نہیں ہوتی بلکہ اس کے دکھ درد کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لیتے وقت مجھے رام دیال بے طرح یاد آتا۔ جو بیماری کی حالت میں نصف تنخواہ پر گزر بسر کر رہا تھا اور اسی ترقی کی وجہ سے میں اس سے زیادہ ملتے رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ انھیں ملاقاتوں سے اس کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں سے مجھے واقف ہونے کا موقع ملا۔ عیادت کے وقت اس کے لئے کچھ پھل لے جانا میرے لئے سکون کا باعث ہوتا اور وہ اس معمولی تحفے سے اس قدر ممنون ہوتا کہ مجھے شرمندگی ہوتی کیوں کہ میں اسی کے پیسوں سے اس پر احسان کر رہا تھا لیکن کوئی ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی مجھے اس ذہنی اذیت سے نجات مل گئی کیوں کہ ایک ساتھی کے دوسرے محکمے میں منتقل ہونے کے سبب سینیارٹی کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اس کی جائداد پر ترقی دے دی گئی اور سیوانندم نے رام دیال کی جگہ منصرمانہ ترقی حاصل کر لی اور اس تاریخ سے وہ کبھی رام دیال کا بہی خواہ نہ رہا۔ یہ اس کی فطری خباثتیں تھیں جو میں نے کسی دوسرے ساتھی میں نہیں دیکھیں۔ لیکن آمد و رفت کا یہ سلسلہ میں نے اب بھی جاری رکھا۔ اور میوہ لے جاتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہونے لگی۔

دوسرے دن رام دیال کی تنخواہ لے کر جب میں ہاسپٹل پہنچا تو اس کی حالت غیر تھی۔ معدہ میں ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے آنتیں سڑ گئی تھیں۔ اس پر غنودگی طاری تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں نہ یگانگت تھی نہ بیگانگی نہ شکوہ تھا نہ شکایت۔ صرف کس مپرسی تھی، موت سے جھکیں تھیں اور کچھ ایسی دہشت تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ آروند گھوش کی تصویر اس کے سرہانے پڑی تھی جس کو وہ کبھی گھنٹوں گھورا کرتا تھا۔ لیکن آج اس تصویر میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ رام دیال کی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکے۔ اس کی بیوی پائینتی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی اور سروپ مجھ سے نظریں ملنے کے بعد آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈاکٹروں سے معلوم ہوا کہ کل گیارہ بجے تک زندگی اور

موت کی جنگ کسی قطعی فیصلہ پر پہونچ جائے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سیوانندم اپنی ساری طاقتوں کے ساتھ آخری اور بھرپور وار کر رہا ہے اور جیت سیوانندم ہی کی ہوگی۔ میں نے رام دیال کی تنخواہ آہستہ سے جیب سے نکال کر سروپ کے ہاتھ میں رکھ دی اور بغیر کچھ کہے سُنے واپس لوٹ گیا۔ سروپ نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

صبح جب میں ہاسپٹل پہونچا تو سروپ مجھے ہاسپٹل کے گیٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ گیٹ کے پہلو کے ہوٹل کی جانب اس کو جاتا ہوا دیکھ کر میں نے بھی اپنا رُخ بدل دیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ رام دیال ابھی زندہ ہے۔ اس کے قریب پہونچ کر میں نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو مجھے دیکھے بغیر ہی وہ اس انداز سے مجھ سے مخاطب ہوا جیسے جانتا تھا کہ اس کی پشت پر میرے ہاتھ کے سوا دوسرا ہاتھ رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس نے کہا کہ بھیا کا آپریشن رات ہی کو ہوچکا ہے اور وہ ابھی تک بے ہوش ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ بچ جائیں گے۔ رات ہی کو آپریشن نہ ہوجاتا تو شاید بھیا بچ نہ سکتے۔ رات کو جب آر۔ ایم۔ او نے ان کا معائنہ کیا تو ان کی حالت بہت نازک تھی، اسی وقت سول سرجن صاحب کو فون کیا گیا۔ ان کے مشورہ کے بعد آپ نے رام کو موت کے منہ سے چھین لیا گیا۔ آر۔ ایم۔ او بڑے اچھے آدمی ہیں اور کل رات بھابی نے ان کے قدم پکڑ لئے تھے۔

لیکن اس کے باوجود بجلی کے سوئچ پر جمی ہوئی گرد کسی دوسری ہی انگلی نے صاف کر دی ہے۔ رسوئی گھر سے آج بھی دھواں اٹھتا ہے۔ کھڑکیوں سے گزر کر روشنی سڑک کے کنارے تک آج بھی پہونچتی ہے لیکن سروپ کی بھابی کی دھوتی الگنی پر پھر کبھی نہ جھولی۔ رام دیال کے کوٹ کے بٹن پھر مضبوط نہ ہوسکے۔ جیب اور کالر پھر نہ سل سکے۔ سروپ دیال اپنی کلاس سے آج تک غیر حاضر ہے اور ہمارے دفتر میں پروبیشنری کر رہا ہے۔ اس کی نوٹ بکس کے سادہ صفحات اس کی فونٹین پن کی نب کو چومنے کے لئے آج بھی ترستے ہیں یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ رام دیال کی سائیکل ۴۰ روپے میں ایک بنئے کے پاس رہن ہے، جس پر ماہانہ پانچ روپے کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی محبوب اور مقدس کتابیں چوک میں

پرانی کتابوں کی دوکان پر آپ کو دستیاب ہو سکتی ہیں جس پر رام دیال نے بہت احتیاط سے اپنا نام لکھا تھا۔ اس کی متعلقہ فائلیں، دوسری فائلوں کی ڈھیر میں آج بھی ایک ہی نظر میں پہچان لی جا سکتی ہیں۔ سروپ دیال کی بھابی اس آشرم میں فاقے کرتی ہے جس آشرم سے چار میل کا لمبا راستہ پیدل طے کر کے سروپ دیال روزانہ دفتر آتا ہے۔ ہمارے دفتر میں ایک اور رام دیال جنم لے رہا ہے جس میں خود اعتمادی ہے اور جو شکست خوردگی کو موت سمجھتا ہے۔ کیوں کہ رام دیال مرا نہیں ہے۔ وہ ہاسپٹل میں صحت یار ہا تھا کہ یکایک رات کو کہیں غائب ہو گیا۔ سنتے ہیں کہ اس نے پانڈ یچری کے جنگلوں میں زندگی کے راز کو پا لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رام دیال زندہ نہیں ہے وہ مر چکا ہے اور سروپ دیال مر کر بھی کبھی نہیں مرے گا۔ اس نے کہ اس نے زندگی کے اس راز کو پا لیا ہے جس کو رام دیال نہ پا سکا اور پھر ہمارے دفتر میں کتنے ہی سروپ دیال جنم لے چکے ہیں۔

---

۱ —

اے حمید

رات کا داغ

آج پھر شہر سے باہر گھنے سیاہ باغوں میں چاند طلوع ہوا ہے۔
رات بھر کے براؤن پتے کی طرح یہ کسی ان دیکھے درخت کی ٹہنی سے جھڑ کر رات کے دامن میں آن گرا ہے۔ اس کی ٹھنڈی آنچ نے تاریک درختوں اور گنجان گلی محلوں کے اوپر دھیمی دھیمی تپش کا غبار سا اڑا دیا ہے۔ اس نیم روشن جالے میں درختوں، مکانوں، مسجد کے گنبدوں اور میناروں کے خاکے ابھر آئے ہیں اور شہر سے دور امرود اور ناشپاتی کے باغوں کی جانب سے طوطوں کے شور کی صدائیں آنے لگی ہیں۔ سردیوں کی تمام کالی راتوں میں سے یہ تنہائی بن کر آتی ہے یہ رات بہت ساکت مرطوب، دھیمی اور نم دار دھند لیے آتی ہے۔ یہ بڑا سایہ ٹھنڈے اندھیروں والی رات کی ... ہے اس کے شہر میں داخل ہوتے ہی گھروں میں آگ روشن ہو جاتی ہے۔ اندھیری کوٹھڑیوں میں چراغ جلائے رکھتے ہیں۔ گرم لحافوں اور رضائیوں میں حیا کی مثال چھوڑ جاتی ہیں اور بچے اپنے اپنے بچھونوں کی طرف چلے آتے ہیں۔ پھر سرخ چونچ والا ایک اداس پرندہ اپنے پر پھیلائے کسی مکان کے آنگن سے اڑتا ہے اور سیڑھی بہ سیڑھی تصویروں والے نیم تاریک مکانوں کے اوپر سے ہوتا ہوا گنجان سیاہ باغوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ ان باغوں میں گرم خوشبوئیں اڑانے والے دھیمے سانس لینے والے گل مہر، گلاب اور گیندے کے نازک پھول کھلتے ہیں۔ ان کی پنکھڑیوں پر کسی دلہن کے ادھ کھلے شرمیلے ہونٹوں کا گمان ہوتا ہے۔ گرم اور سرخ بوسوں کے یہ دھبیلے نشان سانولی رات کے مکھڑے پر کس نے ثبت کئے ہیں؟

سنسان کالے باغوں کی تنہا رات، حنائی ہتھیلیوں سے طلوع ہوتی ہوئی گرم خوشبو کے سانس لیتی رات، رات بھر جاگتی رہتی ہے۔ نیم سرخ افسردہ دل چاند، امرود اور ناشپاتی کے

درختوں میں سے وہ بے پاؤں، ننگے پاؤں بلند ہوتا ہے اور دور گندے نالے کے درمیان گنجان بستیوں کو دھوئیں کے مرغولوں میں سمٹے ہوئے دیکھتا ہے۔ شب کے سیاہ مخمل پر جہاں وہ اپنے پیروں کے۔ دن کا نشان چھوڑ جاتا ہے، وہاں منڈلاتے ہوئے زرد گلاب کی پنکھڑیاں اپنی آنکھیں کھولتی ہیں۔

رات ان شگوفوں کو اپنے کانوں میں آویزے، بالے پہنے آم کی گھنیری چھاؤں میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ ادھر میں ایک نیم روشن گندی گلی والے مکان کی دوسری منزل میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہندو مسلمانوں کی چھوا چھوت اور تہذیبی قدروں کی بے ہنگم داستانیں سنتا رہتا ہوں۔ میرے سامنے میز پر مٹی کی ایک بوتل میں کاغذی پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ پڑا ہے۔ مٹی کی بوتل میری ہے — اور کاغذی پھول میرے ایک کاغذی دوست دے گیا ہے۔ نہ بوتل میں بیئر ہے نہ پھولوں میں خوشبو — پھر بھی یہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے ہیں جس طرح میں اپنے دوست سے۔

یہ محلہ شہر کے عام محلوں کی طرح گندہ، گنجان، تاریک اور پُر شور رہتا ہے۔ یہاں موچی — دھوبی — نانبائی — مستری — کوچوان، کلرک اور مزدوروں کے آٹھ دس گھر آباد ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں ہندو اور سکھ رہا کرتے تھے اور وہ کبھی کبھار مکانوں میں سفیدی اور چھوٹی موٹی مرمتیں ضرور کروا لیتے تھے۔ لیکن پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنے والے شاہین بچوں نے ان مکانوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ میرے بازو والے گھر میں میرٹھ کے ایک حکیم صاحب رہتے ہیں۔ ایک رات انھیں پان کی حاجت ہوئی۔ پوٹلی کھولی تو معلوم ہوا — کتھا غائب ہے۔ بڑے پریشان ہوئے۔ پان بھی برابر کا کھاتے ہیں۔ فوراً ایک ترکیب سوجھی۔ چھری لی، دیوار کی سفیدی کو ایک جگہ سے کھرچا اور پتے میں رکھ کر کھا گئے۔ خدانخواستہ ان کے ہاں کبھی فاقہ آ جائے — کوئی تعجب نہیں کہ حکیم صاحب مکان کی منڈیریں ہی کھانا شروع کر دیں۔ آپ کے بڑے لڑکے کو گانے کا بہت شوق ہے۔ دن میں کئی بار یہ مرض اس پر حملہ کرتا ہے جب کبھی کاغذ قلم لیکر میں کچھ لکھنے بیٹھتا ہوں تو ساتھ والے مکان سے ایک دردناک چیخ بلند

ہوتی ہے اور تمایا راج کماری کا بھوت حکیم صاحب کے بڑکے کا گلا دبانا شروع کر دیتا ہے
پھر اس کے حلق سے عجیب قسم کی ڈراؤنی آوازیں نکلتی ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی
قصائی کسی داڑھی والے پہاڑی بکرے کو گھسیٹتا ہوا بوچڑخانے لئے جا رہا ہو۔

● میں کاغذ قلم میز پر رکھ کر بکرے کے ذبح ہونے کا انتظار شروع کر دیتا ہوں جب چیخ پکار کے
میرے چین سمندر میں سکون کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ـــ سکوت کی ایک ننھی سی گھڑی آتی ہے
میں پھر بیٹھتا ہوں اور سگریٹ سلگا کر لکھتا ہوں کہ ڈمرو... ڈمرو... ڈمرو...

"دوپٹے ریشمی ـــ سوٹاں قمیضاں شلواراں کمنیاں، ویلاں" پھیری والا بزاز اپنا ڈمرو
بجاتا گلی میں داخل ہوتا ہے۔ شاید شوجی مہاراج نے دھرتی کا ناش کرتے سمے اسی بے دردی سے
ڈمرو بجایا ہوگا۔ جس طرح یہ بزاز بجاتا ہے۔ پہلا ڈمرو گلی میں داخل ہونے پر بجتا ہے۔ دوسرا ٹینا
میری کھڑکی کے نیچے اور تیسرا گلی کے موڑ پر۔ پھر وہ "سوٹاں، شلواراں اور ویلاں" کی تیکھی اور
کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی ہانک لگاتا ہے۔ جیسے شوجی مہاراج نے اپنا ترشول تھام لیا ہے۔
اور دھرتی کا سینہ چھلنی ہونے لگا ہے۔ پھر ڈمرو بجتا ہے، ترشول چلتا ہے "دوپٹے سوٹاں شلواراں
اور ویلاں اور ستارے۔ پہاڑ، چٹانیں اور کھمبے اور مکان اکھڑ اکھڑ کر گرنے لگتے ہیں۔ اور
ان کے نیچے سب کچھ دب جاتا ہے ـــ وادیاں ـــ چشمے ـــ دریا ـــ پھول ـــ چشمے اور
میرا قلم ـــ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو اللہ کا نام اور بزاز کا ڈمرو... ڈمرو... ڈمرو... ڈمرو

گوجروں کے باڑے میں جگہ جگہ گوبر کے ڈھیر پڑے ہیں جہاں مکھیاں اور مچھر بھنبھنایا کرتے ہیں۔
یہ گوبر تھاپیوں کی صورت میں ان کے مکانوں کی دیواروں پر بھی چڑھ گیا ہے۔ شام کو جب شہر سے
باہر امرود کے باغوں میں گلاب، گل مہر ـــ اور گیندے کے کیسری پھول۔ اپنی مہک پنکھڑیوں
میں سمیٹ لیتے ہیں تو گلی میں گوبر کھیلنے لگتی ہے۔ مگر وہاں کوئلیں کوکتی ہیں اور یہاں گائے
بھینسیں ڈکراتی ہیں۔ وہاں درختوں سے پکے ہوئے رنگ دار پھل گرتے ہیں۔ اور یہاں کھرپوں
کی مدد سے ـــ دیواروں سے تھاپیاں گرائی جاتی ہیں اور دودھ میں پانی ملایا جاتا ہے۔ پھر
ایک بھینس رسی تڑا کر بھاگتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا مالک بھی دھوتی سنبھالتا

بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور محلے میں وہ دھما چوکڑی مچتی ہے کہ بچے ڈر کر گھروں کی ڈیوڑھیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ اور ان کی مائیں کھڑکیوں میں لٹک کر انھیں پکارنے لگتی ہیں۔ "وے شیدے ـــ وے شیرے ـــ وے بسیرے"۔ دن بھر یہ گائے بھینسیں گلی میں ادھر ادھر بیٹھی جگالی کیا کرتی ہیں۔ کٹھی سنگ کی ایک گائے کو مجھ سے بڑی عقیدت ہے۔ وہ اپنی دیگر مصروفیات میں سے ایک آدھ گھنٹہ میری کھڑکی کے نیچے ضرور بسر کرتی ہے۔ چپکے سے آن کر بیٹھ جاتی ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد عبرت انگیز ڈکاریں لیتی رہتی ہے۔ ایک روز میں پلنگ پر لیٹا "ہملٹ" پڑھ رہا تھا کہ اچانک ـــ ڈائیں ـــ کی خوفناک آواز بلند ہوئی ـــ "ہملٹ" اپنے باپ کی روح سے ہم کلام تھا میرے ساتھ وہ بھی ڈر کر سہم گیا۔ معلوم ہوا کہ میری دوست گائے نے ڈکار مارا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے برادرم شیکسپیر نے ڈراما لکھتے لکھتے یہ حرکت کی ہو۔ میں نے کتاب میز پر رکھ دی اور ڈکار مار کر سو گیا۔ سامنے والے مکان کی بیٹھک میں کچھ موچی، کاریگر بیٹھتے ہیں۔ یہ لوگ پرانی وضع کی کاٹھ کی ایڑیوں والے سینڈل اور سلیپر بناتے ہیں۔ سارا دن یہ پتھر کی ملائم سلوں پر چمڑا کاٹتے اور کوٹتے رہتے ہیں۔ دوپہر کو ریڈیو "فل اسپیڈ" پر چھوڑ کر سنتے ہیں۔ اور جب ریڈیو بے ہوش ہو جاتا ہے تو خود گانا شروع کر دیتے ہیں۔

دھوبی گھاٹ بھی محلے ہی میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنے احاطے میں پانی کے حوض بنا رکھے ہیں جن میں کھڑے ہو کر یہ میلے کپڑوں کو پتھروں پر پٹخا کرتے ہیں۔ ایسا کرتے سمے ہر آدمی حلق میں سے اپنی الگ آواز نکالتا ہے۔ یہ آوازیں خود بخود نکلتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو ـــ تو وہ بہت جلد تھک کر چور ہو جائیں۔ ان کی بسم اللہ رات کے پچھلے پہر تین بجے کے قریب ہوتی ہے۔ آپ بڑے سکون کے ساتھ خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں کہ اچانک ـــ تڑاپ ـــ تڑاپ ـــ پٹاخ ـــ پٹاخ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ آپ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آپ کا خوابِ خرگوش دھوبیوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے بھاری بھاری پتھروں پر پٹخ رہے ہیں۔ اب آپ سونے کے لاکھ جتن کریں مگر وہ خواب خرگوش پھر قابو میں نہ آئے گا ـــ میلے کپڑوں کے گیلے گٹھے دھڑا دھڑ آپ کی چارپائی پر ـــ آپ کی پشت پر کوٹے جا رہے ہیں۔ اور آپ کو دھکے مار مار کر اس گھر سے،

س گلی سے ــــ اس شہر سے باہر نکالا جا رہا ہے، ہفتے میں ایک بار یہ لوگ کپڑوں کا میل کاٹنے کے لئے بھٹی گرم کرتے ہیں۔ اسے اصطلاح میں بھٹی چڑھانا کہتے ہیں۔ اس روز گلی میں ڈی ٹول کی ایسی تیز بو پھیلی رہتی ہے کہ آپ جو چیز بھی کھائیں گے ــ پہنیں گے ــ پڑھیں گے ــــ سنیں گے ڈی ٹول اس میں ضرور ہوگی۔

ایک روز میں تھامس مان کی ایک کہانی پڑھ رہا تھا کہ دھوبیوں نے بھٹی گرم کرنا شروع کر دی۔ احاطے کی طرف سے "ڈی ٹول" کی تیز بو کے بھبکے آنے لگے۔ مجھے ایسا لگا جیسے مان صاحب کہانی کا دھندا چھوڑ، کپڑے اتار بھٹی چڑھانے لگے ہوں۔ میں نے کتاب بند کر دی اور کپڑوں کی دھلائی کا حساب کرنے لگا۔ کمزور دل عینک پوش کلرک اپنے بھائی کے ہاں رہتا ہے۔ اس کی شادی کو زیادہ مدت نہیں گذری۔ بھاوج نے ان لوگوں کو مکان کی تیسری منزل میں دیس نکالا دے رکھا ہے۔ یہاں صرف ایک برساتی ہے اور ایک دالان ــــ برساتی کے آگے بوریا ڈال کر اندر پلنگ اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان۔ یہ دونوں ہنس کھیل کر، لڑ جھگڑ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے اس لئے لڑائی جھگڑا ذرا کم ہوتا ہے۔ دونوں کا آپس میں بڑا پیار ہے۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں ــــ کہ کلرک کی بھاوج دلہن کو طعنے دے رہی ہے۔ دلہن پلو آنکھوں میں ٹھونسے برساتی کے کھمبے سے لگی سسکیاں بھر رہی ہے۔ اور پریشان خاوند دونوں کو چپ کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر بدمزاج جھگڑالو بھاوج بولے جا رہی ہے۔ اور دلہن روئے جا رہی ہے ــــ مت رو ــــ مت رو ــــ کم سخن ــــ بے زبان گلے مت رو ــ یہاں تیرا کون ہے؟ نہ ماں ــ نہ باپ ــ نہ بہن نہ بھائی ــ خاوند ہے تو وہ بھائی کے احسانوں سے دبا ہوا۔ وہ نہ بھاوج کے سامنے بول سکتا ہے نہ بھائی سے گلہ کر سکتا ہے۔ اس نے اسلئے شادی کی تھی کہ اسے اس ڈربے میں ایک عورت کی ضرورت تھی۔ اور وہ کہیں باہر جھک نہیں مار سکتا تھا۔ اسے اب معلوم ہوا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ اپنے ڈربے میں جھک مارتا ہے وہ بیوی بھی ہے اور کسی کی بہن۔ اور کسی کی بیٹی بھی ہے۔ اور کچھ دن گذر جانے پر ماں بھی ہوگی۔ اس لئے وہ پریشان ہے اور تمہیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مت رو۔ مت رو۔ اور اپنے آنسو پونچھ ڈال ــــ!

دوسرے روز شام کو میں نے دیکھا کہ کلرک کے ہاتھ میں لفافہ ہے جس میں سے شکر پارے نکال کر اپنی بیوی کے منہ میں ڈال رہا ہے۔ دلہن شرما بھی رہی ہے اور خوشی سے پھولی بھی نہیں سمارہی۔ میں اس وقت مگر سچی خوشی کا منظر دیکھ کر ہنس پڑا۔ خدا انہیں باہم پیار و محبت کی توفیق دے اور روز دن ڈرا دیسے آئے جب اس کلرک کے ہاتھ میں شکر پاروں کی جگہ جوتا ہو۔ سبزی ترکاریوں کے آڑھتی کا لونڈا بال سنوار کر اپنے مکان کے باہر کبھی ہوئی کھاٹ پر آن بیٹھتا ہے اور فصل نانبائی کی لونڈیا سے آنکھیں لڑایا کرتا ہے۔ اس لونڈیا کا رنگ کالا مگر نقشہ تیکھا ہے۔ وہ بھی دانتن سرمہ لگا کر کھڑکی میں آ جاتی ہے اور اپنی سہیلی سے باتیں کرنا شروع کر دیتی ہے۔

"ستاؤ دری کیا حال ہے ؟ آج تو بڑی لشک رہی ہو ــــ" یا آڑھتی عاشق بھی اس کا جواب اپنے کسی دوست کو مخاطب کر کے دیتا ہے۔

"تم بھی قیامت ہو کالو ؛ چلو مہر آن ٹکس میں بیٹھ کر رنگیلی دیکھیں کیوں ؟ بہتر ہے صلاح ؟"

اس کا الٹ محلے والی ہی ہمیں بڑے آڑھتی کی آواز آتی ہے۔

" ادے میتے افیا اوے ــــ بھنڈی توری کی پرچی کہاں ہے ؟" اور رسا آیا میاں جی" کہہ کر اندر کو دوڑتا ہے۔

چھٹی کے روز محلے کی رونق اور شور میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دن گلی کے لڑکے بندے کی نیلی پیلی وا ہیات پتلونیں پہنے، گلے میں بھڑکیلے رنگوں والے مفلر لٹکائے، بالوں میں تیل اور جوتوں میں پالش چمکائے مرغوں کی طرح ادھر ادھر اینڈتے پھرتے ہیں۔ کبھی یہاں کھڑے ہو کر کسی فحش مذاق پر قہقہے لگا کر ہنستے ہیں۔ اور کبھی وہاں کھڑے ہو کر راہ چلتی عورتوں پر دبی آواز میں آوازے کستے اور انھیں سر سے پاؤں تک گھورتے رہتے ہیں۔ ان میں کوئی موچی کا لڑکا ہے اور کوئی دھوبی کا ــــ کوئی کسی ریٹائرڈ حوالدار کا فرزند ہے تو کوئی کسی پیشہ ور سرکاری گواہ کا۔ کوئی نانبائی ہے تو کوئی خرادیہ اور کوئی گوجر ــــ کوئی نور جہاں پر عاشق ہے تو کوئی صبیحہ کا شیدائی۔ کوئی ثریا کے عشق میں گرفتار ہے تو کوئی مدھوبالا سے شادی کا خواہش مند ہے۔ کوئی نانبائی کی لڑکی پر فدا ہے اور کوئی کسی دھوبن کی پریم کہانی مزے لے لے کر سناتا ہے۔ کوئی فلم ایکٹر بننے کا شوقین ہے اور کوئی ابادان جا کر خوب روپیہ کمانے کے بعد صبیحہ سے شادی رچانے کا ارادہ

بکھاتے ہیں۔ ان میں سے ہر دوسرے کی بہن کسی تیسرے سے عشق کرتی ہے۔ یہ دوستیوں کی آڑ میں ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی بہنوں سے آنکھیں لڑاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی ماں کو گٹھیا کا مرض ہے۔ کسی کی بہن دق کی مریضہ ہے اور کسی کا باپ دمے میں مبتلا چھجوں میں بیٹھا کھانستا رہتا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے مقروض ہیں۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خامیوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کسی کا بڑا بھائی پوسٹ کیے ہاتھ پیر اٹھائے ہوئے ہے۔ کسی کا ہنرقی جیسے گھر کا خرچ دیتا ہے اور کسی کی دائم المرض ماں محلے والوں کے کپڑے سی کر انھیں کھلاتی ہے۔ اور اس قابل نہ تھی کہ یہ مدعو بالا سے عشق کریں۔ ان میں کوئی چوتھی یا مڈل سے اور کوئی پانچویں فیل۔ کسی کے ماں باپ کیا کٹ کے ہیں اور کسی کا کرنہ بھاگ گئی ہے۔ کوئی بالکل ان پڑھ ہے اور خراد والوں کی دکان پہ کام کرتا ہے۔ کوئی قالین بافوں کی بارسے بھاگا ہوا ہے اور کوئی اپنے باپ کے ساتھ شام کو تنور پہ بیٹھتا ہے۔ کوئی کسی کارخانے میں اپرنٹس ہے اور کوئی درزی کی دکان پر ابھی کاج کرنے ہی سیکھ رہا ہے۔ اور کوئی بیکار ہے۔ اور سوائے ماں بہن سے لڑنے جھگڑنے، انھیں گالیاں دینے، دو رہنوں کی روٹیاں توڑنے اور بے غمی کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا۔ کوئی راتوں کو بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ ہاتھوں ہوٹلوں اور سینما گھروں میں گھومتا ہے اور کوئی جواریوں کی بیٹھک میں جاکر انھیں جوا کھیلتے، ہارتے جیتتے، لڑتے جھگڑتے، شراب پیتے اور بدمستیاں کرتے دیکھا کرتا ہے۔

ابھی جوانی کا آغاز ہے۔ ابھی اس گلی کو بہت کچھ دینا ہے بہت کچھ سکھانا ہے۔ جب یہ بڑے ہو جائیں گے اور سب کچھ سیکھ جائیں گے تو اس گلی کے نام اپنا سارا قرض بے باق کر دیں گے۔ جو کچھ انھوں نے یہاں سے حاصل کیا ہے وہ مع سود اسے واپس کر دیں گے۔ کوئی کسی بھرے ہوئے کسی جیتے ہوئے جواری کو چاقو گھونپ کر اس کا چاقو کھا کر مر جائے گا۔ کوئی کسی کی لڑکی اٹھا کر بھاگ جائے گا۔ اور کسی کی خون آلود دم توڑتی لاش کو لوگ نالی پر سے اٹھائیں گے۔ کوئی مجمع لگا کر منجن بیچے گا۔ اور کوئی اس مجمع میں لوگوں کی جیبیں کاٹے گا۔ کوئی حلال کی روزی کماتے کماتے تنگ دستی اور حق تلفی کی چھری سے حلال کر دیا جائے گا۔ اور کوئی مربے میں رنگدار بورا اور چائے میں کیکر کی چھال ملاتے ملاتے

لکھ پتی بن جائے گا۔ اور ایک دن پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر حج بیت اللہ کی غرض سے عازم حجاز ہوگا۔ اور جب واپس آئے گا تو چہرہ پہلے سے زیادہ منحوس اور بے مہر ہوگیا ہوگا۔ اور جب بڑھاپا آئے گا تو سوچے ہوئے جوڑ لئے کھاٹ پر پڑ جائے گا اور لاڈلی اولاد اس کی موت کی دعائیں مانگا کرے گی ـــــ اور کوئی بزازی کے تھان اُٹھائے ڈمرو ہاتھ میں لئے گلی گلی گھومتا پھرے گا۔ اور بارہ آنے گز کی ململ تین روپئے گز فروخت کرے گا۔ اور ایک روز بیمار پڑ جائے گا ـــــ اور جب ڈاکٹر کا نسخہ لے کر دواؤں کی دوکان پر جائے گا ـــــ تو سوا روپئے کا ٹیکہ پندرہ روپے میں لے گا۔ پھر کئی ٹیکے لگیں گے۔ کئی پندرہ روپے دیکھتے دیکھتے اُڑ جائیں گے۔ اور جب اچھا ہو جائیگا تو پھر دم دبائے گرمل ٹیکہ گا۔ اور ہر گز کے پیچھے سوا دو روپئے کمائے گا۔ اور ہر سوا روپے کا ٹیکہ پندرہ روپوں میں خریدے گا۔ اور یوں ایک اور علی بابا ـــــ چالیس ہزار ـــــ چالیس لاکھ ـــــ اور چالیس کروڑ چوروں کے اس ہمہ گیر گروہ میں شامل ہو جائے گا۔ جن کی کمین گاہوں کا سلسلہ مشرق بعید سے مشرق وسطیٰ اور مشرق وسطیٰ سے نئے نئے براعظموں تک پھیلا ہوا ہے ان میں وہ بے چارہ جو کچھ نہ کر سکے گا ـــــ گلی کی نکڑ پر کسی مکان کی سیڑھیوں میں پان سگرٹ کی دوکان کرے گا۔ کسی خوش شکل لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک فوٹو کھنچوائے گا۔ اسے فریم کروا کر دوکان میں آج نقد کل ادھار کی تختی کے ساتھ لگائے گا۔ اور خدا کا نام لے کر بلیک میں سگرٹ خرید کر بلیک میں فروخت کرنے شروع کر دے گا۔ اور ایک روز پکڑا جائے گا ـــــ اور ساٹھ روپے جرمانہ ادا کر کے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کچہری کے احاطے سے نکل کر گھر کی طرف رواں ہوگا۔ یہ گلی ان لوگوں کو یہی کچھ دے سکتی ہے۔ اور یہ لوگ بھی اس گلی کو یہی کچھ واپس کر سکتے ہیں۔ یہ ایک کھوٹے سکوں کی ٹکسال ہے جہاں سے نکلا ہوا سکہ ادھر ادھر بھٹک کر پھر اسی مشین میں آن گرتا ہے۔

4757

یہاں لوگ ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو کر رہتے ہیں۔ پانچ کمروں والے مکان میں دس کنبے آباد ہیں اور ہر کنبہ دوسرے کنبے سے چوبیس گھنٹے لڑائی پر آمادہ رہتا ہے اور جب یہاں لڑائی چھڑتی ہے تو کبھی مردوں کی وجہ سے عورتیں میدان جنگ میں کود پڑتی ہیں۔ اور کبھی عورتوں

دوسرا پکار دیکھ کر مرد مورچے سنبھال لیتے ہیں۔ پھر عورتیں الگ لڑتی ہیں ـــ اور مرد الگ ـــ بچے الگ لڑتے ہیں اور مرغ مرغیاں الگ ـــ عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر ایک دوسری کو ننگی در مخش گالیاں دیتی ہیں۔ اور ایک دوسری کے کچے چٹھے بیان کرتی ہیں۔ یہ بھید اس وقت کھلتا ہے کہ کون سی دھوبن کس نانبائی کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔ کون سی موچن کس کس کے پاس جاتی ہے۔ اور کون سی عورت اصل میں کس کا بچہ گود میں لئے لئے پھرتی ہے۔ ایسی لڑائیاں یہاں ہوتی ہی رہتی ہیں اور میں انھیں بڑے شوق سے چق کے ساتھ لگ کر دیکھا کرتا ہوں۔ میری نظر لڑنے والی عورتوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔ جو وحشت اور از خود رفتگی اور بے حیائی کے اس مکروہ مظاہر میں نیلے پیلے ہو کر بگڑے ہوتے ہیں جیسے ان پر مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اس وقت خوش شکل عورتیں بھی بد صورت اور کریہہ المنظر دکھائی دیتی ہیں۔ اور میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر انسان کے ذہن میں سے وہ شے نکال دی جائے جو اسے متوازن اور معتدل رہنا سکھاتی ہے تو وہ محض اعصاب ـــ پٹھوں ـــ رگوں اور وریدوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے سمٹنے ـــ سکڑنے اور پھیل جانے سے وہ دیکھتے دیکھتے خوبصورت سے بدصورت اور بدصورت سے مکروہ صورت بن جاتا ہے اور اگر یہی عارضی عمل مستقل حیثیت اختیار کر جائے تو ہم انسان کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ بے حیا ہے، یہ کمینہ خصلت ہے اور یہ سنگ دل۔ اسی شے لطیف کے ہونے سے وہ انسان ہے اور اگر یہی نہیں تو وہ حیوان سے بھی کمتر ہے۔ بدتر ہے ـــ لیکن یہ شے مجھے اس گلی میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔

ویسے رات کو اس گلی میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اور دکان بڑھا کر یا سینما دیکھ کر واپس گھروں کو جانے والے لوگ تجربے اور حافظے کی روشنی میں گھر پہنچتے ہیں۔ ادھر سے جانے والا آدمی ادھر سے آنے والے کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ جب وہ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو ان کی طرح گمراہی کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔

انسانوں کے ساتھ ساتھ اس محلے کے مرغ بھی طبیعت کے اعتبار سے غیر معتدل اور غیر معتبر ہیں۔ ان میں سے کوئی شام کے سات بجے صبح کی اذان دیتا ہے تو کوئی رات کے نو بجے

شاید یہ بھی امریکی نظام کا اثر ہو۔

مگر گلی کی نکڑ والا بوڑھا پھل فروش اس نظام سے بھی محروم رہتا ہے۔ میں نے اسے شاید ہی روٹی کھاتے دیکھا ہو۔ مگر بس کی منڈی کی کوٹھری میں وہ چھیچھڑوں کے درمیان بیٹھا کاغذ جلا کر ٹین کے ڈبے میں چائے بناتا ہے۔ اور اسے ناریل کے کھوپے میں ڈال کر پیا کرتا ہے۔ ضعیف میلی انگلیوں کی کمزور گرفت میں کھوپا کانپ رہا ہوتا ہے اور بوڑھا ہلتے ہوئے سر کو جھکا کے اس شوق اور رغبت سے چائے پیتا ہے جیسے بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ پی رہا ہو۔ وہ گندے اور گلے سڑے پھل بیچا کرتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ پھل میوہ منڈی کے کوڑا کرکٹ سے اٹھا لاتا ہے۔ ایک دور داروغہ صفائی نے اس کا سارا ٹوکرا نالی میں پھنکوا دیا تھا۔ بوڑھا کچھ نہ بول سکا۔ دوکان کے کٹھڑے پر بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھتا رہا جو اس رات کو بہتی نالی میں گرا رہے تھے داروغہ صاحب کی نظر سے چھپتے ہوئے آدھی کھا رہے تھے۔

اس قدر بھی لوگ بیماریاں جھیلتے ہیں بھلا ایسے پھل کھا کر کبھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے اور ادھر بھی بھلا ایسے پھل بیچ کر کبھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ پھر بھی یہ بے شرم بڈھا زندہ ہے۔ اور دو کھوپا چائے اور تنور کی ایک روٹی کے سہارے گرمستی کے مانند گلی گلی ٹھوکریں در بدر کنوست پھل لئے پھرتا رہتا ہے۔ اور بیماریاں پھیلاتا رہتا ہے۔ گلی کا حبیب آپ کے مقصد ورآوارہ کتوں کو کھلانے کے لئے زہر کی گولیاں لائیں تو ایک گولی اس بڈھے کے لئے بھی لیتے آئیں۔ اس لئے کہ یہ بھی آوارہ ہے۔ بے مقصد ہے۔ یاد رکھئے اس نے گلی کے سیٹھ میں سے زندگی کا مارا ہوا سانپ کھا لیا ہے۔ اور باؤلا ہو گیا ہے۔ اور محلے والوں ـــــ شہر والوں کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ دیکھتے نہیں اس کے منہ سے موت کا نیلا جھاگ بہہ نکلا ہے۔ اور اس کے اعصاب اکڑ گئے ہیں اور آنکھیں کھینچ کر آسمان کو ٹکٹکی باندھے تک رہی ہیں۔

اخبار فروش لونڈا سائیکل پر سوار چیختا ہوا گلی میں سے گذر گیا ہے۔

"دے دیا ۔۔۔ مہر حقیقہ بخش نے ایک اور بیان دے دیا ۔۔۔" شاباش مہر حقیقہ بخش! آج تو نے قوم کو ایک اور بیان دیا ہے۔ ایک اور حرامی بچہ عطا کیا ہے ۔۔۔ خدا تیرے سیاسی معاشقوں کی ناجائز اولادیں محفوظ رکھے۔ تو بیانوں پر بیان دیئے جا ۔۔۔ بچے پر بچہ جنے جا اور انہیں اپنی تقریروں کے غلیظ پوتڑوں میں لپیٹ کر رات کی سیاہی اور دن کی روشنی میں پھینکے جا ۔۔۔ کبھی بھاٹی دروازے کے بدرو میں ۔۔۔ کبھی موچی دروازے کے گندے نالے میں۔ ۔۔۔ قوم کو اس وقت تیرے بیانوں کی ۔۔۔ تیرے حرامی بچوں کی شاید ضرورت ہے ۔۔۔ دیکھتے نہیں۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔ اور رنگ پیلا ہے اور اس کی محنت کا پھل نالی میں ہے ۔۔۔ اور وہ بھوک پر موت کا تھال اور کثیف انگلیوں پر ادھار چائے کا گھونٹ تھامے تیرے بیانوں کا انتظار کر رہی ہے ۔۔۔!

میں کبھی سے گلی میں دل کا کشکول لٹکائے ۔۔۔ میں ہر پہر کی خالی بوتل میں کاغذی پھول سجائے کھلی کھڑکی کے ساتھ لگا سورج کے انتظار میں ۔۔۔ بیمار رات کے داغ گن رہا ہوں۔ میرے ماتھے میں بھی پھیکی چائے ہے اور میری محنت کا پھل بھی میرے سامنے گندی نالی میں گرا پڑا ہے۔ میرا ایک ہاتھ روتی ہوئی آنکھوں پر ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے کانٹوں کی فصل کاٹ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جہاں کی ہری بھری کھیتیاں پیلی تھیں آج وہاں نار خطیوں کے جلتے ہوئے بلبلے دیکھ رہا ہوں۔ جہاں آر بتیوں کے ایک تار سے سلگا کرتے تھے۔ وہاں مردہ لاشوں کی انتڑیاں جل رہی ہیں۔ اور جہاں صندل میں بھگوئی ہوئی راکھڑیوں سے بلاوا محبت کے پیمان باندھے تھے وہاں شمشانوں سے اٹھنے والی بھوتوں کی منحوس آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میرے ایک بازو پر عشق پیچاں کی بیل چڑھ گئی ہے اور دوسرا خاردار تاروں میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ ایک پاؤں اگر سنگ مرمر کے چبوترے پر ہے تو دوسرا دلدل نے پکڑ لیا ہے۔ اور میں اندھیرے کنویں میں پڑا ان بھائیوں کی یاد میں نوحہ کناں ہوں جو میرا خون آلودہ جامہ لے کر میرے گھر چلے گئے ہیں۔ کل جس دوستی کو میں نے امام ضامن کا تعویذ سمجھ کر اپنے بازو پر باندھا تھا آج وہ سانپ بن کر میری آستین میں پھنکار رہا ہے۔ جبر اعتقاد

کے زہر کو میں نے زعفران کا نام دے کر پی لیا تھا۔ وہ آج سیاہ خون بن کر میرے نتھنوں سے بہہ نکلا
ہے جس روشنی کو میں نے چاند سمجھ کر چوم لیا تھا وہ بے نور راتوں کا اندھیرا بن کر میرے چہرے کو داغدار
کر گئی ہے جس ہاتھ کو میں نے پیار سے اپنے دل پر رکھا تھا۔ آج اس کے ناخون میری پسلیوں میں
پیوست ہیں۔ کل جس گم کردہ راہ کو میں نے اپنی دہلیز پر چراغ جلا کر پناہ دی تھی۔ آج وہ میرے سامان
کو بھرے بازار میں نیلام کر رہا ہے۔ اور جس دوستی ـــــ جس بھروسے کو میں نے اپنی چھاتی سے
دودھ پلایا تھا آج اسی کا زہر اپنا پھن اُٹھائے مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ اور کل جن گورکنوں کے منحوس
چہروں پر میں نے چشمۂ حیواں کے پانی کا چھینٹا مارا تھا آج وہ کھدی نالی میں کدال لئے میری
لاش کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور میرے ارجن کے درخت ـــــ اور گل مہر کے پھول اور دلہنوں
کے حنائی ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے ہیں۔ اور میری محنت کا پھل گندی نالی میں ہے اور میرا
سیاہ کشکول حسرت زدہ آنکھ کی طرح میرے گلے میں ہے ـــــ میرے دل میں ہے۔

وہ کون سی رات ہوگی جس کے تاروں بھرے سمندر کی آخری لہر واپس جاتے ہوئے میرے کشکول
میں چاندنی کے جھاگ کی خیرات ڈال جائے گی۔

ایک سرخ چونچ دار معصوم پرندہ گنجان گلی .. کے اونچے نیچے مکانوں کی ویران چھتوں پر سے
اُڑتا ہوا میری کھڑکی کے سامنے منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے اپنی میٹھی بولی میں مجھے بتایا ہے کہ ان
بوسیدہ مکانوں والی گری گلیوں سے ـــــ امرود اور ناشپاتی کے باغوں کے ساتھ کسی گھر کا ایک کھلا
آنگن ہے ـــــ بیری کے درخت والا آنگن!

چیت بیساکھ کے مہینوں میں اس بیر پر سے پکے پکے بیر آنگن میں گرا کرتے ہیں۔ ہرے ہرے
طوطے سارا سارا دن اس کی گھنیری شاخوں میں خوشی سے چلایا کرتے ہیں۔ ان دنوں بیری میٹھی میٹھی
نیم گرم سی رس دار خوشبو دیا کرتی ہے جسے سونگھ کر پنجاب کی "شکر دوپہروں" والے اُداس گاؤں اور
ان کے ویران ٹکڑے یاد آ جاتے ہیں۔ یہ غمگین خوشبو آنگن میں پھیلی رہتی ہے۔ اسی آنگن میں پانی والے
نل کے پاس ایک لڑکی گیندے کا بسنتی پھول لگائے انگیٹھی کو پنکھا کرتے ہوئے کوئلے سلگا رہی ہے اسکی
آنکھوں میں سرمہ لگا ہے۔ اور گال پر ایک ننھا سا کالا تل ہے۔ ایک رنگ دار شیاما چڑیا نل پر بیٹھی اپنی ناز

گردن جھکائے اس لڑکی کو تکتی رہتی ہے۔ اور اس کی چوڑیوں کی چھنکار سنا کرتی ہے۔ یہ لڑکی بھی اس گھر کے آنگن کا ایک تل ہے۔ خوبصورتی —— محنت اور معصومیت کا تل —— نورانی صبح کے گال پر بچھڑی ہوئی رات کا افسردہ بوسہ۔

میں کھڑکی کے پٹ سے لگا اپنی خون رنگ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کبھی رنگ دار شیاما کو دیکھا کرتا ہوں اور کبھی اس لڑکی کو۔ اور کبھی گیندے کے بسنتی پھول کو جو اس کے سنہری بالوں میں مسکرا رہا ہے۔ ایک روز یہ ہنس مکھ پھول پتھریلے آنگن میں گر کر مرجھا جائے گا اور دوسرے روز کوڑا کرکٹ کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا جائیگا۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہو گا اور پیلے ٹکڑے پر جا بجا آنسوؤں کے داغ ہوں گے۔ اس روز میں اسی ڈوبے ہوئے سورج کو اٹھا کر اپنے کشکول میں ڈال لوں گا۔ اور کسی سنسان رات کو کانٹے دار بیری کے درخت کے نیچے سوئے ہوئے آنگن میں اس لڑکی کی تلاش میں نکلوں گا۔ جس کے بالوں میں اس پھول کی مہک اس آفتاب کی دھوپ بکھر کر رہ گئی ہے۔ سیاہ آفتاب کو اپنی آستین میں چھپائے میں ان اندھیرے غاروں میں صبح کی پہلی کرنوں کا سراغ لگانے چلوں گا، جہاں اندھے کا فوری اندھیرے جدائی کی راتوں کے سیاہ پھریرے تیار کرتے ہیں۔ جہاں کالے پتھروں پر بیٹھ کر بین کرتی ہوئی بیوہ شامیں اپنی رنگین چوڑیاں توڑتی ہیں اور اپنی مانگ کا سیندور نوچتی ہیں ——

جھکی ہوئی بیری کے سایے میں نل کے پاس بوڑھے باپ کے کپڑے دھونے کو کیلے سلگانے والی شیاما! یہ گیندے کا پھول تیرے ہی بالوں میں سجنے کے لئے اپنی ڈال پر کھلا تھا اور اس پیڑ نے تیرے ہی قدم چومنے کے لئے اپنے پھل آنگن میں گرائے تھے۔ تو نے اپنے باپ کی میلی پگڑی پر صابن ملتے ہوئے ہمیں پلکیں اٹھا کر پیار بھری نظروں سے دیکھا ہے۔ ہم تیرے دل کا بھید پا گئے ہیں۔ اور ہمیں تجھ سے حیا آنے لگی ہے۔ ہم جو کے ننگوں کو اپنی محبت کا زرتار دوشالہ مت اوڑھا —— ہم ایک ایک دن اسے بیچ کھائیں گے۔ ہمارے ماتھے پر اس مقدس امانت کا تلک نہ لگا ہم آنکھ اوجھل ہوتے ہی اس تلک کو داغ بنا کر دل میں اتار لیں گے۔

—— اور تجھے بھول جائیں گے۔ اور یاد کریں گے۔ ہم تیرے بالوں میں پھول لگا کر تجھے پیار

نہیں کر سکتے [illegible] پھول پہ تیرا نام لکھ کر تجھے سدا یاد رکھ سکتے ہیں اور جب وہ پھول مرجھا جائے گا تو ہم اسے اپنی کتابوں میں سنبھال کر رکھ لیں گے۔ اور جس روز تیرے سنہرے بال [illegible] کی طرح [illegible] نیلے سفید ہو جائیں گے اور جوانی کے تمام تیکھے اور تپتے ہوئے خطوط ڈھلک [illegible] گھر کے آنگن میں بیٹھی کمزور ہاتھوں سے [illegible] کات رہی [illegible] مٹکتے پھرتے پنچھی سے ایک دن تیرے آنگن میں آ [illegible] پیار [illegible] پاس [illegible] تیرے سفید بالوں کی مانگ میں سجا کر واپس چلے [illegible] خوشی [illegible] تھرانے والی [illegible] تجھے نہ دیکھتے ہوئے [illegible] ہم ان دونوں کو جھٹلا [illegible] سگرٹ [illegible] ہماری [illegible] سے تمہیں [illegible] ہم پیچھے بالوں [illegible] کو کھلا [illegible] اور تجھے [illegible] آتی سے [illegible] تمام [illegible] ادھ جلا ادھ بجھا سگرٹ ہیں۔ اور [illegible] ہے۔ ہم بیڑی کی بوتلوں کے اٹے ہوئے گرے ہوئے [illegible] تو وہ [illegible] سینہ [illegible] کا سینہ تابناک ہو جو ہم سے [illegible] اس طرح دیکھ ــــ جس طرح [illegible] روشنی میں اپنے سارے داغ۔ سارے [illegible] ہماری طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لے اور ہم سے روشنی کا رشتہ توڑ دے ہماری نظروں سے اپنی نظریں نہ ملا ـــــ ہمارے پالنے میں اپنا دودھ پیتا اور ہماری گود میں اپنا لعل نہ چھپا۔ ہمیں پیار بھری نظروں سے نہ دیکھ۔ شمشان بھومی میں گل صد برگ کے بیج بکھیرنے والی! تجھے ایک روز مردہ ہڈیوں کی فصل کاٹنا ہوگی۔ ہم سے کوئی ناتہ نہ جوڑ۔ ہم تاریک مکانوں کی بند کھڑکیوں سے لگ کر آنسو بہانے اور پچھتانے والوں میں سے ہیں۔ ہم اپنے ہی دلوں پہ چڑھا ہوا زنگ اور اپنے ہی خزانے پر بیٹھا ہوا سانپ اور اپنے

سونے کو راکھ کرنے والے کیمیا گر ہیں۔ ہم نے سیکڑوں ماؤں کے دودھ بیچے ہیں۔ ہزاروں بھائیوں کا مردہ گوشت کھایا ہے اور لاکھوں بہنوں کے گریبان پھاڑے ہیں۔

تحقیق کہ ہم اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے ہیں۔ اور ہم اپنی ہی آگ میں بھسم ہوں گے۔ اور اپنے ہی زہر سے ہلاک ہوں گے اور اپنی ہی گلیوں میں قتل ہوں گے۔ ہمارے سینے میں پیوست ہونے والا تیر ہماری ہی کمان سے نکلے گا اور ہمارے سر پر ہماری ہی تلوار چمکے گی۔ اور ہمارے پاؤں پر ہمارا ہی کلہاڑا گرے گا۔ ہمیں محبت اور عقیدت کی نگاہ سے نہیں، حقارت، عبرت اور عبرت کی آنکھ سے دیکھو — — !

فصل۔ شام کی لڑکی کنگھی چوٹی کے بعد کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی ہے اور اپنے عاشق کا انتظار کرنے لگی ہے۔ اس نے ایک ٹانگ کھڑکی کے ڈنڈے پر رکھ دی ہے اور اس کا سرخ ازار بند نیچے لٹکنے لگا ہے۔ آٹھ عاشق آمنے سامنے دو کانوں کے تھڑے پر بیٹھے دوسرے عاشق گلی کی نکڑ پر کھمبے کے نیچے جمع ہو گئے ہیں اور عشق بازی شروع ہو گئی ہے۔ ایک عاشق کی ٹانگ کھڑکی کے ڈنڈے پر ہے اور دوسرا بجلی کے کھمبے تلے کھڑا ہے۔ پہلے عشق کا ازار بند لٹک رہا ہے اور دوسرے عشق کی زبان لٹک رہی ہے۔ اور تیسرا عشق اپنی دوکان میں باپ کے پاس بیٹھا بہتی یا لالک کا حساب لکھ رہا ہے۔ اس گلی میں عشق کرنے کا یہی بہاؤ ہے۔ یہاں ہر عشق کی ٹانگ کھڑکی کے ڈنڈے پر ہوتی ہے۔ اور اس کا ازار بند لٹک رہا ہوتا ہے اور جس کا ازار بند نہیں نکلتا اس کی لاش کو ٹھری میں لٹکتی ملتی ہے۔

سورج کسی کفن چور کی طرح اس گلی میں سے بے جان ہیولیٰ روشنی لے گیا ہے اور اس گلی کا ایک دن خودکشی کے بعد دم توڑنے لگا ہے۔ دم توڑ چکا ہے۔ اب شام کا دھواں دیے دینے بجھتے بجھتے مکانوں کے روشن دانوں سے نکل کر گلی میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اور شام کے پھیری والوں اور فقیروں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ گول گپیوں اور سوہن حلوے والے۔ پوڑیوں اور پکوڑوں والے۔ ردی کاغذ اور خالی بوتلوں والے۔ مچھلی اور سبزی بیچنے والے کنستروں کو ڈھکنے اور تالوں کو کنجیاں لگانے والے اور آنتڑیاں نکالے کر اس کا نفع خیرات دلوانے والے ان کے سب ہنگم شور میں خاموشی کا کاگ پھک سے

اڑ گیا ہے اور وہ منہ زور بھینس کی طرح رسی تڑا کر گلی میں ادھم مچانے لگی ہے۔ یہی وہ گھڑیاں ہوتی ہیں جب میں سوچنے لگتا ہوں کہ یہ گنجان اور گندی گلی اصل میں شور کا ایک بپھرا ہوا دریا ہے۔ اور میں ایک بے گناہ قیدی ہوں جو عبور دریائے شور کی سزا بھگت رہا ہے۔ لیکن اب میں اس شور و غل کا عادی ہو چلا ہوں۔ بلکہ اب آپ کو اس چیخ و پکار کا ایک حصہ۔ اس چمڑا کاٹنے والی مشین کا ایک پرزہ سمجھنے لگا ہوں۔ اب میں منہ اندھیرے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہوں اور ہمہ تن گوش ہو کر دھوبی گھاٹ والوں کے بیہت ناک نعرے سنتا ہوں۔ جب تایا راجکماری کا بھوت حکیم صاحب کے لڑکے کا گلا دبانے لگتا ہے تو میں اس کے ڈکرانے کی آوازیں بڑے خشوع و خضوع سے سنتا ہوں۔ اور سن سن کر روتا ہوں اور جب پھیری والا بزاز اپنا ڈمرو بجاتا ہے تو میں وجد میں آ کر جھومنے لگتا ہوں۔ ایک ایسا ہی ڈمرو میں نے بھی خرید کر رکھ لیا ہے۔ جب کبھی کوئی افسانہ لکھنے کا خیال آتا ہے تو میں اسے نکال کر بجانے لگتا ہوں جس وقت رات گہری ہو جاتی ہے تو میں کیکر کی چھال والی چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر کھلی کھڑکی میں سے باہر گھٹے گھٹے میلے آسمان پر رات کا داغ دیکھا کرتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے رات کا خون پھٹ گیا ہے اور یہ تارے برص کے چٹاخ بن کر اس کے بدن پر جا بجا پھوٹ نکلے ہیں۔ یہ آتش زدہ فاحشہ گلی کی جلد کا سی چارپائی پر پڑی ندامت اور نحوست کے پہلو بدلتی رہتی ہے۔

اب چاروں طرف پُراسرار گندہ اور گناہ آلود اندھیرا پھیل گیا ہے۔ اور رات کی طوائفیں ایک ایک کر کے اپنے لیمپ بجھانے اور کھڑکیاں بند کرنے لگی ہیں۔ یہ وہ گھڑی ہے جب شہر سے باہر بیری والے آنگن میں گیندے کا ننھی بھول اپنی پنکھڑیاں سمیٹے سو رہا ہو گا۔ اور امرود اور ناشپاتی کے باغوں میں اوس کی پریاں اپنے بالوں کو جھٹک جھٹک کر موتی لٹا رہی ہوں گی۔ اور پھر وہاں سورج سرخ، روشن اور دمکتا ہوا سورج طلوع ہو گا اور بڑ کے گنجان درختوں میں چڑیاں صبح کے گیت گائیں گی۔ اور یہاں کیچ بھری آنکھوں والے منہ بسورتے بچے کرتے اٹھائے گھروں سے نکلیں گے۔ اور گلی میں نالیوں پر آ کر بیٹھ جائیں گے جس طرح اس گلی میں سورج کبھی نہیں آیا۔ اسی طرح یہاں رات بھی کبھی نہیں آتی۔ رات کا سایہ آتا ہے۔ رات کی سیہ فام ناگن یہاں اپنی کینچلی چھوڑ کر شہر سے دور گھنے باغوں میں گل مہر اور گیندے کے پھولوں میں جا کر چھپ جاتی ہے۔ اور یہاں دھواں بھری شام اپنی آنکھوں

پیر جھکے ہوئے پیچوں کے بوڑھے ہاتھ رکھے سلگتے روشن دانوں میں سے نیم تاریک دھندلی گلیوں کو تکتی رہتی ہے — تکتی رہتی ہے — !

یہ گلی بھی ایک ناگن ہے جس کے اندھیرے نے مجھے ڈسا لیا ہے اور جس کا مہلک زہر آہستہ آہستہ میری رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے۔ میں اس زہر کا علاج اس سیاہ فام — سرخ آنکھوں والی ناگن کے زہر سے کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے بالوں میں پھول مسکرا رہا ہے اور آنکھوں میں سرمہ لگا ہے اور جو گلی مہرا در رنگین رسے کے پھولوں میں لپٹی ہوئی ہے۔

کسی رات جب گرم ہوا چل رہی ہوگی اور خشک پتے اڑ رہے ہوں گے میں دبے پاؤں اس ناگن کے کنج میں جاؤں گا اور چپکے سے اس کی گدگداتی ہوئی دو شاخہ زبان پر اپنا گال رکھ دوں گا۔

جمیل الزماں

بینا

وہ ابھی ریستوران میں آ کے بیٹھی ہی تھی کہ بیرا لپکتا ہوا میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوا
آہستہ آہستہ اس کے پاس آیا اور کنارہ ہال کے ایک کونے میں ستون کے ساتھ آخری میز کے پیچھے
اور والی طرف پردے سے لگ کر بولا۔ "حکم سرکار!"

"پیپسی ٹھنڈا لے آئیے۔"

بس ۔۔۔ پیپسی پینے سے پہلے وہ کنارے پردے پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی اور سنہری بال
... کاؤنٹر کے پاس پنکھے کو تکنے لگے
بینا نے ... آنکھوں پر ہاتھ رکھے سوچا۔ اس قدر تیز دھوپ میں دس کے اڑھائی بجے پر تھ
اور پھر کس سے ملنے چلی آئی ہے یہاں؟ اور پھر ایک جگ میں پانی اور برف کی ٹھنڈی ڈلیاں ڈال کر دوسرے
ہاتھ میں گلاس تھامے جیسے ہی چند منٹ بعد میز پر دونوں چیزیں رکھ کر وہ ہال کے دروازے پر دہلیز
کے قریب یا کھڑا ہوا تاکہ اس لڑکی سے ملاقاتی کا استقبال کر سکے

ریستوران میں اس وقت بالعموم کوئی گاہک موجود نہ ہوتا اور وہ اطمینان سے کاؤنٹر کلرک کی
کرسی پر ٹیک لگائے اونگھتا رہتا لیکن آج اس لڑکی نے کسی سے خوش گپیوں کا یہ انوکھا وقت
نکال کر اس کے معمول میں خلل اندازی کی تھی۔ نہ جانے کیوں اس نے ملاقات کے لئے اس سنسان
ریستوران کا انتخاب کیا تھا جو شارعِ عام سے ایک طرف ہٹ کر پرسکون سڑک پر واقع تھا اور
جہاں مختلف دفتروں کے ایک بجے بند ہونے کے ایک آدھ گھنٹہ بعد مکمل سکوت مسلط ہو جاتا۔
دس پندرہ منٹ تو بینا خالی الذہن دروازے اور کھڑکیوں کے باہر یونہی ادھر ادھر تاک

چند گز پرے چوک کے ساتھ والی سڑک پر اکا دکا تانگے گزر رہے تھے۔ ہر ایک تانگے کو آتا دیکھ کر اسے گمان ہوتا کہ شاید اسی میں وہ ملاقاتی بیٹھا ہو جس سے یہ لڑکی ملنے آئی تھی۔ لیکن وقت یونہی گزرتا جا رہا تھا اور کوئی تانگہ کسی رنگین مزاج سواری کو بٹھائے ریستوران کی طرف مڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ پنکھے کی بجلی کب تک ٹھنڈے پانی پر ضائع ہوتی رہے گی۔ اسے اپنے کنجوس مالک کا یوں ہی خیال آگیا جو اسے تنخواہ بالاقساط ادا کرتا تھا۔ دوپہر کی بخشش میں کاؤنٹر کلرک کو حصہ نہ دینا پڑتا تھا۔ لیکن لڑکی کے برقعے کا کپڑا سستی پاپلین قسم کا تھا اور اسے اس کے ہاتھوں کسی بخشش کی توقع بھی نہ تھی۔ چنانچہ تنگ آکر یٰسین دبے پاؤں ہال کے کونے کی طرف چل دیا اور پردے کے قریب کھانس کر آگے بڑھتا ہوا بولا "کسی اور چیز کی ضرورت ہے آپ کو؟"

سہمی ہوئی لڑکی نے اپنے کالے نقاب کا داہنا پلو بائیں کاندھے پر پھینکا۔ حسرت بھری آنکھیں پانی کے خالی گلاس سے اٹھائیں اور بولی "اور کیا مل جائے گا اس وقت؟"

"لیمن، سوڈا، روز، چائے جو آپ چاہیں۔"

"لیمن سستی ہوگی یا چائے؟" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

یٰسین یہ فقرہ سن کر چوکنا ہو گیا اور اس کی رہی سہی نیند کافور ہو گئی۔ آج تک کسی گاہک نے اپنے منہ سے یہ بات یوں بے ٹوک نہ کہی تھی۔ اس نے لڑکی کے میز پر جھکے ہوئے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے اترے ہوئے چہرے پر پاؤڈر سرخی کا نام ونشان نہ تھا۔ اس کی کلائیوں کی نیلی رگیں ہاتھوں پر ابھر رہی تھیں۔ اس کے ناخن سرخی سے ناآشنا تھے۔ اس نے جگ اٹھا کر پانی کا گلاس از سر نو بھرا اور پوچھا۔ "اخبار آتا ہے کوئی یہاں؟"

"مالک صبح انگریزی کا اخبار منگاتا ہے۔"

"وہی لے آیئے آپ۔" عام بابوؤں سے لیمن سوڈے یا چائے کی بجائے اخبار کا آرڈر لے کر یٰسین دل میں عموماً کڑھتا لیکن اس لڑکی کے طور اطوار دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا اور وہ اپنے پاس سے لیمن کی ایک بوتل اور گلاس لے کر انگریزی اخبار سمیت ہال کے آخری ستون کی طرف بڑھنے لگا تو ریستوران کے دروازے پر ایک تیس برس کا کھاتا پیتا شخص نمودار ہوا۔

یٰسین کے چلتے قدم رُک گئے۔ نو وارد نے اپنی پتلون کی جیب سے سفید رومال نکال کر پسینہ پونچھتے ہوئے ہال کے گرد طائرانہ نگاہ ڈالی اور یٰسین کے قریب پہنچ کر قدرے تامل سے پوچھا۔

"اس پردے کے پیچھے جگہ خالی ہے؟"

"جناب کو کسی سے ملنا تھا یہاں؟" یٰسین نے اخبار کھینچتے ہوئے سوال کیا۔

اتنے میں ہال کے بائیں کونے میں کرسی سرکنے کی آواز آئی۔ یٰسین نے نووارد کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ دونوں کو لڑکی کی معصوم صورت پردے سے جھانکتی نظر آئی۔ نووارد اپنی بڑھی ہوئی توند پر پتلون درست کرتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ یٰسین نے اخبار اور لیمن کی بوتل قریبی میز پر رکھ دی اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

چند لمحے بعد یٰسین آہستہ آہستہ آخری ستون کی جانب بڑھا اور پردے کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔ نووارد لڑکی سے دیر میں آنے کے لئے معذرت خواہ تھا اور لڑکی کہہ رہی تھی "کوئی بات نہیں آپ سیڈیکل سٹور میں اس قدر مصروف رہتے ہیں۔ کھانے کے بعد نیند تو آنا ہی تھی۔"

یٰسین پردے ہٹا کر آگے بڑھا اور نووارد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا

"آپ کیا پئیں گی؟" نووارد نے لڑکی سے پوچھا۔

"جو بھی یہ لے آئیں مجھے قبول ہے۔" وہ کھسیانی ہو کر بولی۔

"میں تو اس وقت چائے پیوں گا" نووارد نے یٰسین سے کہا۔

"کچھ کھانے کے لئے بھی لے آؤں حضور؟" یٰسین نے حسب عادت گاہک کی استطاعت کا اندازہ لگانے کے لئے کہا اور نووارد کی "ہاں جو چاہو لے آؤ" سن کر ریستوران کے باورچی خانے کی طرف ڈگ بھرنے لگا۔

یٰسین نووارد اور لڑکی کی گفتگو سننے کا خواہاں تھا چنانچہ اس نے جلدی جلدی پیالی میں چائے ابالی، دودھ کو آنچ دی، شکردانی میں چینی ڈالی، کیک پیسٹری کے چند ٹکڑے ایک پلیٹ میں ڈالے اور ٹرے ہاتھ میں لئے پردے کے پاس پہنچا تو اسے نووارد کی آواز سنائی دی "میں وعدہ تو نہیں کر سکتا البتہ کوشش ضرور کروں گا۔"

"آپ چاہیں تو اسے ایک دن میں ملازمت دلوا سکتے ہیں" بلتجی ہو کر لڑکی بولی۔
"ہاں مگر آپ کے بھائی ...." نووارد کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن قدموں کی آہٹ سُن کر خاموش ہو گیا۔ یٰسین پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا تو نووارد سگریٹ کے کش لے رہا تھا، یٰسین نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس کے پاس میز پر ٹرے رکھی۔ جگ اور گلاس کو ایک طرف ہٹایا اور دونوں گاہکوں کے سامنے چائے کی پیالیاں اور پلیٹ وغیرہ سلیقے سے سجا کر ٹرے میں جگ اور گلاس دھرے اور واپس چل دیا۔

ٹرے واپس لے جاتے وقت یٰسین نے سوچا بیکاری کتنی بڑی مصیبت ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے اُن بیکار نوجوانوں کے چہرے گھومنے لگے جو پچھلے دو تین روز سے سامنے والے ایک نئے دفتر میں کلرکوں کی خالی آسامیوں کے متلاشی تھے اور اس کے ریستوران میں اکا دکا ایک پیالی چائے پینے یا ایک سگریٹ خریدنے چلے آتے تھے۔ بنیادی طور پر اس کے ایک مہربان گاہک نے کھلا رکھا جسے دن کا کھانا یٰسین کھلانے جاتا اور اسے یقین تھا کہ اگر وہ کسی ایک لڑکے کی سفارش کر دے تو مالک اس کا کہا نہیں ٹالے گا لیکن کسی لڑکے سے اس کی اتنی واقفیت نہ تھی کہ وہ اس شدید ضرورت میں اس کے کام آتا۔ اس کے پاس تو فقط وہ لڑکے آتے جو ریستوران میں بیراگیری کی ملازمت حاصل کرنے کی سعئی لاحاصل کر رہے تھے۔

اسے خود بیراگیری کے لئے جو جو پاپڑ بیلنا پڑے تھے وہ ابھی تک اُس کے ذہن پر منقش تھے۔ پڑوس میں عبدل بیرے کی بیوی سے یٰسین کی ماں کا پرانا جھگڑا چلا آتا تھا لیکن جب یٰسین سن بلوغ کو پہنچا تو اس کی ماں نے عبدل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی لڑاکا بیوی کے طعن و تشنیع کے باوجود یکدم چپ سادھ لی اور پھر دھیرے دھیرے عبدل کو اس بات پر راضی کر لیا کہ جب کبھی اس کے ہوٹل میں عید، بقرعید یا رام لیلا کے موقع پر ہجوم ہو تو وہ یٰسین کو بیراگیری کا کام دلوا دیا کرے۔ عبدل کی بیوی نے یٰسین اور اس کی ماں سے کئی چکر لگوائے تھے تب کہیں جا کر یٰسین کو بیراگیری کا مستقل کام ملا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن اسے اپنا روزگار

برقرار رکھنے اور بیکاری سے بچنے کے لئے کس طرح کولھو کے بیل کی طرح کئی ہوٹلوں اور ریستورانوں میں متواتر صبح شام کام کرنا پڑا تھا۔

باورچی خانے میں تسلی سے خالی ٹرے رکھ کر نسیم کاؤنٹر کلرک کی کرسی پر آ براجمان ہوا تو اسے خیال آیا کہ اسے کاؤنٹر کلرک سے بخشیش کی آمدن میں حصہ دینے سے پس و پیش نہیں کرنا چاہیئے کہیں وہ مالک سے کہہ کر کسی بہانے اسے فارغ خطی نہ دلوا دے۔ اب اگر وہ بیکار ہوگیا تو کیا کریگا۔

اب نہ تو عبدل زندہ ہے نہ اس کی ماں ——— اور پھر پردے کی طرف اس کی نظر گئی تو دفعتہً اس کے دماغ میں ایک گھناؤنا خیال کوندا۔ نہیں نہیں اس کی ماں تو ایسی عورت نہ تھی۔ اگرچہ عبدل کی رنگ رلیوں کے متعلق اسے کوئی غلط فہمی نہ تھی اور پھر وہ اپنی مونچھوں سے کھیلتا اسی چکر میں پڑا رہا کہ کہیں اسے ملازمت دلوانے کے لئے اس کی ماں کو تو عبدل کبھی کسی ہوٹل میں نہیں لے گیا تھا؟ اسے یقین تھا کہ یہ ناممکن بات تھی لیکن پھر بھی پردے کی موجودگی میں اس کے ذہن کا بوجھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھاگ کر پردہ پھاڑ ڈالے اور نووارد اور لڑکی سے کہے کہ یہاں سے دفع ہوجاؤ۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو شام کو مالک اسے جوتے مار کر ریستوران سے باہر نکال دے گا اور وہ سڑکوں پر بے کار اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر میں مارا مارا پھرے گا۔

نسیم اسی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا کہ ہال کے کونے میں نووارد کی آواز گونجی "بیرا ———!"

"آیا حضور" اس نے حسب عادت جوابی نعرہ لگا دیا لیکن حضور کا لفظ اس کے حلق سے ایسے نکلا جیسے اس نے گاہک کو ایک مغلظ گالی لڑھکائی ہو۔ اس نے پاؤں میں چپلی پھنسائی اور بیڈ مسل غبن کی جانب دبے پاؤں چل دیا۔ ستون سے دو تین قدم ادھر وہ خاموشی سے مٹھیاں بھینچکر کھڑا ہوگیا اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ لڑکی گڑگڑا کر نووارد سے کہہ رہی تھی "مجھے اپنی مجبوریوں کی داستان سناتے شرم آتی ہے لیکن کیا کروں میرا اور کوئی سہارا نہیں۔"

"میں بھی معذور ہوں" نووارد نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"میں آپ کی خدمت کے ناقابل ہوں، مجھے کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔"

"آپ کا بخار اُتر جائے تو پھر کسی شام مفصل بات چیت ہوگی"۔
نوادرد کی یہ بات یٰسین کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہوگئی۔ اس کی غیرت نے جوش مارا، وہ ایک دم آگے بڑھا اور عمداً بلند آواز سے کھانس کر بولا "کیا حکم ہے؟"
"بل لے آؤ"۔

"بل تو اس وقت نہیں بنے گا۔ باوجی ہوٹل میں نہیں ہیں"۔ یٰسین نے میز پر کیک اور پیسٹری کے ٹکڑوں کو اپنی سُرخ آنکھوں سے گنتے ہوئے کہا "ایک روپیہ آٹھ آنے ہوئے"۔

نووارد نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میز پر روپے روپے کے دو نوٹ دھر دیئے اور اُٹھتے ہوئے بولا "باقی پیسے تم رکھ لو"۔

"مجھے ان کی ضرورت نہیں"۔ یٰسین نے اپنی پاکٹ سے آٹھ آنے نکال کر نووارد کے ہاتھ میں پکڑا کے اور اس کے بازو کو جھٹکا دے کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے ورنہ تمھارا سر توڑ دوں گا"۔

نووارد اس غیر متوقع ردّعمل سے بھونچکا رہ گیا اس کے دل میں آئی کہ اس ٹکے کے بیرے کا دماغ درست کر دے لیکن اس کے جی کے چور نے اسے سمجھایا کہ یہاں سے خاموشی سے کھسک جانے میں ہی بھلائی ہے۔ اُس نے مبہوت لڑکی کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اپنی نامرادی سے سراسیمہ تھی۔ وہ اپنا نقاب درست کرتی کرسی سے اُٹھتے اُٹھتے لڑکھڑائی تو یٰسین بولا:

"تم ٹھہرو بہنا میں تمھارے بھائی کی کچھ مدد کر سکتا ہوں"۔

بقیہ "باپ"

تعاقب کیا، شفق گوں اُبلتے پانی کی گھر گھر کرتی چکیوں کے بلوریں پاٹوں پر چھپا کا بلند ہوا قرمزی پانی کا ایک چھینٹا اڑا اور باپ کی تصویر کے خاکے میں شوخ ترین رنگ بھر گیا....
اور مادھو کے ہاتھ میں بڈھے کے بوسیدہ لباس میں سے بچا ہوا ایک چیتھڑا باپ بیٹے کی کشمکش کی یادگار ہوا میں لہراتا رہ گیا۔

جیلانی بانو

چوری کا مال

پہلے تو لوگ دبے لفظوں میں کہتے رہے مگر پڑوسیوں کا راز دل میں لئے بیٹھے رہو تو گناہ کا احساس بے چین رکھتا ہے۔

یوں بھی نئے پڑوسی آئیں تو اُن کے ساتھ نئے موضوع ضرور آتے ہیں۔ ان کی سات پشتوں کے بخیئے اُدھیڑنے اور چال چلن کی تحقیق کرنے میں عورتوں کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام ہو جاتا ہے۔ بچے منٹ منٹ کی خبریں لاتے ہیں۔

"سایا کی ماں مارکیٹ سے سستے ناریل خرید کر لائی ہے۔"

"سایا چھت پر کپڑے سکھا رہی ہے۔"

"سایا ایک چاندی کا شمع دان ترسم کے ہاں بیچ رہی ہے۔"

نئے پڑوسیوں کی ہر ہر جنبش میں سینکڑوں اسرار پنہاں ہوتے ہیں۔ ان کی ہر بات میں مطلب نکالا جا سکتا ہے اور ہر حرکت سے محلے کے امن کو ٹھیس پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔

مگر سایا اور اس کی ماں تو ایسا الجھا دھاگا بن کر رہ گئی تھیں کہ ان کا سرا ہی نہ ملتا تھا۔

یوں تو انھوں نے محلے والوں کی ہمدردی بٹورنے کے لئے کہہ دیا تھا کہ سایا کا باپ اچانک مر گیا ہے اور وہ دونوں ماں بیٹیاں کل اثاثہ لے کر شہر میں کوئی کام ڈھونڈنے آئی ہیں مگر اس بات پر کسی کا یقین کرنے کو جی نہ چاہا۔ اس طرح دو تنہا عورتوں کی جینے کے لئے جدوجہد کرنا ایسی چھوٹی سی غلطی تو نہیں ہے کہ معاف کر دی جائے!

محلے کے مردوں نے سنا کہ ان کے سروں پر کسی مرد کا سایا نہیں ہے تو یک لخت انھیں سایا

سے شدید ہمدردی ہوگئی، جس کی وجہ سے محلے کی عورتیں اور بھی چوکنی ہوگئیں۔

میں نے اکثر ساتا کو کھڑکی میں کھڑا دیکھا وہ کنگھا ہاتھ میں لئے اپنے لمبے بال سلجھایا کرتی تھی۔ کئی بار اس نے مجھے سلام کر کے بات کرنا بھی چاہی مگر ایسے وقت ہمیشہ مجھے اپنے اُجڑے کھیت کی طرح ذرا سے بال یاد آ گئے اور میں کبھی اس سے بات نہ کر سکی یوں بھی اس کے زردی مائل سفید رنگ میں کوئی کشش تھی نہ بڑی بڑی ویران آنکھیں کچھ کہتی تھیں۔ دن بھر وہ ایک ٹوٹے ہوئے بے سُرے ہارمونیم پر سرگم الاپے جاتی۔ یا پھر انگریزی کی کوئی موٹی سی ناول — ڈکشنری کی مدد سے پڑھا کرتی تھی۔ یہ صبر آزما کام کرتے دیکھ کر مجھے اس سے اور بھی نفرت ہوگئی تھی۔ خصوصاً میرے کالج جاتے وقت تو اس کی گھنی پلکیں میرے جسم میں چبھ کے رہ جاتی تھیں۔

یوں محلے میں بھی ان ماں بیٹی کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ نئے پڑوسیوں سے محبت کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ لیکن نفرت بھی صرف تین وجہوں سے کی جاتی ہے۔ ان کی دولت دیکھ کر یا آوارگی سے ——— یا بچوں کی نالائقی اور عورتوں کی حسین صورتوں سے ———

مگر ساتا اور اس کی ماں کے پاس ان میں سے کچھ نہ تھا۔ ماں دن بھر پاپڑ بنا کے مارکیٹ کی دوکان میں بیچ آتی تھی۔ اس سے بھی پیٹ نہ بھرتا تو ساتا کسی پڑوسی کے ہاں انگوٹھی بیچنے لاتی۔ کسی کے ہاں کپڑے گروی رکھ دیتی تھی۔

بڑی چھان پھٹک کے بعد محلے والیوں نے یہ زور کی کوڑی تلاش کی کہ ان کے پاس یہ سب چوری کا مال ہے۔ اس خبر نے بہت سے بے قرار دلوں کو قرار دے دیا مگر کئی لوگ جو کسی بڑے انکشاف کے منتظر تھے، بجھ سے گئے۔ انھوں نے اس بات سے بالکل اتفاق نہ کیا یعنی اگر بات اتنی سی ہے تو بات ختم سمجھو ——— مگر کرتے بھی کیا ——— کتوں کی طرح نئے پڑوسیوں پر بھونک بھونک کر چُپ ہونا ہی پڑتا ہے۔

خیر اس دن سے یہ بات طے ہوگئی کہ اب ساتا کی کوئی چیز نہ خریدی جائے بلکہ اماں کا تو خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور ان کے ہاں پولیس کی دوڑ آئے گی اور سب محلے والے چوری کا مال خریدنے کے الزام میں دھر لئے جائیں گے۔

[redacted]

دو پہر میں کام دھندے سے نپٹ کر آس پاس کی عورتیں ہمارے ہاں اکٹھی ہوتی تھیں تو باتیں کرنے کے لئے ساآیا اور اس کی ماں سے زیادہ دلچسپ موضوع کوئی نہ ملتا۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے، بہت سے پھول کھلیں تو فضا مہک جاتی ہے۔ بہت سے تارے چمکیں تو آسمان جگمگا اٹھتا ہے مگر بہت سی عورتیں اکٹھی ہوں تو فضا میں صرف نفرت کی بارود سلگتی ہے۔

کڑوی نگاہوں کے احتساب اور سرگوشیاں اور مردوں کی آدم بھگت نے ساآیا کو سہما دیا تھا۔ چاندی نوری کو بیوہ سے ڈھانپے در در گھروں جاتی جیسے بھیک مانگ رہی ہو۔ محلے کے بچے اس کے پیچھے یوں شور مچاتے گھومتے جیسے سپیرا جا رہا ہو۔۔ عورتیں دروازے میں کھڑی ہو جاتیں اور راستے آتے دیکھ کر کواڑ بند کرتے ہوئے کہتی تھیں۔

"چاندی کے برتن تو تمہارے گھر میں سجتے ہیں۔ ہم کہاں سے خریدیں گے؟"

پھر اس کی ماں چیزیں لے کر بازاروں میں گھومنے لگی۔ اس طرح ان دونوں کا گھروں میں آنا جانا بھی ہوگیا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ دن آ گئے کہ ساآیا چاندی کے برتنوں اور زیوروں کی بجائے پرانی ساریاں اور ہوا ہار موتیم سنے پھرتی۔ کئی کئی دن ہو جاتے اور اس کی ماں ترکاری لانے بازار بھی نہ جاتی ۔۔۔ جو لات کھا کے گالی دے اس کے منہ پر تھپڑ اور لات مارنا ضروری ہے لیکن جو ایک ہی زمین پر گر جائے اسے مجبوراً اٹھانا پڑتا ہے۔ ساآیا کے ٹھنڈے چولھے اور گرم آہوں نے بھی سب کا جی پگھلا دیا۔ کوئی یہ سچ مچ تھوڑی چاہتے تھے کہ ایک دن ماں بیٹی کی لاشیں گھر میں پڑی سڑ ہوں اور اس کا عذاب محلے والوں کی گردن پر آئے ۔۔۔!

سب کی اہمیت کا لوہا ماننے کے بعد ساآیا پھر لوگوں کے گھروں میں چیزیں لے کر پہنچنے لگی۔ مگر لوگوں کا اصل مقصد تو ساآیا کی مدد کرنا تھا۔ چاہے دس کی چیز ایک روپے میں خریدیں۔ مگر یہ روپیہ نہ بال بچوں کی جان کا صدقہ سمجھ کر دینا پڑتا تھا۔

ایک دن جب دروازے میں کھڑی کالج کے لئے رکشا بلا رہی تھی تو ساآیا نے مجھے کھڑکی میں سے اور میرے پاس چلی آئی۔ آج اس کی سوکھی آنکھوں میں جھرنے پھوٹ رہے تھے اور وہ چاروں طرف

یوں دیکھ رہی تھی جیسے کسی طرف اڑنا چاہتی ہو۔ اس کے ہاتھ میں سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا تاج محل تھا۔ دھوپ میں ننھے سے تاج کا لمبا سایا اس کے پیروں میں اُلجھ رہا تھا اور وہ یوں کانپ رہی تھی جیسے دسمبر کی سردی میں ٹھنڈے پانی سے نہا کر آئی ہو۔

اس نے بڑی خوف زدہ نظروں سے مسز ریا بیتا کو دیکھا جو باسکٹ لئے مارکٹ جا رہی تھیں اور ان کے جانے کے بعد وہ تاج میرے ہاتھ میں دے دیا جیسے اُس نے مجھے وہ محض دیکھنے کے لئے دیا تھا۔ مجھے اماں کی نصیحت یاد آئی لیکن انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔

" یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا ـــــ !" میں نے احتیاطاً پوچھ لیا۔

اُس نے پہلے کچھ زمین پر ڈھونڈا۔ پھر اپنے ہاتھ دیکھے اور پھر اپنی دیوانی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر بچھا دیں۔

" تاج تو اکثر لڑکیوں کے پاس کہیں سے آجاتا ہے میرے پاس بھی کہیں سے آیا تھا۔ مگر یقین جانئے یہ چوری کا مال نہیں ہے۔ تاج کوئی کیسے چرا سکتا ہے ـــــ !

میں نے آج سچ مچ پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایسی بُری تو نہیں تھی۔ اس کے لئے ایک تاج محل بنایا جا سکتا ہے۔

" لیکن آپ اس تاج کو کیوں بیچ رہی ہیں ؟

" کیوں کیا یہ بکنے کی چیز نہیں ہے ـــــ ؟" اس نے تاج اپنے ہاتھوں میں لے کر یوں صاف کیا جیسے ماں اپنے اکلوتے بچے کے بال سنوار رہی ہو ـــــ " اب یہ کھلونا ہے۔ آپ نے شاید دیکھا نہیں، کھلونوں کی دوکانوں پر ان کی قطا[ریں] رکھی [ہو]تی ہیں اور یہ پانچ پانچ روپے میں بک جاتے ہیں "

محلے کی لڑکیوں کے ایک غول کو قریب آتے دیکھ کر وہ گھبرائی جا رہی تھی۔ اس لئے میں نے دو روپے اس کے ہاتھ پر رکھے اور تاج کو اس ٹافی کے ڈبے میں رکھ لیا جس میں کھانا لے کر کالج جاتی تھی۔ سایا کی اتنی فراخ دلی سے مدد کر کے میں دن بھر مطمئن رہی جیسے وہ دو روپے مفت میں اسے دیئے ہوں۔ پھر جب کبھی کوئی سایا کی مصیبتوں کا ذکر کرتا تو مجھے وہ دو روپے

ذرا دیکھو وہ ننھا سا تاج یاد آتا جو
[illegible] آپ نے، مجھے جو میں نے [illegible] کے طور پر دیے تھے
[illegible] تھا [illegible] کی پشت پر سیاہی سے کچھ لکھا تھا جو مٹ سا گیا تھا اگرچہ [illegible] سکی۔ روشنائی کا
[illegible] ہوئے آنسوؤں کی سمجھ ہو گئی تھی۔ جیسے دیکھو [illegible] یہ عیب چھپ جاتا تھا۔
[illegible] میں ہمیشہ بلا کر پڑھتے تھیں تھی تو تاج کا سایہ کمرے کی دیواروں پر یوں پڑتا تھا جیسے وہ
[illegible] عمارت ہو، جسے اسے پیار کرتے تھے اور پھر [illegible] عجب [illegible] تحفہ تھا کسی کے ہاتھوں
[illegible] بڑے بڑے پہاڑوں کو تراش کر اترا ہو۔ پھولوں کی پتیوں نے ہیروں کے جگر کاٹے
[illegible] جیسے ان کی [illegible] پر [illegible] کوئی بچھڑا ہوا سا جہاں

[illegible] آنسوؤں سے [illegible]

[illegible] میرے پاس [illegible]

[illegible] آنے سے پہلے [illegible] اپنے آپ کو سنوارا ہو کاجل [illegible] نیلی ساری [illegible]
[illegible] اڑتے ہوئے بکھرے بال، کوئی چہرا [illegible] دل گھبرائی ہوئی تھی جیسے
کوئی [illegible] اسے اندر دھکیل گیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جو اس سے
کسی طرح نہیں سنبھل رہا تھا۔ [illegible] آنے کے بعد وہ [illegible] انگلیاں کھینچتی رہی۔ جب
دیکھتی رہی جیسے بات کرنے کی جرأت ہی کھو چکی ہو۔

مگر [illegible] مجھے بغیر ہی [illegible] سمجھ گئی تھی۔ اس بنڈل میں کوئی فضول سی چیز ہوگی جو مجھے بہرحال
خریدنا ہے [illegible] اگر [illegible] کوئی اندر آ گیا تو پھر سایا بھی [illegible] نہ بچ سکے گی۔ ممکن ہے اماں
[illegible] کہ [illegible] لوٹنے کے لئے صرف ہم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ اس سے بہتر تھا کہ
ایک آدھ روپیہ دے کر جان چھڑائی جائے۔

"کچھ تو ایک روپے سے آپ کا کام چل جائے گا؟"

"مجھے آپ کا روپیہ نہیں چاہئے" اس کی آواز میں ندامت تھی اور آنکھوں کے ویرانوں میں
اتنے ریگستان جیسے پڑے تھے کہ میں اندر جانے کی ہمت ہی نہ کر سکی۔

"اچھا تو اس بنڈل میں کیا ہے؟" میں جلدی سے اس جھگڑے کو نبٹانا چاہتی تھی۔

"جی ـــــ" گویا ساری مشکل گرہیں کھل گئیں۔ بنڈل کھول کر اس نے ایک اُردو کی چھپی ہوئی پرانی ناول "اور انسان مرگیا" نکالی۔ ایک پین اور ایک بنارسی ساری۔

"آپ اسے چوری کا مال نہ سمجھئے۔ یہ سب میری چیزیں ہیں۔"

میں نے بے دلی سے کتاب اٹھائی۔ پرانی چیزیں چھوتے ہیں مجھے بڑی کراہت ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی بڑے اشتیاق کے ساتھ دیکھنا پڑی۔ کتاب کی جلد غائب تھی۔ پہلے صفحے پر لکھا تھا "اپنی سایا کے لئے ـــــ اسلم!" کتاب رکھ کر میں نے ساری اٹھانا چاہی تو اس کا ایک کونہ پھسل کے نیچے گر پڑا۔

"ذرا سنبھال کر دیکھئے۔" میرے ہاتھوں کی بے رحمی پر اس سے صبر نہ ہو سکا وہ سرخ زری کی ساری تھی۔ جس کا رنگ رکھے رکھے اُڑ چکا تھا۔ ایسی ساریاں عموماً ہندو دلہنیں پہنتی ہیں۔

"یہ آپ کی ساری ہے ـــــ؟"

"ہاں! مگر میں نے کبھی پہنی نہیں۔" اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

اچھا تو اسے آپ اپنے بیاہ کے دن پہنیں گی ـــــ!" وہ شرمانے کے لئے جھکی اور جلدی سے اپنے ماتھے کا جھومر مٹا دیا اب اس کے چہرے پر اندھیرا اور بڑھ گیا

"لیکن مجھے تو یہ ساری بیچنا ہے ـــــ"

گویا ان میں سے ہر ایک چیز بہرحال خریدنا تھی۔ میں نے مایوسی کے ساتھ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ آجکل میرے پاس اتنے روپے نہ تھے کہ سایا کی مدد کی جائے لیکن انکار بھی کس طرح کروں!

"کیا بات ہے۔ آج آپ بہت پریشان ہیں۔" وہ میرے قریب سرک آئی۔

"ہاں کچھ پریشانی تو ہے۔ کل سے کالج بھی نہیں گئی۔" میں سوچنے لگی، پریشانی کی وجہ کیا ہونی چاہئے۔

"کالج جانا کیوں چھوڑ دیا آپ نے؟" اس نے ساری اٹھا کر دوسری طرف رکھ دی۔

"[illegible] آپ کو [illegible] دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے میں بھی آپ کی طرح [illegible]"

[illegible] انتظار کرنے کے بعد اس نے زبردستی میرا سر اُوپر اُٹھایا۔

"[illegible] نہیں [illegible] سکیں اس بار ——— ؟"

[illegible] نگاہوں سے اسے دیکھا، یہ کتنی اہم بات ہو سکتی ہے [illegible]

[illegible] بہنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے ریگستانوں پہ بادل امڈ رہے تھے پھر اُس نے [illegible] میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"[illegible] مت [illegible] میں کوئی فکر کروں گی"

[illegible] ہو گئی اتنی جلدی نجات ملنے کی قطعی اُمید نہ تھی۔ بڑے [illegible] انداز میں اس کی چیزیں میں نے اسے پکڑا دیں اور وہ مجھے تسلیاں دیتی ہوئی چلی گئی۔

[illegible] کے بعد وہ ایک دن پھر میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں سہم کر رہ گئی۔ غور سے [illegible] ہاتھ میں ایک [illegible] تھا۔ اس میں کیا چیز ہو گی ——— !

[illegible] منہ پہ بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ منہ پر سرخی کی ایک رمق باقی نہ تھی۔ [illegible]

"[illegible] پریشان ہیں ———" اس نے اپنے ٹھنڈے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑ [illegible] کیونکہ اس میں وہ [illegible] والی تھی اور اس نے واقعی میرے [illegible]

"[illegible] کی نہیں ہے ———"

[illegible] جیسے اس [illegible] روپیہ سایا نے لوٹا کے میرے منہ پر مار دیا ہو۔ [illegible] نفرت کا [illegible] ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا [illegible]

"کیا وہ ساری آپ نے بیچ دی ——— ؟"

"ہاں ——— اس کی قیمت تو بہت کم آئی" کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنا سر گھٹنے پر رکھ دیا۔

"میں نے اپنا خون بیچ دیا ———"

"ایں ———" میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی جیسے قریب ہی زور دار دھماکا گونجا ہو۔

کئی منٹ کے بعد جب میرا کھولتا ہوا دماغ قابو میں آرہا تھا تو وہ مدھم سی آواز میں کہے جا رہی تھی ....

"ہسپتال والے بڑی خوشی سے خون خرید لیتے ہیں پھر انہیں یہ شبہ کبھی نہیں ہوتا کہ یہ چوری کا مال نہیں ———"

رام لال

چِتا

آخر ایک دن اس کی عورت مر گئی۔ دس سال کے طویل اور کڑے انتظار کے بعد اس کی عورت اس عرصہ بیمار تو نہیں رہی تھی۔ بیمار تو وہ صرف دس بارہ دن ہی رہی تھی۔ کچھ بخار آیا، کچھ قے آئی پھر پیٹ خراب ہو گیا۔ دو دن تک وہ دوا بھی لایا۔ پھر وہ ایک دن اچانک مر گئی۔ کچھ کہے بغیر اس کی طرف اس نے آخری بار دیکھا بھی نہیں۔ بالکل ایسے مری جیسے وہ چاہتا تھا لیکن اس کی اس خواہش کو پورا ہوتے ہوئے دس سال بیت گئے تھے۔

وہ شمشان بھومی میں بیوی کی جلتی ہوئی چتا کے سامنے ایک دیوار کے ساتھ کمر لگا کر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کی ارتھی کو یہاں تک پہنچانے کے لئے محلے کے تین اور آدمیوں نے ساتھ دیا تھا۔ وہ لوگ ارتھی پہنچانے کے بعد نہا دھو کر واپس چلے گئے تھے۔ وہ اسے کہہ گئے تھے کہ جب تک لاش پوری طرح جل نہ جائے وہ وہاں موجود رہے۔ جانے ابھی اسے وہاں کتنی دیر اور بیٹھنا ہوگا۔ آگ کے شعلے بہت اونچے اٹھ رہے تھے۔ سرخ لپکتے ہوئے شعلوں کے درمیان کبھی کبھی اسے بیوی کا جسم دکھائی دے جاتا تھا۔ آگ کی گرمی سے اس کے جسم کے ذرے ذرے میں سے چربی نکل نکل کر جل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی جلتی ہوئی لکڑی ٹوٹ کر چتا سے نیچے گر پڑتی تھی اور بہت سی چنگاریاں اِدھر اُدھر بکھر جاتی تھیں۔ اس کی نظر بیوی کی کھوپڑی پر جمی ہوئی تھی جو شعلوں کے درمیان بالکل واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ سر کے بال، ناک، کان، ہونٹ، آنکھیں اور اوپر کا سارا مانس جل چکا تھا۔

یہ اس کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہونے پر اسے چھوڑ دیا تھا۔ دوسری

بیوی سے بھی اس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اپنا اپنا بھاگیہ ہے۔ کسی کے اختیار میں تھوڑی ہوتا ہے۔ لیکن اسے اولاد نہ ہونے کا اتنا زیادہ غم نہیں تھا، جس قدر بیوی کے بدچلن ہو جانے کا۔ جانے اس عورت کا سوبھاؤ کیوں بگڑ گیا تھا۔ روپئے پیسے کی اسے کبھی کمی نہیں ہوئی۔ اس کی اپنی صحت بھی اچھی تھی۔ اس کا بیوی کے ساتھ سلوک بھی حد درجہ اچھا رہا تھا۔ پھر اگر اولاد نہیں بھی ہوتی تھی تو ہوا کیا؟ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہوئی لیکن اُن کی بیویاں مرتے دم تک پاکباز اور نیک چلن رہیں۔ اس کی بیوی کو آخر کس چیز کی ضرورت تھی۔

جب سے اس کے کانوں میں ایسی ویسی باتیں پہنچنے لگیں تب سے اس کے لئے زندگی جیسے حرام ہو گئی۔ شہر میں اس کی بڑی عزت تھی، بڑا رسوخ تھا۔ کافی جائداد کا مالک تھا۔ روپئے پیسے سے تو انسان کے لاکھوں عیب چھپ جاتے ہیں لیکن نہ جانے بھگوان کو کیا منظور تھا کہ اس کی عورت کی وجہ سے اس کا نام ہر جگہ لیا جانے لگا۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ وہ کچھ ایسی ہی ندامت محسوس کرتا تھا۔ عورت مرد کا سب سے بڑا غرور ہوتی ہے ہر چیز بڑا دھن، دولت، جاہ و حشمت اور زندگی سے بڑا اس کو بات کا احساس پہلی مرتبہ بیوی کے بدچلن ہو جانے کے بعد ہوا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ بیوی کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی، پیار سے بھی اور مار سے بھی۔ اس کی دھمکیوں کے سامنے کچھ عرصے تک تو وہ بھیگی بلی بنی رہی لیکن بعد میں بپھری ہوئی شیرنی جیسی ہو گئی۔ پھر کبھی اس سے نہ ڈری۔ بھگوان کا خوف بھی نہ کیا۔

اس کے ماں باپ زندہ نہیں تھے۔ دُور کے ایک ماما تھے جو اس کی شادی کر دینے کے بعد قسم کے قرض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ پھر جب عورت کی آنکھوں کا پانی ہی بدل جائے تو کوئی مرد کیا، اور اس کے رشتہ دار کیا اس کا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس غم نے ایک بہت بڑے خاندان کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ اس کے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کے رشتے ناتوں پر بُرا اثر پڑا۔ اچھے، اونچے یا برابر کی ٹکر کے گھرانوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی شخصیت جو موٹی شخصیت کے خاتمے نے کاروبار تباہ کیا۔ اسے اپنے نوکروں کے سامنے آتے ہوئے بھی ندامت محسوس ہوتی تھی۔ منیم اور قلی لوگ آپس میں عجیب عجیب اشارے کیا کرتے۔ وہ سوچتا

بہت جو زر ہوتیں۔ آخر وہ کیا کرے؟ وہ عورت کو گھر سے نکال دے۔ گھر سے نکال دینے کے
بعد وہ بازار میں بیٹھ گئی تب وہ کچہری میں نالش کر کے جھوٹ چھٹکارا کرا لے، لیکن مقدمہ بازی میں ۱
بڑا [illegible] ہوتی [illegible] دولت جل جائے گی۔ سے روپے کا بار ڈالے۔ کسی دوسرے کو لالچ دے کر یہ کام
[illegible] وہ [illegible] کر سکے۔ [illegible] بات یہ دعا مانگنے لگا، کسی طرح یہ اپنے آپ مر جائے
[illegible] سے پہلے اس کی ایسی ماں بیٹے کی اولاد دیکھنے کی حسرت لئے ہوئے خاندان کی
[illegible] گھٹ گھٹ کر مر گئی۔ بہنوں اور بھائیوں کے رشتے بہت معمولی گھرانوں میں ہوئے۔
[illegible] لوگ کٹ سکے [illegible] کوئی نہیں دینے کے لئے بھگوان کی عبادت شروع
کی [illegible] لگا۔ لیکن وہاں بھی لوگوں کو اپنے متعلق کوئی نہ کوئی اشارہ یا کانا پھوسی
[illegible] مردہ مرد ہو کر ہی رہ سکتا ہے ورنہ اس کے لئے وہاں جگہ نہیں ہے۔
[illegible] تباہ ہو ہی چکا تھا۔ جو کچھ بچا تھا اسے بیچ باچ کر بیوی کو ساتھ لیا اور اپنے آبائی شہر
کو خیرباد کہہ کر ایک دوسرے شہر میں جا بسا۔ خود میں کوئی کاروبار کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی
[illegible] سیٹھ کے پاس منیم ہو گیا۔ بیوی کی بدچلنی نے اسے وہاں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ
کسی ایک یار کی ہو رہتی تب بھی کسی حد تک چپ ہو رہنے کی بات تھی۔ اُسے تو جیسے گھاٹ گھاٹ
کا پانی پینے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اکثر وہ اپنے خاوند کے حلقے کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتی تھی۔
جیسے وہ عورت نہیں تھی۔ کوئی چڑیل تھی کوئی بد روح تھی، بد دعا تھی! کبھی کبھی اُسے خیال
گزرتا ہونہ ہو، یہ پہلی بیوی کی ہی بد دعا ہو سکتی تھی جس نے تکلیف دہ لمحے میں ٹھنڈی سانس
لے کر کوئی بہت بُرا شبد منہ سے نکالا ہوگا۔ یہ بھی اپنا اپنا بھاگیہ ہے۔ وہ یہ سب جانتا تھوڑی
تھا! شکل و صورت سے وہ حد درجہ قابل رحم نظر آتا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو جھک گئی
تھی۔ اب کسی کو اپنی طرف دیکھتے ہی مسکرا دیتا تھا۔ ایک بے بس، یتیم اور کچلی ہوئی مسکراہٹ۔
دس سال بعد آخر اس کا سنکٹ کٹ گیا۔ لیکن جیسے کوئی بیماری یا کوئی مقدمہ گھر کی ساری
پونجی اور عزت و آرام سمیٹ کر لے جائے۔ اسی طرح اس عورت نے بھی اسے ہر طرح سے لوٹا
تھا۔ عزت، دھن، صحت سب کچھ۔ وہ چتا میں سے اٹھتے ہوئے اونچے اونچے شعلوں کو

گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ شعلوں کی آغوش میں ایک عورت کا وجود بھسم ہو چکا تھا۔ ایک داغ مٹ چکا تھا۔ ایک بدؤعا پوری ہو گئی تھی لیکن کون جانے؟ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کی برادری کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ وہ کتنے برسوں سے شرم کے مارے کسی کے پاس نہیں گیا تھا۔ بہنوں اور بھائیوں نے کبھی اس کی سدھ نہیں لی تھی۔ اس کی بد چلن عورت جیسے سب کے نزدیک ایک چھوت چھات کی بیماری تھی۔ اگر تھی بھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ اس بات کو کوئی نہیں سوچتا تھا۔ اس نے ہر چیز کا سکھ عورت کے لئے مہیا کیا تھا۔ بھگوان کی لیلا۔ عورت ہی ایسی نکلی جس کے مرض کا کوئی علاج وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اب جب کہ وہ عورت مر گئی تھی، آگ میں جل رہی تھی، وہ سوچ رہا تھا۔ اگر اس نے اسی دن اس کا گلا دبا دیا ہوتا جس دن اس نے پہلی بار اس کی بد چلنی کی خبر سنی تھی تو آج وہ اس حالت میں نہ ہوتا۔ بھلے ہی وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہوتا یا اب تک جیل میں سزا بھگت رہا ہوتا لیکن اس نے پھر سوچا لوگ تو اسے سزا پا جانے کے باوجود معاف نہ کرتے۔ اس کے نام کے ساتھ اس کی عورت کا ذکر ضرور کرتے جیسے اب تک کرتے آئے تھے۔

چتا کے شعلے سرنگوں ہو چکے تھے۔ چتا لال لال انگاروں کا ایک ڈھیر بن گئی تھی۔ آس پاس کچھ اور بھی چتائیں تھیں۔ کچھ جلتی ہوئی کچھ آگ کا ڈھیر بنی ہوئی۔ وہ چاہتا تھا اب اٹھ کر چلا جائے۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد بھی کیا رہ گیا تھا۔ اس کا سارا اثاثہ تو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ تھکے ہوئے نڈھال جسم کو لے کر اب کہاں جاتا۔ اسے شمشان بھومی سے واپس لے جانے کے لئے کوئی ہمدرد، کوئی اپنا آدمی بھی تو نہیں تھا

اچانک اس نے چتا کی دوسری طرف ایک متحرک سایہ دیکھا۔ جیسے کوئی منہ پر دونوں ہاتھ رکھے زور زور سے رو رہا ہو۔ وہ حیرت سے اٹھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ کون تھا ایک آدمی چتا کے آس پاس گھومتا ہوا بالکل سامنے آ گیا۔ زمین پر بکھری ہوئی ادھ جلی لکڑیوں کو اٹھا اٹھا کر چتا میں پھینکنے لگا۔ شعلے پھر سر اٹھانے لگے۔ وہ سایہ کچھ دیر وہاں رہ کر پھر شام کے سرمئی دھندلکے میں باہر چلا گیا۔ وہ کون تھا؟ یہ جاننے کے لئے وہ اٹھ کر کھڑا

ہوگیا۔ اس کے ناتواں اور نڈھال شریر میں جیسے پھر سے نئی جان آگئی ہو۔ وہ چتا میں پڑے ہوئے مُردہ انگاروں کے ڈھیر کو بھول کر اس آدمی کی تلاش میں شمشان سے باہر نکل آیا۔

باہر ایک کنواں تھا۔ دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ اینٹوں اور سیمنٹ سے بنا ہوا ایک چوڑا چبوترہ تھا۔ آس پاس گھنے اور سایہ دار کئی درخت تھے۔ ایک سادھو نہا دھو کر پاٹھ کرنے کے لئے چبوترے پر چڑھ رہا تھا۔ ایک آدمی کمرے کے گرد ایک انگوچھا باندھے اور باقی کپڑے ایک طرف رکھ کے کنوئیں میں سے ڈول بھر رہا تھا۔ غالباً یہ وہی آدمی تھا۔ وہاں اور کوئی آدمی نہیں تھا۔

وہ بھی جا کر کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور اسے نہاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب وہ نہا چکا تو اس نے اس سے پوچھا۔ "کیا آپ بھی نہائیں گے؟ بیٹھئے میں آپ کے اوپر پانی ڈال دوں۔ یہاں کوئی لوٹا تو ہے نہیں۔ یہی ایک ٹوٹا ہوا ڈول ہی ہے، پانی بہت جلدی بہہ جاتا ہے"

یہ سن کر اس نے کپڑے اتار ڈالے اور کمرے کے گرد ایک دھوتی لپیٹ کر ٹھنڈے گیلے فرش پر بیٹھ گیا جب اس آدمی نے اس کے اوپر ایک ڈول بھر کر ڈالا تو اس نے بدن کو ہاتھوں سے اچھی طرح ملتے ہوئے پوچھا۔ "آپ یہاں کیسے آئے؟"

اس آدمی نے کنوئیں کے اندر آہستہ آہستہ ڈول لٹکاتے ہوئے جواب دیا "میں اس کے مرنے کی خبر سن کر چلا آیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اس کی موت آج سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ بہت پہلے!"

"کس کی موت؟" اس نے اور بھی حیران ہو کر پوچھا۔

پانی سے بھرا ہوا ڈول اس نے منڈیر کے اوپر رکھ دیا اور کنوئیں کی تاریک گہرائی میں جھانک کر بولا۔ "ایک عورت کی جو مجھ سے پیار کرتی تھی۔ میری بن کر رہنا چاہتی تھی لیکن ایک ساہوکار نے اس کے ماموں کو سات سو روپئے نقد دے کر خرید لیا تھا اور اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ جو شخص ہم دونوں کے خواب لوٹ کر لے جا رہا ہے۔ اس کا میں سب کچھ لوٹ لوں گی۔ ایک تنکا تک باقی نہیں چھوڑوں گی۔"

"کیا پیچ؟ یہ پانی میرے بدن پر چھوڑ دو۔ مجھے بہت گرمی محسوس ہو رہی ہے — جا، سنے کیوں؟"

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے ہمیشہ باز رکھا۔ ہر موقع پر سمجھایا لیکن اس نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا۔ "تمھیں اس سے کیا؟ تمھارے لئے تو میں مرچکی۔ میرا بستر یہ ایک چتا میں جلنے سے پہلے پورے گھر کو ایک چتا بنا دے گا۔"

"پاگل، بے وقوف!! اور ڈالوں پانی؟"

"ہاں ہاں اور ڈالو ابھی۔ بہت ٹھنڈا ہے۔ لیکن اچھا لگ رہا ہے!"

ریاض منانوی

پتھر

سورج آہستہ آہستہ درختوں کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔
دھوپ ڈھلنے سے اگرچہ دن بھر کی حدت قدرے کم ہو چکی تھی لیکن گرمی کا زور پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا۔ دوپہر تک سڑکوں اور بازاروں سے غائب ہو جانے والی ...
سجاول نے ایک لمبی کالی چادر ... اور پچھلی گلی سے ... فضا میں آیا تو اس کی آنکھیں ... چہرے ... محسوس کر رہی ... اس نے ... آنکھیں ملیں ... پھر ... سڑک کے کنارے ... ہاتھ کے سامنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے جا لیٹا جہاں فضا قدرے خوشگوار تھی
لیٹے لیٹے چاروں طرف تجسس آمیز نظروں سے دیکھ کر بڑبڑایا۔ سجاول خاں آج تو نے جلدی کی خیر کوئی بات نہیں۔

سڑک ابھی تک سنسان تھی البتہ دھوپ کی پرچھائیں جھک گئی تھی۔ سجاول نے کندھے کی چادر کا گول مول تکیہ سا سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا ـــــ کافی دیر بعد خاموش سڑک پر کسی تانگے کی آواز سنائی دی تو اس نے یوں ہی اس سمت دیکھا کوچبان سر پر گلابی رنگ کی چادر باندھے پچھلی سیٹ پر بڑے آرام سے بیٹھا تھا سجاول نے مایوسی سے دوبارہ آنکھیں موند لیں اور کروٹ بدلنے لگا۔

سورج اب اونچی عمارتوں کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ اور فضاؤں کی روشنی میں میلا پن رچ گیا تھا۔ اجاڑ سڑک پر طرح طرح کے لوگ چلنے پھرنے لگے تھے اور اس کے قریب ہی ٹھنڈی گھاس پر چند آدمی بیٹھے

سگریٹ اور بیڑیاں پی رہے تھے ـــ باتوں کی آواز سن کر سجاول بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بیڑی سلگا کر آنے والے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے سڑک پر چلتے لوگوں کو غور سے دیکھا۔ فضا میں کچھ سونگھا۔ اور پھر بڑی ماہرانہ نظروں سے ہجوم کو اپنے ترازو پر تولنے اور جانچنے لگا۔ اس کی مردم شناس اور گہری نگاہوں نے ایک ایک چہرے کا مطالعہ کیا۔ ہر شخص کو سر سے پاؤں تک ٹٹولا۔ ایک لمحے میں تو اس کی آنکھیں کسی خاص امید سے چمک اٹھیں لیکن دوسرے ہی لمحے میں پانی کے حباب کی مانند ٹوٹ جاتیں۔ اس کی نظروں کا ترازو ایک دھچکے سے کبھی ایک طرف جھک جاتا کبھی دوسری طرف ـــــــ

سجاول کو تمام لوگ قابل نفرت دکھائی دینے لگتے۔ مکروہ چہروں والے، منحوس جسموں والے اور وہ سوچتا کہ ان سفید پوش لوگوں پر کیچڑ اچھال دے، جو اس کی طرف دیکھے بغیر ہنستے کھیلتے گزر رہے تھے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ بڑے سکون سے نئی بیڑی سلگائی اور لمبی لمبی گھاس پر پھیلتے ہوئے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"آج مت کیوں ماری گئی تیری یار!"

سجاول مدت سے یہاں آیا کرتا تھا۔ اسی طرح تنگ گلی سے سایہ کی طرح نمودار ہوتا گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کے سنہری آنکھیں جھپکاتا، کچھ دیر درختوں کے نرم اور ٹھنڈے سایے تلے بیٹھ کر بیڑیاں پیتا اور جب رات کے ملگجی فضاؤں میں تیرنے لگتے اور سٹریٹ لیمپوں کی بیمار روشنیاں جاگ اٹھتیں تو وہ بجلی کے کھمبے سے لگ کر ماحول میں کچھ سونگھتا اور پھر تاریکی میں روپوش ہو جاتا۔ لیکن آج وہ صبح ہی سے لمبے چوڑے خیالات ملے جلے خیالوں میں الجھا اپنے حالات کی موٹی ڈوریوں کا تانا بانا سلجھانے میں مصروف تھا۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ دور کہیں کھلی فضا میں بھاگ جائے جہاں سنہری مٹی گہرے سبز پتوں کے دامن میں ننھے ننھے سفید پھول کنواری خوشبو بکھیر رہے ہوں اور برگد کی لمبی شاخیں نیچی جھکی ہلکورے لے رہی ہوں اور لہلہاتے کھیتوں میں پیلی پیلی بسنت رت چھائی ہو۔ وہ کھیتوں کی پیچدار پگڈنڈیوں پر سینہ پھیلائے بازو لہراتا بھاگتا جائے اور جب تھک کر اپنا جسم ہری گھاس پر ڈال دے تو قدرت کے مہربان ہونٹ اسے چوم لیں۔ وہ پھر وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے پھیپھڑوں کی ساری قوت سے مرزا صاحبان کے بول خوبصورت فضا میں اچھال دے اور پھر جنگلی بیلوں سے ڈھکی کچی منڈیر پر ٹانگیں پسارے بسر کر

تھے لیکن یہ تو سلجھنے والی گتھیاں تھیں۔ اس لئے وہ فوراً چاہنے لگتا کہ گھر کی کھڑکی سے نیچے کود جائے۔ اور اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے۔ ایک بار تو سجاول کا ارادہ اتنا خطرناک ہو گیا تھا کہ وہ اس تصور سے کانپنے لگا نہ اگر جلدی ہی اس نے اس خوفناک خیال پر قابو پا لیا اور چپ چاپ گھر سے نکل آیا۔ آسمان پر کونجوں کی لمبی قطاریں اڑتی جا رہی تھیں۔ ان کبھی قطاروں کو دیکھ کر سجاول کے ذہن میں لاوا چڑھ سا گیا۔ وہ بیٹھے خواب کی طرح تیرتا چلا گیا۔ اس کی نظریں شہر کی دیواروں کو چیر کر اس جانب چلی گئیں جہاں سنہری ٹکیوں کے بہتے ہوئے دامن میں سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کے تصور میں کئی مبہم سے دھندلے نقوش ابھرنے لگے۔ اس نے دبا دبا کر یوں محسوس کیا جیسے اس کی آوارہ نظریں سبز پتے پتے کو چوموں کے ساتھ ہی جھتوں، ٹالیوں اور لہلہاتے کھیتوں میں بھٹک رہی ہوں۔ گاؤں کے تصور سے اس کی یادیں جاگ اٹھیں۔ اور آنکھیں دھیرے دھیرے مندنے لگیں۔

دور تک پھیلی ہوئی ریت تھی۔ ان کے درمیان ٹالیوں اور کیکروں کے سب جھرمٹ جھنڈ شمالاً جنوباً ریت کے کنارے کنارے پھیلتے چلے گئے تھے درختوں کے سائے میں دوپہر کی مرغابیاں زمینوں کی ہموار قطاریں کھڑی رہتیں۔ کچے راستے کے ساتھ بڑے بڑے جوہڑ تھے درختوں کی شاخیں پانی کی لہروں پر جھوما کرتی تھیں۔ برگد کے درختوں سے سجاول کو پرانے زمانے کے سوکھی جٹاؤں والے سادھو یاد آجاتے ان کے تنے بس میں یوں گڈمڈ ہو گئے تھے جیسے قدیم قلعوں کی بارہ دریوں کے محرابی دروازے جوہڑ سے ذرا ہٹ کر گیروی رنگ "آوا" پر منگی آگ اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں جن میں چھپ کر گاؤں کے نوجوان شبے دیسے کا جوا کھیلا کرتے۔ "آوا" اور راستے کے درمیان [illegible] قبرستان کا کام دیتا تھا دوپہر کو جوہڑ کے گندے پانی میں بچے نہاتے تھے بڑے بوڑھے [illegible] اور نوعمر لڑکیاں مونڈھے ٹخنوں سے رستہ بنا کے پینگ جھولتیں۔ بابا حیون شاہ کا تکیہ تو سر سبز درختوں کی گھنی چادر سے ڈھکا رہتا تھا۔ جامن اور سکھ چین کے درخت چار دیواری کے چاروں سمت پھیلے ہوئے تھے۔ قبر کی پائنتی اور سرہانے املی اور سوہڑی کے درخت جھولا کرتے تھے خانقاہ کے ہرے بھرے شوریدہ گئے محراب پر عشق پیچاں کی بیلیں سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ پچھواڑے اونچی اک پر بسنتی پھول کھلا کرتے تھے۔ قبر کے مٹے ہوئے تعویذ پر کڑوے تیل سے جلتے ہوئے دیئے کی سیاہ اور گیلی لکیر میں انگلی

وکر عورتیں اپنے بیمار اور نظر لگے بچوں کی پیشانیوں پر لگایا کرتیں ۔

کتنی ہی اجلی یادوں سے سجاول کے چہرے پر دنیا جہان کا غم سمٹ آیا۔ اور بھٹکے ہوئے خیال ان جانی راہوں پر گذرے زمانے کے نشان ڈھونڈنے لگے۔ جن گھڑیوں کو اس نے خونِ جگر دے کر اجالا تھا وہ گھٹتے گھٹتے معدوم ہو چکی تھی۔ ساری تصویریں ذہن کے پردے پر ناچتی، تھرکتی، ابھرتی، ڈوبتی، بلکتی، گم ہوتی جا رہی تھیں ۔

ایک بار سجاول نے آنکھیں کھولیں اور آسمان پر پھیلی ہوئی سیاہ دھوپ کی دھند تکنے لگا اور ہواؤں کی سرسراہٹ پاگلوں کی طرح سننے لگا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے بھی تو نہ جھپکیں۔ جیسے وہ ایک نقطے پر آکر مردہ ہو گئی ہوں۔ ایک مقام پر پتھر کی مانند ساکت و جامد ہو کر ٹھہر گئی ہوں ـــــ وہ یوں گھبرا کر اٹھ بیٹھا جیسے ان خوب صورت عکسوں کے درمیان کسی خوفناک بے ہنگم شے کا وجود آ گیا ہو۔ کچھ دیر تو سہم کر ایک ہی سمت گھورتا رہا اور پھر خشک تنکوں کو مسلتے ہوئے گنگنانے لگا۔

کچی ٹٹ گئی جنہاں دی یاری   قبراں تے رون بیٹھیاں

(جن کی یاری پختہ ہونے سے پہلے ہی رہ جائے وہ قبروں پر بیٹھ کر روتی ہیں)

جیون شاہ کے مزار کی اوٹ میں سجاول نے ریشماں کا جسم سرسراتے ہوئے دیکھا جو ترمائی ہوئی لاجونتی کی مانند سکڑ کر ایک طرف ہوئی تھی جس کے لمبے اور خشک بال قبر پر لگے تعویذ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنسو بھینچے ہوئے ہونٹوں میں ٹپ ٹپ گر کر جونک بنے ہوئے تھے ۔

"ریشماں" "ریشم بی بی" سجاول نے آہستہ سے پکارا۔ پہلی بار وہ ریشماں سے یوں مخاطب ہوا اور وہ کتنی دیر آک کے پیچھے دم سادھے چپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آنکھیں جھپکاتے رہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے رہے اور ناخنوں سے گیلی زمین کھرچتے رہے۔ سجاول کچھ کہنا چاہتا تو اس کے گلے میں آواز اٹک اٹک جاتی۔ ریشماں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی تو آواز گھٹ کر رہ جاتی۔ بس دلوں کے دھڑکنے کی آواز کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ دھک دھک۔ دھک دھک ـــــ سجاول کتنی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکا تھا۔

"تمہاری چنگیری گاٹے نے بکھیر دی ہے ریشم بی بی!" اپنے سوال پر وہ خود ہی جھینپ گیا تھا۔

اس حقیقت کو [illegible] کرنے کے لیے کسی عشقیہ کتاب کا فقرہ یاد کرنے لگا تھا تاکہ وہ ریشماں کو اپنی محبت کا یقین دلا سکے۔

ریشماں کی یاد سے سجاول کے ذہن میں ایک اور نام برستے پتھروں کی سی صورت میں اُبھرا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس پر پاگل پن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے خالی خلاؤں میں گھورنے لگا اور اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے پھیلنے لگے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ریشماں کی صورت نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے اور ایک نئی تصویر ابھر آئی ہے۔ یہ تصویر صدیق کی تھی۔ صدیق کے نام سے سجاول نے غصے میں [illegible] اور حلق صاف کر کے نفرت سے [illegible] پر یوں تھوکنے لگا جیسے وہ صدیق کے منہ پر تھوک رہا ہو۔ صدیق! صدیق! صدیق! یہ لفظ اس کے کانوں میں ڈنکے کی چوٹ [illegible] اس کے کان بجنے لگے۔ وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر دوبارہ بیٹھ گیا جیسے [illegible] دل پر لا کر [illegible] چاہتا ہو۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا [illegible] اس سے پہلے [illegible] اچھا [illegible] صدیق کے خیال کو ذہن سے [illegible] صدیق اور ریشماں کے نام آپس میں گڈمڈ ہوتے نظر آنے لگے۔ ان کے جسم ایک دوسرے میں مدغم ہونے لگے۔ اس کے سامنے دونوں نام باری باری ناچتے اور چھپ جاتے۔

سجاول کو یوں لگا جیسے ریشماں [illegible] آنکھوں میں آنسو ہیں اور بڑی حسرت سے اسے تک رہی ہے۔ سجاول کا جی چاہتا کہ وہ ریشماں کو صدیق کے ہاتھوں سے چھین لے اور صدیق کے سینے پر چڑھ کر زور زور سے مکے [illegible] لگائے۔ اپنے ہاتھوں میں اس کی گردن لے کر اتنے زور سے دبائے کہ صدیق کی آنکھیں باہر [illegible] غصے [illegible] میں جلا [illegible] تڑپنے لگا [illegible] یوں تو وہ کئی بار صدیق کے پیچھے [illegible] ہوا تھا اور کئی بار [illegible] جھگڑا بھی تھا۔ ایک بار سجاول اپنے دوستوں میں بیٹھا ریشماں کا ماہیا گا رہا تھا کہ صدیق غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا کہیں سے آ نکلا اور گالی دے کر کہنے لگا "ریشماں میری منگیتر ہے [illegible]" ابھی فقرہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ سجاول نے اسے بازوؤں پر اٹھایا ہوا میں اچھالا اور جوہڑ میں پھینک دیا۔ دوسری بار ان دونوں کا آمنا سامنا گاؤں کے ایک میلے پر ہوا تھا۔ جانے کیا بات ہوئی کہ صدیق نے سجاول کی کسی کمزوری پر آوازہ کسا کہ اس کی ہیٹی کرنی چاہی۔ ذرا سی دیر میں گالیوں کے ہجوم میں لاٹھیاں [illegible] ہو گئیں۔ سجاول کی چمکیلی لاٹھی ہوا میں لہرائی۔ سنسناتی ہوئی صدیق کے سر پر لگی۔

صدیق شدت ضرب سے اچھلا گرا اور زخمی پرندے کی مانند تڑپنے لگا۔ سجاول باقی کہانی کو سہارا دینے کے
سے تنے پر سر ٹیک کر بیڑی کو دوبارہ سلگانے لگا۔ اب کافی اندھیرا ہو گیا تھا سڑک پر چلتے ہوئے
آواز میں قہقہے اور باتیں تحلیل ہو رہی تھیں۔ راہگیروں کے ہاتھوں میں جلے ہوئے سگریٹ جگنوؤں
کی مانند چمک رہے تھے۔ سجاول نے اندھیرے میں ٹھنا چاہا مگر سمٹ کر رہ گیا۔ اس کی یادوں کے پردے پر
بیتی باتوں کے عکس جھلملانے لگے اور خیالوں کا لامتناہی سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا جو برسات کے بادلوں
کی مانند لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سجاول نے بیڑی کا کش لیا اور کڑوے کسیلے منہ کا ذائقہ بدلنے لگا۔ اپنے
ہونٹوں پر زبان پھیری اور کندھے ڈھیلے چھوڑ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا بھرا سا موٹا شدت جذبات سے
کانپنے لگا۔ بے خیالی میں اس کا ہاتھ داڑھی کا مدتے پر رینگنے لگا جہاں کلہاڑی کے منہ کا گہرا نشان موجود
تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک رات جب وہ کھیتوں سے لوٹ رہا تھا شہر کے پل پر صدیق اور اس کے ساتھیوں نے
سجاول کو گھیر لیا۔ سجاول اچانک حملے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ تابڑ توڑ برستے ہوئے
ہتھیاروں سے بگڑ چکا تھا اس کے بعد کیا ہوا سجاول کے ذہن نے سوچنے سے جواب دے دیا۔ ایک دھم سی یاد
اس کا ہاتھ پکڑ کر ہسپتال میں لے آئی جہاں وہ کافی دیر پڑا رہا تھا اور اس نے گاؤں جانے کا ارادہ ہمیشہ
کے لئے ترک کر دیا تھا۔

شہر، شہر! اور اس نے ایک موٹی سی گالی شہر کو، گندے رہنے والے تمام شہریوں پر دے ماری۔ رینگتی ہوئی
موٹروں کو، تانگوں اور سائیکلوں کو۔ شہر والوں کو شہروں کے خداؤں کو۔ اس بڑے شہر میں کتنے کھاتے پیتے
لوگ تھے لیکن اسے کسی نے بھی پناہ نہ دی۔ سجاول نے شہر میں گندے بھرے پیٹ دلوں کا اندازہ کیا تو اسے
یوں لگا کہ جیسے وہ کتے کی جون سے انسان بنا تھا۔ اس کی زندگی کتوں کی زندگی سے کسی طرح بھی بہتر
نہیں تھی۔

سجاول ایک دن بھوک سے تنگ آ کر شہر سے باہر کھیتوں میں چلا گیا تھا اور ہری ہری فصلوں سے
لپٹا یوں رونے لگا تھا جیسے ماں کی مہربان گود میسر آ گئی ہو جانے کس ظالم نے شہر آباد کئے تھے نہ روٹی
ملتی ہے نہ نوکری ملتی ہے۔ نوکری ڈھونڈو تو گالیاں کھاؤ۔ روٹی تلاش کرو تو جیل کی چاردیواری دیکھو
آخر ایک دن ادھر ادھر کی ٹھوکریں سجاول کو زندگی کے کوٹھے پر لے گئی تھیں۔ وہ بیچاری بھی پیٹ کے

گرداب میں پھنسی ہوئی تھا ہی تھی۔ اسے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس کا بوجھ اٹھا لیتا اور جس کا بوجھ وہ خود اٹھانے کی کوشش کرتی اور اس طرح دو گرتی ہوئی عمارتیں کچھ دیر تو کھڑی رہتیں۔ زیادہ دیر نہیں۔ [illegible] خود بخود ہی چلنے لگی۔ حالات کے زمانہ ساز ہاتھوں نے سجاول کو خود بخود اس [illegible] دیا تھا۔ دونوں میں کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ شرائط طے نہیں ہوئی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کا [illegible] تھا۔ بھوک نے بھوک کی [illegible] ہوئی آواز سن لی تھی۔ تجربے کو ہمیشہ بھوکا بچایا ہے۔ سجاول اب وہاں تھا۔ [illegible] سجاول [illegible] کو ڈھونگ [illegible] لفظ [illegible] دماغ پر [illegible] لیا ہو [illegible] تصویریں [illegible] ملوث کرنے لگیں [illegible] دیکھنے والے [illegible] مرجھا کر [illegible] اس نے [illegible] سجاول کا [illegible] سجاول سے [illegible] کے [illegible] پھر [illegible] بلبلوں کی طرح [illegible] سجاول [illegible] صورت جسم کو [illegible] کے کھیتوں [illegible] ہواؤں کے [illegible] قدم [illegible]۔

"سجاول! او سجاول خان"۔ وہ [illegible] خیال [illegible] بات تو سن لے میرے بھائی۔ نہیں سنتا جا جا، تیری مرضی۔ سجاول نے غصے سے منہ جھٹکا [illegible] ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سڑک سے اس طرف [illegible] پر اب عجیب چھایا رہا تھا۔ سجاول [illegible] سے چوک پر کھڑے لوگوں کو [illegible] تو [illegible] کی [illegible] میں [illegible] ہونٹوں پر [illegible] گالی [illegible] سے کسی [illegible] ہو گئی۔ لیکن [illegible] سجاول کی توجہ جیسے دو دوستوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ دو دن کبھی [illegible] گئے تھے اور [illegible] لوگ جانے کدھر کھپ گئے تھے۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرایا اور [illegible] دکھوں کا تجزیہ کرنے لگا۔

"سجاول خان!" پیچھے سے دبے پاؤں چلتی آواز آئی۔ سجاول نے قدم قدم چلتے ہوئے تانگے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ تانگے کا جھولتا ہوا سایہ آگے کی طرف سرک رہا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھمبے تلے آن کھڑا ہوا۔

"سجاول" تانگے میں سے کوئی پکارا۔ وہ جواب دینے کے بجائے ایک کر تانگے کی اگلی سیٹ پر جا بیٹھا

گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی صرف ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں اس کے پیٹ پر زندگی کی جگہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرگوشیاں ٹاپوں کی آوازیں گم ہو رہی تھیں۔ سجاول نے بیڑی سلگاتے ہوئے چور نظروں سے سواری کا جائزہ لیا۔ تو اسے اندھیرے میں سفید سفید نشان نظر آئے۔ جو سواری کے سینے پر پھول رہے تھے۔ اس نے تیز اور تجربہ کار آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ سجاول نے اسے پہچان لیا کہ کوئی فوجی ہے۔ گھر چھٹیاں گزارنے [illegible] کرنے جا رہا ہے۔

"بڑی موج ہے حوالدار جی!" سجاول نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے پہلا کنکر پھینکا سطح ساکن رہی۔

دو سگریٹ سلگا دوں جناب؟" فوجی نے کوئی جواب نہ دیا سجاول گھبرا کر تانگے دوسرے کا جو [illegible] بدے فوجی کی مستقبل خاموشی پر غور کرنے لگا۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکا کیا شوقین ہے سالا شرما رہا ہے۔ تانگہ کلی کے سامنے تانگہ رک گیا اور وہ دونوں [illegible] کے پیچھے جا گھسے گھر کی۔ دشمن [illegible] آنکھوں پر چربی سی چڑھ آئی اور وہ گھور گھور کر فوجی کو تکنے لگا سجاول کی آنکھوں میں [illegible] ستارے ٹوٹے [illegible] اور اس کے ذہن میں گرم گرم لاوا ابلنے لگا۔

"ہاں۔ [illegible] سجاول [illegible] آوازیں آنے لگیں جیسے بجنے بالی کی دھار [illegible] پر گر رہی ہو [illegible] اپنی آنکھیں میں ان کے مختلف زاویے بنانے اور [illegible] خود بخود گر رہے [illegible] ایک منظر [illegible] کا حل بن کر ابھرے ہوتے تو دو جار [illegible] ہوتے [illegible]

صدیق! [illegible]

صدیق حالات [illegible] سے [illegible] تھا۔

سجاول کا [illegible] کی جانب بڑھا اور پرانی رقابت اس کے ذہن میں زہر گھولنے لگی۔ کی ملائم دھار سے اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں مس ہوئیں تو وہ آنے والے حالات کے بارے میں سوچ پر نکل سا گیا۔

سجاول خان پہلے فیصلہ کر لے۔

"سانپ کو ڈس دے میرے یار۔"

سجاول نے ایک بار پھر صدیق کی طرف دیکھا تو اُسے صدیق کی آنکھوں میں ایک جانی پہچانی سی اداسی [illegible] تیرتی نظر آئی اور اُسے یوں لگا جیسے ریشماں اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھی دربار دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے [illegible] کے استقبال کے لئے اُس نے آنکھوں میں کاجل ڈالا ہے۔ [illegible] بال سنورے ہوئے ہیں [illegible] اور کتنے سال بعد ماہ کا سرخ جوڑا دوبارہ پہنا ہے اور اُس کی نظریں صدیق کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

سجاول [illegible] ریشماں نے سنورے [illegible] جن میں چولھے کی راکھ اندر [illegible] چھنکتی ہوئی سنہری چوڑیاں [illegible] تھیں۔ ـــــــ سجاول نے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے سامنے عمر ڈھلی زندگی [illegible] گزرے ہوئے دن [illegible] میں [illegible] کی تصویریں لئے آ گئے۔

"کیوں [illegible] آپ کیا ارادے ہیں؟"

[illegible] کچھ لینا ہوگا۔

پھر [illegible] سجاول کے [illegible] نے پوچھا۔

[illegible] نہیں کرو۔

"[illegible] سانپ کا کیا ہوگا؟" سجاول نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے چاقو کا دستہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ [illegible] ڈھیلا پڑ گیا اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی ساری رنگینی مٹ گئی آہستہ آہستہ [illegible]

"سانپ کو [illegible] سجاول [illegible]" اُس نے آہستہ سے جیب سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور صدیق کو اندر [illegible] کہنے لگا۔

"میں یہیں بیٹھا ہوں جو والد صاحب کسی چیز کی ضرورت پڑے تو آواز دے دینا۔"

وہ [illegible] ساکت و جامد بیٹھا یوں [illegible] تھا جیسے بے جان پتھر ہے

عوض سعید

خونِ صد ہزار انجم

میری یاد داشت
جانے کب سے میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی مجھے ٹھیک سا یاد نہیں ہے
بھی کمزور ہوگئی ہے دیسے بیماری کی شخصیت میں کوئی ایسی خاص بات بھی نہ تھی جس کے باعث میں اس کی
ملاقات کی تاریخ کو حافظے کے کسی خانہ میں محفوظ کرلیتا۔
یہی کیا کم تھا کہ وہ میرا دوست تھا، غیب غریب دوست جس کے ساتھ رہتے ہوئے
میں نے ہمیشہ ذہنی تکلیف محسوس کی اور وہ کمینہ میری ذات سے ہمیشہ چمٹا ہی رہا۔
بیسیوں بار میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا کہ اب مجھے اس سے قطعی نہیں ملنا چاہیے لیکن دوسرے
دن وہ میرے پاس آجاتا اور میں سب کچھ بھول بھال کر اس کے ساتھ ہو جاتا جیسے پچھلے دنوں
میں نے دل میں کوئی عہد ہی نہ کیا ہو۔
ایک بار میں نے تنہائی میں سوچا میرا اس کا کیا تعلق ہے، وہ ایک کوچہ گرد، آوارہ، لوفر،
بدوضع، مغلظات بکنے والا، اور میں ایک سیدھا سادا شریف سا آدمی۔
اور پھر سوچ کی دیوار دھڑام سے میری آنکھوں کے سامنے گر جاتی، جیسے روندتا کچلتا نکلتا ہوا
میں اس سے ملنے چلا جاتا۔
ایک دفعہ میں نے اس سے کہا بھی کہ تم یہ غنڈہ گردی چھوڑ دو، لوگ خواہ مخواہ تمہارے ساتھ
مجھے بھی آوارہ گرد سمجھنے لگے ہیں۔
اس پر وہ ہنس دیا۔ بالکل اس بے حیا بوکر کی طرح جس کو گالیاں دینے پر بھی شرم سے
... جھکتے

"بہاری نے آج تک کسی کو دوست بنایا ہی نہیں ہے، ایک تم ہو جسے میں دوست سمجھتا ہوں اور جب بہاری کسی کو ایک بار اپنا مان لیتا ہے تو عمر بھر اُسی کا ہو رہتا ہے۔"

جب بہاری نے مجھ پر اپنی دوستی کی دھونس جمائی تو میرا چہرہ کچھ اُترا سا گیا اور میں سوچنے لگا کہ بہاری سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ یہ تو جونک کی طرح سے چمٹ گیا ہے۔

بہاری نے دوستی کی دیوار نمک کی بنیادوں پر قائم نہیں کی تھی۔ دوستی کے اس اٹوٹ رشتے کو وہ زندگی بھر نبھانا چاہتا تھا۔

نفرت اور محبت کے اس امتزاج نے میری ذات میں ایک عجیب سی اُلجھن پیدا کر دی تھی۔

"مجھے بہاری سے شدید نفرت تھی اور ساتھ ساتھ بے پایاں محبت بھی" اس کی احمقانہ حرکات میں مجھے اس کے کردار کا سیدھا سادا پن اور خلوص ملتا جو میں نے اپنے عزیزوں کی ذات میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی جب اُسے کسی "خان" سے قرض کے بارے میں گالیاں سنتے اور جواب میں موٹی موٹی گالیاں بکتے ہوئے دیکھ پاتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے بہاری ایک بہت بڑا ہے جس کی سڑاند میں میں ڈوب سا گیا ہوں۔

اپنے بشرے سے بھی وہ بھلا آدمی نہیں لگتا تھا، گہرا گندمی رنگ، چوڑا چکلا سا چہرہ، عقابی ناک، سیاہ فولادی آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹ، دانتوں میں بڑی بڑی کھڑاہیں۔ یہ تو تھی اُس کے چہرے کی ہلکی سی جھلک، اور لباس سے تو وہ بالکل بمبئی کا موالی معلوم ہوتا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے پینٹ پر اُون کا موٹا سا کوٹ، گلے میں ٹائی کی جگہ سرخ رنگ کا رومال، جب وہ ہنستا تو یوں معلوم ہوتا جیسے کنکریٹ کا انجن چل رہا ہو۔ چرر۔ چرر۔

جب میں پہلی دفعہ حیدرآباد کی خوبصورت شاہراہوں پر اس کے ساتھ آزادانہ گھوما تو میرے بہت سے ساتھیوں نے حیرت سے میری زندگی کا مطالعہ شروع کیا۔

الطاف نے مجھے سمجھایا کہ کم از کم مجھ جیسے آدمی کو اس ناپسندیدہ اجنبی کے ساتھ اس طرح نہیں گھومنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں کا مشہور ڈاکو یا جرائم پیشہ ہو۔

بات بھی معقول تھی۔ میں نے ذہنی کے اس پودے کو خواہ مخواہ بڑھنے دیا۔ اُسکی آبیاری کی۔ اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔ وہ میرے ذہن پر بری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہیں اس نے مجھ پر جادو ٹونے تو نہیں کر دئے ہیں۔ ہوں! جادو بھی کوئی چیز ہے۔ فریب میرے دماغ میں عجیب مضحکہ خیز خیالات آ رہے تھے۔

میں گھبرایا ہوا جب لکی ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو میرا دوست اشرف ایک کونے میں بیٹھا سموسے کھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑا اطمینان سا ہوا لیکن میں نے یہاں کھانے کے وقت اس سے ملنا ٹھیک نہیں سمجھا۔ اس لئے میں قریب ہی کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے چائے کی پیالی دھری تھی۔ اور سموسوں کی پلیٹ خالی ہو چکی تھی۔ وہ سموسے کھانے کے بعد چائے پینے لگا۔

اس نے میری سمت سے بار بار بے تکلفی سے پیٹھ کر کے ایک دیوار سی کھڑی کر دی تھی جس سے اس کا چہرہ بڑی حد تک میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے سر اونچا کر کے اس کی طرف دیکھا اب وہ اخبار میں بری طرح کھویا ہوا تھا۔ میں نے بیرے کو آواز دی۔ جو گاہکوں کی کثرت کی وجہ سے گھبرایا گھبرایا سا آ کر ان کی تکمیل کر رہا تھا۔ دور کاؤنٹر پر سفید براق سا ایرانی اکڑا ہوا یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی ابھی ڈنڈ پیل کر آیا ہو۔ اس کے سر کے پیچھے دیوار پر ایک خوبصورت فریم میں ایران کے سابق شاہ کا فوٹو چمک رہا تھا جس پر چنبیلی کے پھولوں کا موٹا سا ہار لٹک رہا تھا۔ پھول جو سوکھ گئے تھے۔ اور پھولوں کی ان خشک پتیوں کی طرح ایران کی تاریخ مر رہی تھی۔ کچن میں پھٹی ہوئی بنیان پہنا ہوا ایرانی النسل بوڑھا کفگیر کو کھانے کے ڈسٹ سے گلگونے میں پھیرتا ہوا ذہن میں ایران کی نئی تاریخ مرتب کر رہا تھا۔

میں نے بوائے کو بلا کر کہا" وہ جو صاحب ہیں نا، جو کونے کی سیٹ پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں اُنھیں ذرا اس طرف بھیجنا۔"

بوائے نے قریب جا کر کہا" وہ بابو صاحب تمھیں بلاتا ہے۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ اُٹھا کر اشارے سے کچھ کہا۔ جس کا شاید مطلب تھا

کر میں ابھی آرہا ہوں۔

پانچ منٹ گذر گئے، اور وہ وہاں سے نہیں اُٹھا۔

پندرہ منٹ بھی گذر گئے، لیکن وہ یونہی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

مجھے کوفت ہونے لگی۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک سا گیا اور میں سیٹ سے یک لخت اُٹھ کر اُس کے پاس جا پہنچا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، میں تمھیں کب سے بُلا رہا ہوں تم ہو کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

"آتا بھی کیونکر، تم پہلے کی طرح ہو بھی تو نہیں کون اپنی بھلی سی عزت خراب کرے۔"

"کیا بک رہے ہو" میں نے غصہ سے کہا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں، جانتے ہو آج تمھارے دوست نے کیا کیا ہے۔ اس نے شراب کے نشہ میں اپنی بیوی کا سر پھاڑ دیا ہے اور وہ اب حراست میں ہے۔"

مجھے یہ سن کر بہاری سے بے حد نفرت ہوئی۔ اس کے تو کوئی بیوی نہیں تھی، ہاں میں نے سنا تھا کہ اُس کے ایک داشتہ سے تعلقات تھے، کبھی کبھار اُس کے یہاں جایا کرتا تھا۔

"اب بھی ہوش میں آؤ۔ چھوڑ دو اس لفنگے کی صحبت کہیں تم بھی ایک دن پولیس کی حراست میں نہ آجاؤ۔"

میں یک لخت سیٹ سے اُٹھ کر باہر آگیا۔ سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ سامنے پیلس ٹاکیز کا میٹنی شو ابھی ابھی ختم ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے عابد روڈ کے چوڑے چکلے سینے پر لوگوں کا ایک ہجوم سا پھیل گیا۔

خوبصورت اور بدصورت موٹریں۔ رکشائیں سیکلیں ایک سیلاب تھا، جو بہہ نکلا۔ میں پانچ منٹ کے لیے چھگن لال کے بک اسٹال پر جا کھڑا ہوا جہاں ایک چیک روکر "جین کھڑا" "بندھ" کا تازہ پرچہ بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ دو لڑکے کھڑے کھڑے نئے آئے ہوئے فلمی رسالوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ سامنے ہی۔ ایس راؤ ٹیلر ماسٹر کی دکان پر ایک شخص ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار آگے پیچھے مُڑمُڑ کر ہر زاویۂ نگاہ سے اپنے تازہ سلوائے ہوئے سوٹ کو

بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہی میرا ماسٹر کھڑا اشارے سے کچھ کہہ رہا تھا۔
جب ہوش آیا جیت گئے تو میں حیرانی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

جب میں نے گھر میں قدم رکھا تو وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ میری بیوی کے نرم و نازک جسم پر چھوٹے بڑے کئی آبلے ابھر آئے تھے اور سینے پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پیروں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس کی۔

"یہ کیا ہے" میں نے ضبط کرتے ہوئے زکیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں، ذرا آگ سے جھلس گئی ہوں" میری بیوی زکیہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مگر کیسے" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کے جانے کے دو گھنٹے بعد میں نے دوپہر کا کھانا بنانے کے لیے چولہے پہ ہانڈی چڑھائی تھی۔ ہوا کے کسی جھونکے سے ایک دبی سی چنگاری نے میرے آنچل کو جا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چنگاریاں شعلوں کی شکل میں میرے جسم سے لپٹ گئیں

"تمہارا دوست ہے نا بہاری خدا اسے اچھا رکھے پتہ نہیں اس وقت کہاں سے آدھمکا۔ میری چیخیں سن کر اندر گھس آیا۔ اور مجھے آگ سے بچا لیا۔ اس نے فوری میرے جسم پر پانی سے بھری ہوئی دو بالٹیاں پھینکیں اور ڈاکٹر کو بلا لایا۔ وہ شاید اس وقت تم سے ملنے آیا تھا۔" وہ بولی۔

مجھے اس وقت بہاری یوں لگا جیسے وہ غنڈہ نہیں تھا ایک فرشتہ تھا جو آسمان کی پہنائیوں کو چیرتا ہوا مجھ سے آملا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے ہی میں بجھ بجھ سا گیا۔ کاش آج یہ حادثہ رونما نہ ہوتا۔ جانے بہاری نے زکیہ کو کس حال میں دیکھا ہوگا۔ اس وقت اس کی کتنی جسم کی ننگی ہوئی ہوگی اور جانے.........

دو دن تک بہاری مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ میں سمجھ گیا ضرور اسے کچھ دن کی سزا ہوگئی ہے۔ کسی کا سر پھاڑ دینا بھی تو جرم ہی ہے۔ اگلے ہفتے اچانک ہی صبح وہ میرے پاس آدھمکا۔

"کوکب صاحب" اس کی پاٹ دار آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر گئی۔

میں باہر نکل آیا۔ وہ حسب معمول بے ڈھنگے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"ابے ہیلو جی کیا چھوکریوں کی طرح گھر میں بیٹھے ہو۔ آج کل لڑکیاں بھی تو گھر میں نہیں بیٹھتیں۔"

"نہیں بھارمی آج میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ مجھے کام ہے۔"

"ہاں جلو بھی۔" اس کے آہنی جیسے مضبوط ہاتھ میرے کندھوں پر آگئے۔ اور میں بغیر کچھ سوچے سمجھے چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا۔

راستے میں اس نے مجھ سے کہا۔ "اب بھابی کا مزاج کیسا ہے۔ اس روز آگ نے انھیں بہت پریشان کر دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ آبلے ہی سوکھ گئے ہیں زخم مندمل ہو رہا ہے۔" میں بولا۔

کرم جاری روڈ پار کرکے جب ہم ہیلیں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی رسٹورنٹ کے قریب آئے تو پیچھے کسی رسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے کسی نے اشرف تھانیدار کا سا موا دکھائی دیا۔ جیسے وہ مجھ سے کہہ رہا ہو "اب بھی ہوش میں آؤ۔ کہیں تم اس لفنگے کی صحبت میں تھانے کی سیڑھیاں نہ چڑھ جاؤ۔"

مجھے آج اس کے ساتھ چلتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ پرسوں کی تو بات تھی کہ وہ رات تھانے میں کاٹ چکا تھا۔ آج اس کا موڈ بہت زیادہ شگفتہ تھا۔ اس لئے وہ راستہ چلتے ہوئے سڑک سے گزرنے والی خوبصورت پارسی لڑکیوں پر جملے کستا جا رہا تھا۔ کبھی بھی نذرانداز میں قریب آکر بھیک مانگنے والے لونڈوں کی ہتھیلیوں میں جلتے سگریٹ کا چرکا دے کر ہنستا جا رہا تھا اور مڑ مڑ کر ایک موٹی گالی کے ساتھ انھیں پیسے بھی دیتا جا رہا تھا۔

"پولیس میں رات مار کھانے ہوئے بھی تم ٹھیک نہ بن سکے" میں بولا۔

وہ چلتے چلتے ایکدم رک گیا۔ "کس بھڑوے نے تم سے یہ کہا ہے" وہ جھٹ خفا ہو گیا۔

"میں نے سنا ہے"

اور تم نے یقین کر لیا"

"کیوں نہ کرتا۔ تم ہو ہی اس قابل"

"پولیس میں رات تو تم جیسے بابو گزاریں گے میں کیوں گزارنے لگا" وہ کہنے لگا۔

ہاں اس ہوٹل کے پیچھے امین نے ایک گھنٹہ کے لیے ناگہ پر مجھے بلایا تھا۔ میرا بیان لیا اور چھوڑ دیا۔ میاں بیوی کے معاملہ میں کوئی دخل کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ سالی ہے میری داشتہ اس سے جو کسی نے غلط کہہ دیا کہ میں تمہارے گھر جو آتا ہوں تو اس کے کچھ اور ہی اسباب ہیں۔ وہ کچھ اور ہی سمجھتی ہے میں نے جب آگ کھانے کا واقعہ اسے سنایا تو وہ بجائے میری تعریف کرنے کے محبت رنگ چٹ الجھ پڑی میں نے سالی کا ٹینٹوا ہی دبا دیا سر پہ گنگیر وے ماری لیکن اس معاملہ پر وہ سن متوفی نے پولیس میں رپورٹ کر دی یعنی تھپڑ سالی نے تو پولیس میں کمال ہی کر دیا [illegible] اس میں دوسروں کا دخل نہیں ہے [illegible] بات آئی گئی ہو گئی۔

وہ اسی طرح ساری باتیں کہہ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

چلتے چلتے ذرا آگے [illegible] ایک دکان پر رکا۔ جہاں ایک شخص مالک دکان سے ہنستے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ وہ مجھے دروازے کے تھوڑی دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اسے اپنے ساتھ لا کر مجھ سے متعارف کرایا۔ اس نے میری خوب خوب تعریف کی اور وہ خواہ مخواہ مجھے مرعوب کرتا رہا۔ ہم تینوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی ہوائے نے سر جھکا کر ہمارا آرڈر لیا اور تیزی سے کچن کی کھڑکی کے قریب چلا گیا۔ جہاں ایک شخص کھڑا کھڑا پلیٹوں کو پانی سے دھو رہا تھا۔ پہلے ہم نے مٹن چاپ، شوربہ اور چیزیں منگائیں۔ بہاری نے مرغ پلاؤ کی علاحدہ پلیٹ منگائی پھر انواع و اقسام کے میٹھے خوب سیر ہو کر کھائے۔ ہوائے نے ٹھنڈے پانی کا جگ سامنے رکھتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

”اور کچھ صاحب؟“

”کچھ نہیں، تین کپ کافی کے بعد بل لے آنا۔“

تھوڑی دیر بعد ہوائے ایک خوبصورت طشتری میں بل رکھ کر لایا۔

”بس۔“ بہاری نے یوں کہا۔ جیسے دس روپئے کا بل بھی کوئی بات ہے۔

”آؤ سگریٹ پلائیں۔“ کہہ کر وہ مجھے سیٹ سے اٹھاتا ہوا باہر لے آیا۔

اُس کے ساتھی نے کہا "ہاں سگریٹ ہونی چاہئے۔ لیکن یہ زحمت تم کیوں کرتے ہو۔ ہوا سے سے کیوں نہیں منگوا لیتے ؟"

"دیکھتے نہیں آگے کیا لکھا ہے"۔ بہاری نے کہا۔

اور وہ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے" کہتا ہوا چپ ہو گیا۔

جب بہاری اور میں کیبن سے باہر آئے تو وہ مجھ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں اس کی مسکراہٹ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اس نے پان فروش کے ہاں سے آدھی کیپسٹن کی ڈبیہ خریدی۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر خود سلگایا اور ایک مجھے دیتے ہوئے کہا "اب چلیں"۔

میں نے دیکھا کہ اس نے قدم بجائے "زنجبار کیفے" کی طرف بڑھنے کے بازو کی گلی میں مڑ گئے۔

جب کیفے پیچھے چلا گیا تو اس نے ہنس کر کہا "آج تو سالا مر گیا خوب اُلو بنا ہے"۔

میں نے جھنجھلا کر کہا "یہ کیا کمینگی ہے بیچارے کو خود ہی مدعو کیا اور تنہا اُسے سیٹھ کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے۔"

"ارے اس سالے کے ہاں پیسوں کی کیا کمی ہے۔ بڑا بخیل ہے۔ دانتوں کی میل کھاتا ہے۔ آج کئی دنوں سے مجھے اچھی غذا نہیں ملی آخر کب تک میں ٹین شیڈ کے ڈربوں میں بیٹھا روٹی کے روکھے سوکھے ٹکڑے توڑا کرتا۔ [illegible] جب سے میں حیدرآباد آیا ہوں۔ بھوکا ہی مر رہا ہوں۔ شراب پینے کو نہیں ملتی۔ نوکری نہیں ملتی۔ کھانا نہیں ملتا۔ عورت نہیں ملتی۔ اور کبھی بھولے بھٹکے سے عورت مل بھی جاتی ہے تو ایسی جیسے کسی بھکاری کا پھینکا ہوا ٹکڑا۔ آخر صدقہ۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ ایک سالی چھمیا کبھی ملی ہے تو [illegible]۔ سارا خون چوس لیا ہے ظالم نے۔ میں نے اچھی زندگی گذارنے کی کئی بار کوشش کی لیکن مجھے زندگی کے اس سایے میں ذرا سا بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا ہمیشہ ایک بے چینی سی رہی۔ میں برسوں سے تاریکی کے اس بھیانک غبارے میں بیٹھا ایک نامعلوم منزل کی طرف اڑا جا رہا ہوں جیسے یہ دنیا، دنیا نہیں غبارہ ہے جو رات کے گہرے سناٹوں میں چوری چھپے کسی کونے کھدرے میں سو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ دنیا چھمیا نہ بنے، بھابی بن جائے۔ جو تمہیں پیار سے اچھے اچھے کھانے کھلاتی ہے۔ میں کب

گرہستی کا لطف [illegible] اٹھاؤں گا۔ میں اب مستقل مزاج ہو سکوں گا۔ آخر اب تو بھائی آخر اب!
وہ جذبات میں ڈوب سا گیا۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ ہماری کتنی عجیب زندگی ہے۔ اس کے دل کے تاریک گوشے میں آج بھی ایک مجرم وائلن بجا رہا ہے۔ جس دن یہ دبا ہوا [illegible] ابھر آئے گا۔ اس دن [illegible] جائے گا۔ اس دلیل کے سہارے ہم ساری [illegible] ایک نامعلوم سمت کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔

وہ اکثر ملاقات رہتا۔ کبھی کبھی جب [illegible] میں [illegible] دوڑ دوڑ کر یوں ہی پیچھے [illegible] مجھ سے [illegible] ایک فلان [illegible] دے دی۔ [illegible]
وہ بیگم [illegible]

[illegible]

کو گالیاں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں [illegible]
تھوڑی دیر تک چپ چاپ میرے [illegible]
مجھے خدا حافظ کہا۔ اور مجھ سے کہیں [illegible] گیا۔

--

ایک ہفتہ بعد وہ [illegible] میرے گھر آ دھمکا [illegible] پڑوس میں [illegible]
والے ایک آوارہ گرد چھوکرے نے مجھے [illegible] ہماری [illegible] اطلاع دی۔
"تمہیں رات میں نیند بھی آتی ہے؟ صبح ہی صبح آ دھمکے ہو کیا بات ہے۔" میں بولا،

وہ دو منٹ خاموش رہا، جیسے میری بات کا برا مان گیا ہو۔

"بات کچھ بھی نہیں۔ میں چند دن تمہارے گھر سویا کروں گا۔ میں نے چھمیا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ سالی کل رات ایک غیر مرد کے ساتھ سو رہی تھی۔ تھوہے اس کی ذات پر! میں نے جب دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ چور دروازے سے نکل کر بھاگ گیا۔ اب مجھے زندگی بھر کے لئے چھمیا نہیں چاہئے۔ سور کی بچی کو میں نے لات مار کر گھر سے باہر نکال دیا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت روتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ وہ اس کا خالہ زاد بھائی تھا اگر وہ سالا خالہ زاد بھائی تھا تو چوروں کی طرح دم دبا کر بھاگ کیوں گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ میں تم پر کسی وقت بھی بار نہیں بنوں گا، میں ہوٹل میں کھانا کھاؤں گا مجھے صرف چند دنوں کے لئے تمہیں سونے کی تکلیف دینا ہے۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بہاری میرے گھر سویا کرے۔ میں نے اس آنے والی بلا سے بچنے کی بہت کوشش کی۔ گھر کی تنگی کا ذکر بھی کیا۔ لیکن اس نے نہیں مانا۔ مجھے چار و ناچار یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ بہاری میرے گھر سویا کرے گا۔ ویسے میری بیوی کم چند دنوں کے لئے میکے جا چکی تھی۔ اس لئے میرے پاس اسے رات میں سونے کی اجازت دینے میں کوئی معقول عذر نہ تھا۔

اس کے یہاں آنے کے بعد سے میں نے اس کی ذات میں ایک تبدیلی دیکھی۔ وہ رات گئے آوارہ گھومنے کے بجائے شام ڈھلتے ہی گھر آکر سو جایا کرتا

چند ہی دنوں میں اس نے "مدراس سیکنڈ سپاری" کی ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کر وہ صبح اٹھتے ہی سپاری کی چھوٹی چھوٹی پڑیوں کے بنڈلوں کو ڈبے میں پیک کرکے مختلف چائے فروش تاجروں کے ہاں بیچنے چلا جاتا۔ صبح سے لے کر شام تک وہ مارا مارا بازاروں میں پھرتا اس کی اس غیر معمولی تبدیلی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ وہ شخص جو ہمیشہ اپنے لاابالی پن سے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کے نوکری سے جی چراتا رہا ہو، اس کی یکایک تبدیلی حیرت ہی کی تو بات تھی۔ کام کی اس باقاعدگی سے اکتا کر وہ گھر ہی میں پڑا رہا۔

میں نے اس سے پوچھا: "کیا آج نوکری پر نہیں گئے؟"

"منیجر نے مجھے نکال دیا ہے۔"

"آخر کیوں۔ ضرور تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہوگی۔"

"میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ اس نے مجھے چند روپوں کا لالچ دے کر مجھ سے غو
غلط طلب کی جواب میں میں نے اُسے گالی دی۔ پھر مجھے ہمیشہ کے لئے چھٹی مل گئی۔ وہ مجھے سمجھتا
اس کی آنکھوں کی خلاؤں سے محبت جھانک رہی تھی۔ وہ بہتر برس کا بڈھا منیجر کی شان میں گستاخی
کر رہا تھا میں نے ناطہ چھوڑ کر راہ بدل لیا ... عزیز سے ملنا تھا

[illegible] ... رات کے گہرے سناٹے میں میں
اسے کہتے ہوئے ... [illegible]

رات کی سیاہی میں اس کی نورانی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ
مجھ سے دور بیٹھا تھا۔ میں نے قریب جاکر اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بابا جی اس قدر اداس کیوں ہو؟"

"میں بہت پریشان ہوں بھائی آج بیٹی کا ساتھی آیا جو مجھ سے کہتا تھا کہ میری ماں
بہت بیمار ہے۔ بچنے کی بہت کم توقع ہے۔ تم نہیں جانتے ہو بیٹا میں نے اپنی ماں کو کتنا ستایا
اگر وہ مر جائے گی تو یقین جانو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ آبدیدہ ہو گیا۔

دوسرے دن صبح اس نے میرے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس نے منہ میں نوالہ ٹھونستے ہوئے کہا
"میں آج ہی بمبئی جا رہا ہوں۔"

"ٹکٹ کے پیسے ہیں تمہارے پاس؟"

"ٹکٹ کی مجھے کیا ضرورت۔ گاڑی تو سسرال کی ہے۔"

میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر سے جانے کی اجازت دے دی۔ اور دس روپے
دیئے۔ پھر وہ بمبئی چلا گیا۔

تین مہینے تک اس کی کوئی خبر نہ ملی اور مجھے ایک گونہ اطمینان سا ہو گیا کہ وہ اب مجھے دق نہ

کے لیے دوبارہ حیدرآباد نہ آئیگا لیکن اچانک ہی ایک دن وہ پھر میرے گھر آدھمکا۔ میرے پوچھنے پر کہ اب اس کی ماں کی طبیعت کیسی ہے اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میری پہونچنے سے پہلے ہی بڑھیا نے اپنا بستر گول کر لیا تھا، پلو چھٹی ہوگئی۔"

اور میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جس پر اُداسی کی قوس قزح کھنچ گئی تھی۔ اس نے یہاں کچھ دن بیکاری میں گزارے۔ ایک جگہ نوکری کی پھر چھوڑ دی۔ اب کی بار میں نے اسکی ذات میں ایک اور تبدیلی دیکھی۔ وہ اب کم آمیز ہو گیا تھا اور بڑی حد تک حساس بھی۔

اس بار بھی وہ میرے ہی گھر ٹھہرا۔ عجیب اتفاق کہ ذکیہ بھی میکے سے لوٹ آئی تھی۔ آپ سے پہلے اس کا یہاں ٹھہرے رہنا پسند نہ آیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی دوسری جگہ سونے کا انتظام کر لے۔ وہ میری اس بے چینی کو سمجھ رہا تھا جو اس کی موجودگی سے پیدا ہو رہی تھی۔

آج صبح چپراسی نے مجھے اطلاع دی کہ میں اپنے وظیفے کے بقایا روپئے آفس آکر حاصل کر لوں۔ میں مسرت سے چھلک پڑا۔ اندر جاکر ذکیہ کو خوشخبری سنائی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی شوخی سی دوڑ گئی۔ میں نے خرید و فروخت کی ایک لمبی فہرست تیار کی۔ وہ بھی دل ہی دل میں جانے کتنی تمناؤں کی تکمیل کرنے میں مصروف تھی۔

دوپہر میں آفس جاکر میں نے بقایا کے چار سو روپئے حاصل کر لیے۔ میں نے باہر آکر پھر ایک بار نوٹوں کو ایک ایک کر کے گنا اور مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ نوٹ پورے تھے۔ [illegible] بازار سے میں نے ذکیہ کے لیے ایک خوبصورت سی سینڈل لی اور [illegible] گھر گیا۔

ہماری دیوان خانے میں بیٹھا ایک بہت تند شخص سے باتیں کر رہا تھا جس کے گلے میں ایک بھلا چمکتا سا تعویذ لٹک رہا تھا۔ وہ صورت سے لوفر معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے ایک دھکا سا لگا۔ ہمارا گھر گھر نہیں۔ دنیا بھر کے بدمعاشوں کا اڈا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں نے ہوٹل والے چھوکرے کو دیکھا۔ جو چائے لے جاتا ہوا دیوان خانے میں جانے کے لیے جا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا ہوا بغلی دروازے سے داخل ہوا۔ مجھے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر ذکیہ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "پا مل گئے روپے۔"

"ہاں۔"

"اس میں کیا بات ہو [illegible]"

"تمھارے [illegible] خوبصورت [illegible] سینڈل۔"

ذکیہ نے میرے ہاتھ سے سینڈل جھپٹ لیا اور پہننے لگی۔

[illegible] بڑا [illegible] سے پوچھ [illegible]

"ہاں بہت [illegible] ہی مجھے [illegible] محسوس ہو رہا ہے۔" ذکیہ نے دو چار قدم یونہی چلتے ہوئے [illegible]۔

[illegible]

[illegible] رہی تھی۔

جاتے [illegible] ہیں۔"

وہ [illegible] بہاری کی اس حرکت [illegible] آواز میں مسلسل کہے جا رہا تھا۔

[illegible] ملازم کو جیب کرا کے پیسے دیدے۔

[illegible] ہو گیا اس کا آوارہ ساتھی جا چکا تھا [illegible]

[illegible] بہاری کو [illegible]

بہاری [illegible] تم میری عزت ہی کا خیال رکھو۔ [illegible]

[illegible]

رات بہاری [illegible]

دوسرے دن صبح [illegible] تھی۔

[illegible] کی پیشانی [illegible] بعد میں [illegible] بدلنے کے باعث کچھ کھسک [illegible] تھی۔

"عجیب آدمی [illegible] کیا عجب کہ وہ قریب ہی [illegible]

گھر پر کوئی آفت لے آئے۔ آوارہ گرد تو ہے ہی۔ بہتر یہی ہے کہ اس سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ وہ اپنے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا دیکھ لے۔ صبح جب وہ اُٹھا تو میں بجائے اس کے کہ اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا، اُس کی خیریت بڑے ہی چاؤ سے پوچھ رہا تھا۔

"تم بیماری سے ڈرتے ہو۔ تم بیماری سے ڈرتے ہو" میرے اندر کا انسان ذہن کے چور دروازے سے کہہ رہا تھا، ہوا کا ایک تیز جھونکا کرختگی سے سیٹی بجاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

میں دیوان خانے سے اُٹھ کر فوراً باہر چلا آیا۔ کچھ دور یونہی بے معنی انداز میں چلتا رہا۔

فضا پُرسکوت تھی اور ہوا دھیمے دھیمے ایک سوگوار انداز میں بہہ رہی تھی۔ محلّے کے بازار کی اکثر دوکانیں مہینہ کا آخری ہفتہ ہونے کے باعث بند ہو رہی تھیں۔ ساری فضا پہ ایک دباؤ سا چھایا ہوا تھا۔ شاید اس میں میری اضطراری کیفیت کو بھی دخل ہو۔ میں یونہی ٹہلتا ٹہلتا عابد روڈ تک آگیا۔ اس خیال سے کہ کسی ریسٹورنٹ میں اشرف ہی مل جائے لیکن کسی میں اشرف کا پتہ نہ تھا۔ میں کسی میں بیٹھا بیٹھا اکتا سا گیا جب بوائے نے میرے قریب آکر "کیا چاہیے صاحب" کہا تو میں سمجھ گیا کہ میں بہت دیر بیٹھ گیا ہوں۔ وہ پیالے لانے کے بعد اس کا دوبارہ مُنہ سے پوچھنا ایک کس کی بات تھی۔ میں نے کوفت دور کرنے کے لئے "لائٹ ہاؤس" میں لارل اور ہارڈی کی ایک بہت پرانی فلم دیکھی۔ جو کئی بار حیدرآباد میں چل چکی تھی۔ مجھے اس فلم کا نام یاد نہیں رہا۔ بہرکیف بڑی بوگس فلم تھی۔ میں اندر دل ہی سے اُکتا سا گیا اور گھر آ گیا۔

بہاری دیوان خانے سے غائب تھا۔ چار مینار سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے کمرے میں بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔ دو دروازے کے کونے میں سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ میں جب اندر داخل ہوا تو مجھے ایک گھٹن سی محسوس ہوئی۔ کمرے کی گھٹی گھٹی سی فضا صاف چغلی کھا رہی تھی کہ بہاری ابھی ابھی باہر گیا ہے۔ میرے لئے سب سے بڑا ثبوت یہی تھا کہ کونے میں ابھی تک سگریٹ جل رہی تھی۔ میں نے ذکیہ کو آواز دی لیکن وہ سو چکی تھی۔

صبح ذکیہ نے مجھے روز کی بہ نسبت ذرا جلد ہی اُٹھا دیا تھا کیونکہ وہ اپنی سہیلی کے ہاں سالگرہ میں مدعو تھی۔ کھانا کھاتے کھاتے دس بج چکے تھے۔ اُس نے مجھ سے اجازت لی۔ میرے کپڑے بدلنے تک

دو [illegible] میں بیٹھ چکی تھی۔ پھر رکشا بھی چلی گئی اور میں گھر ہی میں ٹہلتا رہا۔ پھر میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا جہاں ایک روپیہ [illegible] رکھا تھا۔ سوچا باہر نکلنے کے لئے ایک آدھ روپیہ ادھر ہوتا [illegible] میرے پاس پیسے آنے کی بجائے بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ میں نے چابی سے بکس کھولا جہاں میں نے [illegible] روپے رکھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بکس میں ایک روپیہ بھی [illegible] میں پھر سا گیا اور ہاتھوں میں رعشہ سی ہونے لگی۔ [illegible] روپے کہاں بکس میں سے غائب ہو [illegible]

میں گھبرا گیا [illegible] کے علاوہ [illegible] کسی اور کی نہیں ہو سکتی [illegible] آنکھ بچا کر [illegible] موجود نہیں ہے [illegible] سوچا [illegible] تو نہیں لے گئے ہیں۔ اگر اس نے [illegible] تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دے دی ہوگی [illegible] کبھی کوئی [illegible] میں [illegible] تو نہیں [illegible] میں [illegible] ٹہلتا رہا۔

[illegible] خوش ہوتے ہوئے [illegible] کہا۔ اس کے [illegible] میں [illegible]

[illegible] نے اس سے نوٹ سے کہا

[illegible] تم [illegible] گھر میں ہو [illegible] شام [illegible] ہیں [illegible] کے لئے [illegible]"

میں [illegible] خاموش [illegible] باتیں سنتا رہا۔ میری خاموشی سے [illegible] کہا۔ "کچھ [illegible] آج کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔ پھر [illegible] کس کام کے لئے [illegible] ایک مدت کے بعد پھر اپنی دوستی کی [illegible]۔

"تمہاری [illegible] اگر تم نے [illegible] ضرورت کے تحت بکس [illegible] سے چار سو روپے لئے ہوں تو [illegible] فوراً واپس کر دو۔ [illegible] میں جانتے تمہاری بھائی کی [illegible] قریب ہے [illegible] تم نے مجھ سے مذاق کیا ہو؟" میں بولا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں نے تم سے کبھی پیسوں کا مذاق کیا ہے؟"

جب میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ سوائے تمہارے اور کوئی نہیں لے سکتا تو وہ بھوکے شیر کی طرح بپھر کر میرے قریب آیا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میں تمہارے ان چار سو روپیوں پر تھوکتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ غصے سے باہر چلا گیا۔

مجھے روپے غائب ہو جانے کا بڑا غم تھا۔ لیکن زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ غبار جو بہت دنوں سے ٹھنڈی راکھ کی طرح میرے سینے میں دفن ہو کر دل میں ایک اضطراری کیفیت پیدا کر رہا تھا وہ آج میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال پھینکا تھا۔

شام میں جب بہاری لوٹ کر آئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے روپیوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے وہ روپے پرسوں ہی بنک میں جمع کرا دیئے ہیں جانے ہوا ان جیبوں میں کیا ہوتے ڈال رکھے۔" یہ کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے پلکیں جھکا لیں۔

مجھے بڑی شرمندگی اور کوفت ہوئی۔ میں نے خوامخواہ بہاری پر شبہہ کیا تھا لیکن اس بہاری سے جو شک دامن میں چپکا تھا اور یہی بات میرے لئے ایک گہری طمانیت کی موجب تھی۔

دن گزرتے سالوں میں تبدیل ہو گئے اور میں بہاری کو ایک بیتی یاد کی طرح بھول گیا تھا۔

ایک دن بالکل اچانک غیر متوقع طور پر رات کے گہرے سناٹے میں کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ میں سہم سا گیا۔ زنجیر کھٹکھٹانے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ میں نے بتی جلائی۔ رات کے تقریباً ساڑھے تین بج چکے تھے۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے کون ہو گا؟

"کون ہو تم؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"میں ہوں۔" ایک بہت ہی پرانی جانی پہچانی آواز آئی۔

میں نے آگے بڑھ کر ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ یہ بہاری تھا۔ اتنی رات گئے میں بہاری کو دیکھ کر سہم سا گیا۔ میری زبان پر جیسے یکایک بجلی گر پڑی۔ اس نے میرے بالکل قریب آ کر کہا:

"ایک دن تم نے مجھ پر چار سو روپے کا الزام لگایا تھا۔ آج میں تمہارا قرض چکانے آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اطمینان سے اپنے اودے رنگ کے لانگ کوٹ میں ہاتھ ڈالا۔ میرا جسم مارے

[illegible] دنیا [illegible]
[illegible] میں [illegible] اس کے [illegible]

[illegible] وہ ڈر جاتا ہوتا [illegible]
[illegible] وہ [illegible]

[illegible] کا [illegible]
[illegible] مجھے [illegible]
[illegible] میں [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ہوئی۔
[illegible]
[illegible] اور ساتھ ہی میں [illegible]
[illegible] اس کی
[illegible] ہو گیا [illegible] زبان
[illegible] تھی۔
"اچھا میں جا کر [illegible] مجھے [illegible] میں پھر آؤں گا۔"
یہ [illegible] موجود [illegible]۔

غلام عباس

بامبے والا

یہ علاقہ سرکاری فائلوں میں تو محض "گورنمنٹ کوارٹرز سی ۳۵۲" کہلاتا تھا مگر یہاں کے ساکنوں نے بڑی جدوجہد کے بعد اس کا ایک علمی نام بھی سرکار سے منظور کرا لیا تھا اور وہ تھا "گلستان کالونی"۔ یہ لوگ خود تو اپنے مکانوں کی پیشانی پر خوش خطی سے "گلستان کالونی" لکھتے ہی تھے، رشتہ دار اور دوستوں کو تاکید تھی کہ وہ بھی خط لکھتے وقت پتہ پر یہی نام درج کریں۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی نادان شرارت یا انجان پن سے اس علاقہ کو "بابو کالونی" کے نام سے یاد کر بیٹھتا تو یہ اس کی جہالت پر جھلا ہی رہ جاتے۔

گلستان کالونی میں صرف انہیں سرکاری ملازموں کو کوارٹر الاٹ کیے جاتے تھے جن کی تنخواہ ساڑھے تین سو سے پانچ سو تک ہوتی۔ اس گریڈ میں عموماً دفتروں کے سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ انچارج، اکاؤنٹنٹ، آڈیٹر، ہیڈ اسٹینو گرافر، اور اسی قبیل کے دوسرے ملازمین آتے تھے۔ کہنے کو یہ بھی کلرک ہی، مگر ذرا نفیس قسم کے۔ جیسے کلرکی کو دو آتشہ یا سہ آتشہ کر دیا گیا ہو۔ ان کی حالت عام کلرکوں سے کہیں بہتر تھی اور وہ اپنی نسبتاً آسودہ حالی، اپنی تجربہ کاری اور اپنے منصب کے باعث اپنے ہم جنسوں میں خاصی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

اس علاقے کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ کوئی نصف میل کے پھیلاؤ میں چار پانچ سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شرقاً غرباً ایک دوسرے کے متوازی چلتی تھیں اور چار پانچ سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شمالاً جنوباً چل کر انہیں کاٹتی تھیں۔ سب کوارٹر یک منزلہ اور ایک ہی وضع کے، نہ چھوٹے نہ بڑے۔ آگے ننھا سا باغیچہ، اس کے بعد دو تین سیڑھیاں، پھر برآمدہ، برآمدے کے ساتھ ملے ہوئے دو کمرے، پیچھے آنگن، باورچی خانہ، توشہ خانہ وغیرہ۔ یہ کوارٹر ایک دوسرے کے عین

یہ بڑے میاں چپکے سے اپنے کمرے میں جاکر اندر سے دروازہ بند کر لیتے۔

کمستان کالونی کی چہل پہل میں اضافہ کرنے میں ایک اور ہستی کا بھی بڑا دخل تھا اور یہ تھا باجے والا۔ باجے والا بیس بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ گندمی رنگ، ناک نقشہ برا نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس صوبے کا رہنے والا ہے۔ وہ خود کو بمبئی کا باشندہ بتلاتا تھا۔ مگر اس کے بیان قاف کی درستی کہے دیتی تھی کہ اس کا تعلق ملک کے جنوبی حصے سے نہیں بلکہ شمالی حصے سے ہے۔ بڑی وضع قطع اور لباس سے وہ سرکس کے مسخروں سے ملتا جلتا تھا۔ کبھی سیاہ ڈھیلا کوٹ اور سیاہ ناٹ ہیٹ۔ کبھی شب خوابی کا رنگ دار دھاریوں والا کرتہ پاجامہ اور سر پر منکوں کی بنی ہوئی انگریزی ٹوپی۔ کبھی بنگالی عمر رسیدہ بزرگوں کی طرح میں گھٹنوں تک کا لمبا کرتہ اور نیچے ہری دھوتی۔ کبھی شکاریوں کی طرح برجس ڈاٹے ہوئے۔ کبھی کبھی پیپ ہیٹ کی جگہ سر پر لال ترکی ٹوپی سجی رہتی۔ چہرے پر ایکٹروں کی طرح غازہ ملا ہوتا۔ میک اپ کیا ہوتا۔ آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پر لپ اسٹک۔ اس کے ساتھ باریک ریکھا مونچھیں۔ وہ جو لباس بھی پہنتا ایسا بے ڈھنگا ہوتا کہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی۔ اس نے اپنی باجے کا حلیہ بھی بگاڑ رکھا تھا۔ اور اس کے پہیوں اور ہینڈل گاڑی پر رنگ دار کاغذ کی بنی ہوئی جھنڈیاں لگا رکھی تھیں جو ہوا سے آپ ہی آپ گھومتی رہتیں۔ گلے میں ایک چھوٹا سا بکس ڈال رکھا تھا جس میں طرح طرح کی ٹافیاں، چوسنے والی گولیاں، رنگ برنگے کی مٹھائیں اور میٹھی سونف کی پڑیاں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ فلمی ایکٹروں کے فوٹو اور فلمی گانے کی کتابیں بھی بیچا کرتا تھا۔ ایک ہاتھ ہینڈل پر دوسرے ہاتھ میں ایک ٹیڑھا سا کالے رنگ کا بھونپو۔ اس کے سوراخ سے منہ لگا کر جس وقت وہ باجے والا باجے والا کی آواز لگاتا تو آس پاس کے گھروں میں ہلچل سی مچ جاتی۔ بچے پیسوں کے لئے مچلنا شروع کر دیتے۔ اور پھر وہ تیر کی طرح "باجے والا" کے پاس پہنچ جاتے۔

"باجے والا" کے الفاظ وہ اس طرح لہک لہک کر ادا کرتا کہ وہ ایک نغمے کی طرح معلوم ہوتے۔ جس میں کئی اتار چڑھاؤ سُر لگتے۔ اس کا یہ گانا اس کی آمد کا اعلان ہوتا۔

دل کا نیک تھا۔ بچوں کو ان کے دام سے کچھ زیادہ ہی مٹھائیاں دے دیا کرتا۔ کبھی کسی بچے کے پاس پیسہ نہ ہوتا تو مفت ہی ایک آدھ چوسنے والی گولی دے دیتا۔ وہ "باجے والا" کی الاپ

کے علاوہ اور بھی بہت سے گانے گایا کرتا۔ یہ فلموں کے چلنتر گانے ہوتے جن میں پریم اور پریمی۔ بچھونے اور پریمیے کا ذکر ایسے پُرسوز طریق پر ہوتا کہ انھیں سُن کر بلوغت کو پہنچنے والی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور وہ اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو آنہ یا ٹکا دے کر میٹھی سونف منگوایا کرتیں۔

اس کی آواز ایسی مدھر تھی کہ جب وہ کوئی فلمی گانا گاتا تو لوگ اس کے مسخرے پن کو بھول کر گانے پر جھوم سے اُٹھتے۔ اس کی یہ آواز اُس کے کاروبار کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ عورتوں کو گھورنا یا ان پر آوازے کسنا اس کی عادت نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ آواز گانے کے پردے میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

وہ اس کالونی میں ہفتے میں ایک آدھ بار ہی آیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے آتے ہی بچے بڑے جوش و خروش سے اس کے خیر مقدم کے لئے دوڑتے۔ بچے جس قدر اس سے خوش تھے ان کے ماں باپ اتنا ہی اس سے بیزار کیونکہ اس کے آنے پر انھیں بچوں کی ضد پوری کرنی پڑتی تھی۔ خواہ جیب میں پیسہ ہو یا نہ ہو اور ان بڑے بوڑھوں کی ناراضگی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ انہیں اس کے مسخروں کے سے لباس اور عاشقانہ گیتوں سے سخت چڑ ہو گئی تھی۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ان گانوں سے شرفا کی بہو بیٹیوں کا اخلاق بگڑتا تھا۔ اگر ان بڈھوں کا بس چلتا تو وہ اُسے پولیس کے حوالے کر کے حوالات میں بند کرا دیتے۔ مگر جب تک اس سے کوئی مجرمانہ حرکت سرزد نہ ہو ایسا ناممکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان بڑے بوڑھوں کو گھر کی طرح اس معاملے میں بھی صبر ہی سے کام لینا پڑتا تھا۔

آخر ایک دن ایسا آیا جب ان کے صبر کا پیمانہ سچ مچ لبریز ہو گیا اور اُدھر وہ لوگ بھی جو عورتوں کی آزادی کے بڑے حامی تھے سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں ہمیں تو غلطی پر نہیں ہیں۔

ہوا یہ کہ کالونی میں ایک بنگالی بابو رہتا تھا وہ کسی دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ہیرا اور سبتیا۔ ہیرا کی عمر تیرہ برس اور سبتیا کی چودہ برس۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک کتھک سے ناچ سیکھا کرتی تھیں۔ اس کتھک کی عمر کوئی تیس بتیس سال کی تھی۔ وہ کئی زبانیں جانتا

تھا اور اس جوان عمری ہی میں حماقت کا پانی پی چکا تھا۔ ایک دن زبردستی وہ کسی تماشے کے پاس لے کر آیا اور ان لوگوں کو تماشے پر اکسایا۔ [illegible] لڑکیوں نے ماں سے اصرار کر کے اجازت لے لی۔ اس کے بعد وہ دونوں لڑکے یہاں اور [illegible] کے تعلق سے راغب ہوئے کہ جانے زیر تحصیل ہی یہ آسمان ٹوٹ گیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں دونوں بوڑھے انگریزی سننے کے شوق میں بھی جاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں اسی شہر کے [illegible] سنتے ہیں جو [illegible] نوجوانوں میں [illegible] ہے۔ [illegible] بھی کسی [illegible] کا [illegible] تھی مگر [illegible] سکا۔

اس دن یہ واقعہ پیش آیا [illegible] وہ دونوں بوڑھے جھرجھرا اٹھے گئے جیسے کوئی موت [illegible] ریڈیو [illegible] گانے سننے بند کر دیے گئے [illegible] سماں بندھ گیا کالونی کے [illegible] کی [illegible] ستار سیکھا کرتی تھی [illegible] نے اسی [illegible] برطرف کر دیا۔ یہ واقعہ تھا تو بہت افسوسناک [illegible] ان بوڑھوں کے لئے ایسا سازگار ثابت ہوا کہ گویا ان کے حق میں تائید غیبی ہو۔ کالونی میں ایک دم ان کا وقار بڑھ گیا یہ بوڑھے جو پہلے سر ڈالے سایے کی طرح چپکے سے گلی کوچوں سے گزر جاتے تھے۔ اب انھیں راستوں پر کھنکھارنے، ادھر ادھر سے [illegible] سر اٹھا اٹھا کر چلنے لگے۔ اپنے بیٹوں کو کھری کھری سنانے اور اس نئی تہذیب کی خوب خوب دھجیاں اڑانے۔ برسوں سے اس کے خلاف دلوں میں جو نفرت کا طوفان امنڈ رہا تھا وہ ایک دم پھوٹ پڑا۔ اب ان کے جوان بیٹوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے سنتے رہیں اور سر جھکا لیں۔

جس دن سے یہ واقعہ پیش آیا تھا بڈھوں کی اس منڈلی میں بڑا جوش و خروش نظر آنے لگا تھا۔ یہ لوگ بلند آواز سے اس پر حاشیہ آرائیاں کرنے اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے۔ انکے لئے یہ ماجرا روز کا ایک مستقل موضوع بن گیا تھا۔

"دیکھو جی" مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں نے اپنے ساتھ والے بڈھے سے

خطاب کیا۔ "اگر ایسا ہی ایک واقعہ اور ہوجائے تو میں مسلمان لڑکیوں کی طرح اپنی پوتیوں کو برقع پہنانا شروع کردوں"۔

اس پر منڈلی میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"گپتا جی بھی کمال کرتے ہیں"۔ ایک سفید ریش مقطع صورت بزرگ گویا ہوئے۔ "شرافت کوئی برقع ہی میں تھوڑی ہے۔ یہ تو دل میں ہونی چاہئے"۔

"سچ کہتے ہو خاں صاحب" ایک اور پیرمرد نے تائید کی اور خانصاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ خاں صاحب کی بہو پردہ نہیں کرتی تھی۔ اور جوان بیٹیاں بھی بے نقاب ہی کالج جاتی تھیں۔

منڈلی میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک "باجے والا" کی آواز سنائی دی۔ کالونی کی اس اداس اور سوگ بھری خاموشی میں یہ آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے قبرستان میں کوئی بدمست شرابی آ گھسے اور بنکارنا شروع کردے۔

بڈھوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر بخشی جی، جو تھے تو ساٹھ سے اوپر کے مگر جوانوں کا سا دم خم رکھتے تھے، مونڈھے سے اٹھے اور باجے والے کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بیچتے ہو تم؟" بخشی نے غصہ بھری آواز میں پوچھا۔

باجے والا متعجب ہوکر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا بیچتے ہو تم؟" بخشی جی نے پہلے سے بھی زیادہ غصے میں کہا۔

"ٹافی۔ چوسنے والی گولیاں، میٹھی سونف" باجے والا نے مسکرا کر کہا۔

"لاؤ دکھاؤ"۔

باجے والا نے بائیسکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کردیا اور گلے میں پڑا ہوا بکس کھول کر سب چیزوں کا ایک ایک نمونہ دکھانے لگا۔

"بے ایمان کہیں کا" بخشی جی ایک دم ہی برس پڑے۔ "یہ ٹافی تو گڑ کی ہے۔ بچوں کو

بھگنے کے لئے یہ چار سو بیس"۔

باجے والا کچھ پریشان سا نظر آیا مگر بدستور مسکراتے ہوئے ادب سے بولا۔

"حضور اوّل تو یہ درست نہیں کہ یہ نائی گرہ کٹ ہے۔ دوسرے یہ چیزیں میں خود تھوڑا ہی بناتا ہوں۔ یہ تو کمپنی کا مال ہے۔ میں تو بنا بنایا مال لاتا ہوں"۔

اس اثنا میں تین چار بوڑھے اور منڈلی سے اٹھ کر باجے والا کے پاس پہنچ گئے اور اسکو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا فراڈ لگائی ہے"۔ یہ کہتے ہی گیا جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور زور کا ایک چانٹا باجے والا کے منہ پر جڑ دیا۔ "ایک تو چیز ادبر سے کمپنی کا رعب جماتا ہے۔ لے اور لے"۔

پھر تو جیسے بھڑ کا چھتہ بھڑک گیا تھا چاروں طرف سے باجے والا پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ ادھر اس کا یہ حال کہ بے تحاشا پٹا جاتا ہے وہ پہلے سے زیادہ ہکا بکا ہو کر مارنے والوں کا منہ تکنے لگتا تھا۔ اس کی ٹوپی پہلے ہی نیچے زمین پر آ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر انگلیوں کے نشان پڑ گئے گالوں اور ہونٹوں کی سرخی میں سے خون کی سیاہی مل گئی تھی۔ ہاتھا پائی میں اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے ایک بزرگ نے اس کا بٹن کوٹ کی جیب، نوٹ ڈالی تھی اس کا مٹھائیوں والا بکس کھل گیا تھا اور ٹافیاں چاکلیٹ، رنگ برنگی بھاپیں، میٹھی سونف کی پڑیاں، زمین پر آ رہی تھیں۔ فلمی ایکٹروں کی تصویریں، گانوں کی کتابیں، فلمی پریوں کی داستانیں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔

"حرام زادہ، سور کا بچہ، بڑا ایکٹر بنا پھرتا ہے بدمعاش..... جا آج چھوڑ دیا پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کیجیو۔ اور تینوں بوڑھوں نے تھک کر اسکا پیچھا چھوڑ دیا اور پھر اپنی منڈلی میں آ رہے۔

باجے والا مظلومی کی تصویر بنا دیر تک زمین پر بیٹھا ٹافیاں، تصویریں اور کتابیں اٹھاتا اور جھاڑ جھاڑ کر اپنے بکس میں رکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ ان بوڑھے بابوؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیتا آخر وہ زمین سے اٹھا سائیکل پر بیٹھ کر خاموشی سے اس طرح سے رخصت ہو گیا۔ مارے اس کا جسم درد کرتا تھا اسے بے عزتی کا بھی بہت غم تھا اور سب سے زیادہ اس بات پر تعجب کہ کس جرم کی پاداش میں اسے یہ سزا دی گئی ہے۔

اس کے بعد اس نواح میں باجے والا کی آواز پھر کبھی سنائی نہ دی۔

غلام علی چودھری

شکستہ زینہ

وہ گھر پہنچا تو شام ہو رہی تھی، اس کا جسم پسینے سے تر تھا۔ کچھ یوں گرمی زیادہ تھی، کچھ دفتر میں دیر ہو جانے کے سبب اس نے سائیکل تیز چلائی۔ اس نے پہلے عینک اتاری، پھر ہیٹ، عینک ہیٹ کے اندر رکھی اور ہیٹ میلی سطح والی میز پر رکھ دی، جو ہمیشہ اس کے مکان کے باہر گلی کی گندی نالی کے کنارے پڑی رہتی تھی۔ اور جس پر شیخ جی کے ملازم کئی بار تین تین چار چار مینڈھے الٹا کر ادھیڑتے رکھ دیا کرتے تھے۔ اس نے سائیکل میز کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی، رومال جیب سے نکال کر چہرے سے پسینہ پونچھا اور باری باری دونوں پاؤں ٹھپ ٹھپ میں پر مار کر بوٹوں سے گرد جھاڑی۔ پھر سائیکل کو سیڑھیوں والے کمرے میں دھکیل کر تالا لگایا اور کیریئر سے فائلوں کا پلندہ نکال کر بغل میں دبایا۔ میز پر سے اپنی ہیٹ اٹھا کر زینے کی طرف مڑا جس پر چڑھنا اترنا پچھلے دو مہینوں سے ایک خاصا دشوار کام ہو گیا تھا۔

پہلے دو زینوں پر اس نے بہت احتیاط سے قدم رکھا۔ تیسرا اس قدر ٹوٹا پھوٹا تھا کہ نہ ہونے کے برابر تھا اگرچہ اترنے چڑھنے والے کو کل تیرہ زینوں میں سب سے زیادہ اسی کا خیال رہتا تھا۔ اس کے گھر والوں نے ایک طریقہ بنایا ہوا تھا کہ چڑھتے وقت تیسرا اور اترتے وقت گیارہواں زینہ چھوڑ دیا جائے۔ راستے اندھیرے میں چڑھنے والا پہلے زینے پر قدم رکھ کے کہتا "ایک" دوسرے پر "دو" پھر "تی . . ی . ." کہتا ہوا ٹانگ کو بہت اوپر اٹھا کر اگلے زینے پر قدم جماتا اور دیوار کا سہارا لے کر پچھلے زینے سے پاؤں اٹھاتا اور گنتی ختم کرتا . . . "تی . . . ن" تین کی آواز نکلنے کے ساتھ ہی سانس ڈھیلا چھوڑ دیا جاتا۔ اترنے کا کام چڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل تھا، کیونکہ گنتی خاصی لمبی تھی۔ ایک، دو، . . . . . دس، گیارہ۔

فائلوں کے لفافے بغل میں گرفت مضبوط کرکے اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے دوسرے زینے سے قدم اٹھا کر جونہی بڑھایا تو بے اختیار اس کی زبان پر آگیا "اُف ظالم" اور ایک مرتبہ پھر آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا گیا۔ اس کی ماں دالان میں باورچی خانے کے سامنے بچھے تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھری تھی۔ دوسرے میں لیموں۔ وہ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اطمینان کی ایک لہر اس کے پچکے زرد چہرے پر پھیل گئی۔

"امداد بیٹا اتنی دیر؟"

"دفتر میں کام زیادہ تھا ماں۔" کہتا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ فائلوں کا پلندہ کمرے میں پڑی ہوئی تپائی پر ڈالا۔ ہیٹ کھونٹی پر ٹانگی اور عینک الماری میں رکھی کپڑے اتار کر غسل خانے میں گیا۔ اس کے نہا کر آنے تک لیموں کا شربت تپائی پر تیار پڑا تھا۔ کپڑے پہن کر وہ بال سنوارنے لگا۔ لیکن پھر بھی اسی طرح کنگھی ہاتھوں میں لیے باہر چھجے پر جا کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے ذرا جھک کر نیچے گلی میں جھانکا پھر بائیں طرف دیکھا۔ سامنے والے مکان کی کھڑکی کی چق ایک طرف ہٹی تھی اور شیخ جی کی لڑکی نائلہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔

اس کے تھکے ہوئے چہرے پر تازگی آگئی اور وہ مسکراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا بال درست کرکے اس نے کنگھی الماری میں رکھ دی پھر تپائی سے گلاس اٹھا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور شربت پینے لگا۔

یہ تانک جھانک پچھلے پندرہ بیس دن سے چلی آ رہی تھی۔ اس کی ابتدا شیخ جی سے امداد کا جھگڑا ہونے کے ایک روز بعد ہوئی تھی اس وقت اگر احاطے کے لوگ بیچ میں نہ آجاتے تو شاید تو تو میں میں سے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی۔ آخر امداد بھی شیخ جی کے رویے سے تنگ آگیا تھا۔ مانا کہ وہ سارے احاطے کے مالک اور شہر میں خیموں اور فرنیچر کے سب سے بڑے سوداگر تھے۔ لیکن وہ کرایہ داروں کو اتنا تنگ کیا کرتے تھے۔ شکایت جائز بھی ہوتی تو بھی وہ اسے سننا گوارا نہ کرتے۔

"چھت ٹپکتی ہے شیخ جی!"

"امسال شامیانہ لگالو بھئی!"

"زینہ ٹوٹ رہا ہے شیخ جی۔"

"اترنا پڑھنا بند کر دو صاحب۔"

"بچوں والا گھر ہے شیخ جی! اور چھجہ تو گرا ہی چاہتا ہے۔"

"تقدیر روکے سے نہیں رکتی میاں۔"

امداد کے گھر والے سمجھتے تھے کہ احاطے کے کرایہ داروں کو شیخ جی سے بے سبب اُلجھنے کی عادت بھی ہے اور اسی لئے وہ ان کی باتوں پر کان نہ دھرتا تھا لیکن جب ان کے مکان کی چھت ٹپکنے لگی اور زینہ ٹوٹنے لگا تو اس نے پورے دفتری وقار اور ادب کے ساتھ شیخ جی کے سامنے اپنی شکایت رکھی۔ شیخ جی نے اس سے مرمت کا وعدہ تو کیا لیکن کرایہ بڑھا کر نیا کرایہ نامہ لکھوانے کے بعد۔ احاطے کے باقی کرایہ داروں نے امداد کو اس نئے راستے چلنے سے روکا۔ لیکن وہ نہ رکا اور اپنی ماں کے کہنے کے مطابق اس بڑھتے کرائے کے حساب سے نیا کرایہ نامہ لکھ دیا اور ایک مہینہ کا پیشگی کرایہ بھی دے دیا۔ مگر چھت برسات بھر ٹپکتی رہی اور زینہ برابر ٹوٹتا رہا اور احاطے کے لوگ "بابو" کی سادہ لوحی پر ہنستے رہے۔

شیخ جی سے امداد کا پہلا معرکہ اس وقت ہوا جب شیخ جی کی وعدہ خلافی پر اس نے اپنی ماں کی مرضی کے مطابق کرایہ روک لیا۔ جوابی کارروائی یہ ہوئی کہ موقع پاکر شیخ جی کے ملازموں نے ان کے مکان سے بجلی کا کنکشن کاٹ دیا۔ یہ اس کے باپ کے آخری ایام کی بات تھی۔ اس کی پھوپھی اس کی ماں بیمار کی تیمارداری میں لگی تھیں اور امداد دفتر میں تھا کہ شیخ جی نے یہ بزدلانہ حرکت کی۔ دوسرا جھگڑا شیخ جی کے دوسرے ادھیڑ وار پر ہوا جو کارگر نہ ہوسکا۔ امداد کے اچانک موقعے پر پہنچ جانے سے پانی کا نلکا بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس روز غصے میں امداد شیخ جی کو حاجی پاجی تمیز بدتمیز نہیں کیا کچھ کہہ گیا تھا۔ احاطے کے لوگ یوں تو اس کی حمایت ہی کرتے رہے لیکن اس نے دو ایک کو یہ بھی کہتے سنا کہ کرایہ بڑھا دو جی "نیا کرایہ نامہ لکھ دو بابو۔"

اس رات جب وہ دالان میں تخت پر بیٹھا اور اس کی ماں مصلے پر وظیفے میں مشغول تھی تو اس نے اسے ہدایت کی تھی "امداد بیٹا مانا کہ ہم سچے ہیں پر شیخ جی کو حاجی کا مرتبہ کیا کرو۔" اور اس نے کہا تھا۔ "تو منع کرتی ہے اماں نہیں تو یہ بچے چھوڑ عرش کی سیر بھی کراتے ہیں اسے یہی کچھ کہوں میرا بس چلے تو میں اس کے

فرنیچر پھولداریوں۔ شامیانوں کے سب کو دام پھینکوا دوں۔ ہاں یہ داڑھی پگڑی والا ڈھنگ بڑا ہی دھوکے کا ہے یہ تو حکومت کو بھی دھتا بتا جاتا ہے۔ فیروز کو جانتی ہو ناں؟ وہ جو سامنے کونے والے مکان میں رہتا ہے؟"

"ہاں بیٹا بڑی ہمت والا ہے۔ وہ تو بے چارہ پہلے ہی ایک دن رات میں مکان کی مرمت کروا لی اس نے۔"

"تو کر دو ناں یہی کہانی تو میں تمہیں سنانے لگا ہوں۔ مجھے کیا خبر تھی۔ مجھے تو یہ سارا قصہ فیروز کے ایک دوست نے آج کے جھگڑے کے بعد سنایا ہے۔ اتفاق سے سب مکانوں کی طرح اس کے مکان کی حالت بھی خستہ تھی۔ وہ بے چارہ کئی مہینے شیخ جی کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ لیکن شیخ جی سیدھے منہ بات ہی نہ کرتے تھے۔ جب بولتے یہی کہتے مکان خالی کر دو جی۔ پھر اس زمانے میں مکان کہاں ملتا ہے؟ وہ جس حال میں رہ رہے تھے اسی میں رہتے رہے۔ ایک شام شیخ جی آپ ہی اس کے مکان پر آ گئے۔ کہنے لگے۔ میاں فیروز جی یہ تمہارے مکان کی مرمت کرا دیں۔ فیروز تو حیران تھا۔ بولا مہربانی شیخ جی۔ کہنے لگے ہم تو خادم ہیں تمہارے [illegible] وقت ہو جاتی جب تم کہا کرتے [illegible] کچھ [illegible] کا موقع ملا ہے۔ اور پھر [illegible] بھی ہم تمہارے کام آئے تم ہمارے [illegible] درست [illegible] آدمی [illegible]۔ کچھ بھی [illegible] ہو جائے گی۔ فیروز نے کہا "نہیں شیخ جی [illegible] میرے لائق ہو تو میں حاضر ہوں۔ آپ بھی لیجئے۔ شیخ جی بولے بات کچھ بھی نہیں۔ [illegible] اس سال آمدنی پہلے کی نسبت ذرا سی زیادہ ہو گئی نا"

"تو اللہ کا شکر کیجئے شیخ جی۔ پریشانی کیسی۔" فیروز حیران تھا

"ہاں بھئی وہ تو ٹھیک ہے" شیخ جی مطلب پر آ گئے تھے۔ لیکن یہ دولت کے ٹیکس بڑی ہی پریشان کرتے ہیں اس بار انکم ٹیکس کا بوجھ بہت پڑے گا۔ تم چاہو تو یہ بوجھ کافی ہلکا ہو سکتا ہے"

فیروز بولا "مگر شیخ جی میرا تو کوئی تعلق نہیں۔ کم شکل کے تھے"

لگے تو بھی سب [illegible] ہیں۔ تم خسارے کے بزنس میں شریک ہو۔ اخباروں میں تو دنیا جہان کی باتیں ہوتی ہیں۔" شیخ جی وضاحت کی۔

"لیکن میں کیا کروں شیخ جی" فیروز بے چارہ پریشان ہو گیا تھا۔

آخر شیخ جی نے اپنا راز بتاتے ہی تجویز پیش کی۔ اس نے ٹمبر روڈ پر ایک شاندار سی کوٹھی شو کے لیے

کرائے پر لی ہوئی ہے۔ اس کا ایک حصہ بہت ہی ٹوٹا پھوٹا ہے۔"

"آپ کے احاطے کے مکانوں کی طرح" فیروز نے نشتر لگایا مگر شیخ جی نے سنی ان سنی کی۔

"میرا خیال ہے فیروز دین جی۔ اس حصے میں کچھ پھٹے پرانے خیمے اور قناتیں، ٹوٹی ہوئی پلیٹیں اور پیالیاں اور شکستہ میزیں اور کرسیاں بند کر کے ایک رات اسے آگ لگا دی جائے۔ فائر بریگیڈ اس وقت بلایا جائے جب یہ حصہ جل جائے۔ جلتی ہوئی عمارت اور سامان کے فوٹو لئے جائیں اور تمہاری مدد سے تمہارے اخبار میں۔۔۔"

"اس مصنوعی حادثے کی خبر چھپ جائے"۔ فیروز نے شیخ جی کا فقرہ مکمل کر دیا۔

"ہاں ہاں یہی میرا مطلب ہے۔ میں تمہارا بڑا احسان مند ہوں میاں صاحب۔ تمہاری یہ نیکی کبھی نہ بھولوں گا۔" شیخ جی نے احسانمندی کا اظہار کیا۔

"شیخ جی مکان کی پوری مرمت رنگ و روغن سب کچھ مہنگی چاہئے۔ مجھے آپ پر اعتبار نہیں۔" فیروز نے شرط پیش کی۔

"پھر کیا تھا ماں! بات پکی ہو گئی۔ دن کو سورج کی روشنی تھی، رات کو بجلی کی۔ چوبیس گھنٹے میں فیروز کا مکان نہا دھو کر بن ٹھن کر دلہن کی طرح چمکنے لگا۔

"پر اخبار میں آگ لگنے کی خبر چھپنے سے کیا ہوا امداد؟"

"واہ بھولی ماں"۔ شیخ جی نے حکومت کے سامنے عرض گزاری کہ مجھ غریب کا سب کچھ جل گیا۔ میں برباد ہو گیا۔ تصویر اور خبر بطور ثبوت گذاری اور ہزاروں روپیا کم ٹیکس معاف ہو گیا۔"

"ہائے توبہ!" ماں کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر مصلے پر گر پڑی۔

"یہ ہیں تمہارے حاجیوں کے فریب ماں"!

"نہ بیٹا یوں نہ کہو۔ حاجی فریب نہیں کرتے۔ فریبی حج کر سکتے ہیں۔"

کمیٹی کے نلکے کے پاس گندی نالی کے کنارے پڑی ہوئی لمبی میز کے اوپر آج چار اور میزیں اٹھا کر رکھ دی گئی تھیں۔ سب سے اوپر والی میز کی ایک طرف کی ٹانگیں امداد کے مکان کے چھجے کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں۔ اور دوسری طرف کی شیخ جی کے مکان کی گیلری کے ساتھ لگ رہی تھیں۔ امداد نے معمول کے مطابق اپنی

باہر نل کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ کھڑکی سے کسی کی آواز آئی۔ اس نے اوپر دیکھا سیڑھیوں کے نیچے کے اس باریک حصے کو مٹی سے ... حالدہ کا چہرہ اسے دکھائی دیا۔ لیکن صرف چہرہ کیونکہ اسکا باقی جسم سیڑھیوں کی اوٹ میں تھا۔

وہ سب سے اوپر کے زینے پر پہنچا تو اُس کی ماں تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کی طرف آئی اور اُس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹا۔"

"ہاں۔"

"ہوا کیا ہے؟"

"میں نے سب تمھارے کپڑے دھو دئے ماں؟"

"اچھے بیٹے" اس نے امداد کو چھاتی سے لگا لیا۔ پھر اسے الگ کرتے ہوئے بولی۔ "جو حکومت کو دھوکہ دے سکتا ہے وہ تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتا ہے امداد۔ تم غریب بڑھیا کے اکلوتے بچے ہو۔ اس کی زندگی کا اس کے بڑھاپے کے سہارے۔ تم شیخ جی سے دور رہنا۔"

"ہمیں مزدوروں کا مال پر سو کیا ہے؟"

"شیخ جی کے نوکر آج سے ٹھیکہ بند کر گئے ہیں۔"

امداد چپ تھا:

"ہم مشقتی سے پانی ڈلوائیں گے میرے لال۔ جاؤ نیچے نل سے نہا آؤ۔"

وہ کچھ دیر ماں کا منہ تکتا رہا پھر مسکرایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے کپڑے اتارے۔ نیکر اور بنیان پہن کر بالٹی اور تولیہ کندھے پر ڈالا اور صابن دانی اٹھائی پھر نیچے بڑی عجلت سے ہو کر نیچے صحن کے نلکے کا جائزہ لیا۔ ... وہ گیلی کے نلکے پر نہانے لگا تھا اور اگرچہ تمام بدن بھیگا ہوا تھا۔ پھر بھی ایک گونہ حجاب سا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ نہا کر گیلی نیکر نچوڑ رہا تھا کہ نلکے کے پاس پڑے ہوئے کاغذ کا ایک گولا سا آ کر گرا۔ اس نے گیلری کی طرف سر اٹھا کر دیکھا مبادا کہ اس کی ماں نے دیکھ لیا ہو۔ پھر وہ جھکا اور صابن دانی کے ساتھ اس نے

کاغذ کا گولا بھی اٹھا لیا۔

"آہا ہا وہاں نہانے کا تو اتنا مزا آیا ماں۔ بڑی موٹی دھار سے نل کی۔" امداد سر پہ تولیہ ڈالے ہوئے آیا۔

"کل سے تم اوپر ہی نہانا بیٹا۔" اس کی ماں نے کہا۔

"کیوں ماں کیا بات ہے ماں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"تم نہا رہے تھے اور شیخ جی کی لڑکی تمہیں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بھی تو نہیں ہٹی وہ۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے ماں؟"

"بیٹا نظر بد سے خدا بچائے کھا جاتی ہے یہ تو انسان کو۔"

"نہیں ماں اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جیسے تم کہو۔"

وہ کمرے میں آیا تو ہاتھ پونچھتے ہوئے لیمپ کے پاس تپائی پر شربت کا گلاس پڑا ہوا تھا جس میں برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اس نے لیمپ جلا کر دیکھا پھر اس میں تنکا ڈالا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ماں باورچی خانے میں مصروف تھی۔ موقع غنیمت جان کر اس نے جلدی جلدی کاغذ کا گولا کھولا تو اس میں سے ایک سرخ نگینے والی سونے کی انگوٹھی نکلی۔ اس نے کاغذ کو فائل کی جلد پر رکھ کر اس کی شکنیں دور کیں۔ کوئی لمبا چوڑا مضمون اس ہوائی خط میں نہیں تھا۔ نیلی روشنائی سے لکھی ہوئی دو ہی سطور تھیں اوپر موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا ——— "خاکے" اور نیچے عام انداز میں درج تھا "کھینچتی بھی ہوں اور اڑاتی بھی ہوں"

اس نے انگوٹھی اور کاغذ کو محفوظ کیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شربت کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

"خاکے کھینچتی بھی ہوں اور اڑاتی بھی ہوں"۔ یہ چند لفظ بار بار اس کی زبان پہ آئے۔ اس نے انہیں کئی دفعہ اور کئی لہجوں میں ادا کیا۔ وہ شاید انہیں بادام سمجھتا تھا۔ اور چھلکا توڑ کر مغز حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تو ان برف کے ٹکڑوں کی طرح تھے جو شربت میں حل ہوتے جا رہے تھے۔ جنھیں وہ بڑی آسانی سے چبا رہا تھا۔ اور جو تھوڑی سی ٹھنڈک دینے کے بعد منہ میں گم ہوتے جاتے تھے۔ "خاکے کھینچتی بھی ہوں اور اڑاتی بھی ہوں"۔ الفاظ سادہ تھے۔ معانی صاف تھے لیکن بات کیا ہوئی؟

اگلی شام امداد اور غسل خانے میں جا کر اس نے تھیلی سے کاغذ کا گودا بجائے نلکے کے نیچے پر گرا۔ مل والا معمہ حل ہو گیا تھا۔ ڈرائنگ پیپر کے دو خاصے بڑے ٹکڑے تھے۔ ایک پر امداد کی تصویر کھنچی ہوئی تھی اور دوسرے پر شیخ جی کا کارٹون بنا تھا۔ اپنا خاکہ اسے بہت اچھا نہ لگا۔ حالانکہ اسکا دفتری بستہ اور انگریزی لباس اس کے دبلے پتلے جسم پر خاصی موزونیت کے ساتھ چسپاں کرایا گیا تھا اور اسکے تیکھے نقوش نمایاں نظر آ رہے تھے۔

شیخ جی کی صورت عجیب دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹے قد کو اور بھی چھوٹا کر دیا گیا تھا۔ لمبی داڑھی اور بھی لمبی ہو گئی تھی اور بڑی سی پگڑی بھی اور لمبی پڑی۔ چہرے کے نقوش اصل کے مطابق دکھائی دیتے تھے اور یہی غالباً تصویر کی سب سے بڑی خوبی تھی جس کے باعث پہچان ہوتی تھی اور بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ انگریزی کالر والا گھٹنوں تک لمبا کوٹ اور گھٹنوں سے اوپر چڑھی ہوئی تنگ شلوار اور موٹی کھال کا دیسی جوتا۔ سامنے ہی پیسوں کی ایک کھلی تھیلی پڑی تھی جس میں سکے دکھائی دے رہے تھے اور شیخ جی انہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ... یہ تھے اس علاقے کی ساری آبادی کے مالک شہر میں غریبوں اور کراکری اور دیسی چیزوں کے سب سے بڑے تاجر حاجی شیخ عبد الباری اپنی اکلوتی صاحبزادی خالدہ کی نظر میں۔

کمرے میں بند ہو کر امداد اپنے مخالف کی اس درگت پر ہنستے ہنستے دہرا ہوا جا رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ کسی طرح سے سہی، کسی شخص کے ذریعے ہی، آخر شیخ جی سے ساری زیادتیوں کا انتقام لے ہی لیا تھا۔ وہ صاف سمجھتا تھا کہ اسے خوش کرنے کے لئے خالدہ نے اپنے باپ کا مذاق اڑایا تھا۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ وہ یہ خاکہ اپنی ماں کو یہ کہہ کر دکھا دے مگر چونکہ اسے شیخ جی سے لڑنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اسلئے اس نے اس طرح جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لئے تھے۔ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ اگر وہ شیخ جی کو یہ تصویر مع مصورہ کے نام اور پتہ کے بذریعہ ڈاک بھیج دے تو کتنا مزا آئے لیکن اس نے پہلی نہ دوسری کسی بات کے کرنے کی بھی ہمت نہ کی۔

اس رات امداد بہت خوش تھا۔ شیخ جی کا کارٹون دیکھنے کے لئے اسے کتنی بار لیمپ کی روشنی تیز کرنی پڑی تھی اور کتنی دیر وہ خیالوں میں کھویا رہا تھا۔ نہ ان سے روشنی بجھنی تھی اور نہ ان کا پانی بند ہوا تھا۔

کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ ہوا تھا تو یہ کہ شیخ جی کی عزت اپنے گھر میں دو کوڑی کی نہ رہی تھی۔

مہینے کی آخری تاریخ تھی اور جمعرات کا دن۔ شیخ جی سہ پہر کے وقت اپنے دفتر کے سامنے باہر سڑک پر قطار اندر قطار کھڑے بھکاریوں اور بھکارنوں کو ایک ایک پیسہ اور ایک ایک مٹھی میٹھے چاول خیرات کرکے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ احاطے کے اندر کونے والی آبادی سے شور اٹھا۔ امداد کے مکان کے ساتھ دائیں طرف کوئی پندرہ بیس چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ مکانوں کو شیخ جی کے بیسیوں مزدور بڑی تیزی سے ڈھا رہے تھے۔ ادھر گرد کے بگولے اٹھ رہے تھے اور کوٹھڑیوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے بیوی بچوں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں جو اپنے ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے صندوقوں اور مٹی کے برتنوں کے پاس کھڑے تھے۔

یہ غریب گھرانے شیخ جی کے باپ کے وقت سے یہاں بستے آ رہے تھے۔ جب تک وہ جیتا رہا یہ لوگ اطمینان سے رہتے تھے لیکن پچھلی گرمیوں کے شروع میں اس کے مرنے کے چند ہی دن بعد سے یہ جگہ خالی کرنے کو کہہ دیا گیا۔ برسات کے پہلے مکانوں کی مرمت نہ ہوئی۔ بجلی کا کنکشن کٹ گیا۔ پانی بند ہو گیا۔ غلاظت کے ڈھیر ہفتوں ان کے دروازوں کے سامنے لگے رہے۔ شیخ جی نے سارے عام ہتھکنڈے استعمال کر لیے لیکن ان کی بے چارگی کے سامنے کوئی پیش نہ چلی۔ آخر انھوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلایا۔ اور بہت بے دریغی سے چلایا۔

شام کے قریب کوٹھڑیوں کے مزدور احاطے میں آئے لیکن ان سے پہلے وہاں لاٹھیوں والے باوردی سپاہی پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے شیخ جی سے بات کرنی چاہی تو انھیں غنڈے اور بدمعاش کہہ کر دھتکار دیا گیا۔ ادھر اس سردی سے کانپتے ہوئے خانماں برباد قافلے نے میونسپلٹی کے باغ میں ڈیرہ ڈالا ادھر احاطے کے کونے والے میدان کے سینے سے انسانی آبادی کا داغ مٹ گیا۔ کمیٹی کے نلکے کے پاس احاطے میں کچھ بیشمار کریلوں اور سیڑوں کے ساتھ ملبے کے کئی ڈھیر نظر آ رہے تھے۔

رات دفتر بند کرنے سے پہلے شیخ جی نے ایک مہینہ کا پیشگی کرایہ تین سو روپے اکبر خاں پٹھان سے وصول کر لیا، جو احاطے میں مزدوروں کی آبادی والی جگہ پر لکڑی کا بہت بڑا ٹال کھولنا چاہتا تھا۔

امداد دفتر سے واپس آیا تو گیلری اور چھجے کے درمیان سیڑوں کے اونچے سلسلے کے پاس کھڑی اس کی ماں

...کہا۔ انتظار کر رہی تھی۔ امداد بیٹا تمہاری پھوپھی سخت بیمار ہے۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں اور شاید رات
تو وہاں ہی ٹھہرنا پڑے۔ دروازہ [illegible] پر [illegible] ہے۔"

چائے پینے کے بعد وہ [illegible] کاغذ کا ٹکڑا اس کے پاؤں میں آ گرا۔ گیلری میں کھڑی
حالدہ مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

[illegible] انتظار کرو [illegible] دروازہ کھلا رکھو"

[illegible] تھی
[illegible] تھی۔
[illegible]
[illegible] آ رہی ہے تو وہ آ
آپ [illegible] زیادہ [illegible] کر دوں۔

حالدہ [illegible] چل ہے گا [illegible]
[illegible] امداد اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا
[illegible] گھڑی پر نظر ڈالی گیارہ بج کر [illegible] منٹ ہو رہے تھے [illegible]
[illegible] آہستہ سے دروازہ کھولا [illegible] کی طرف جھکا۔ وہ [illegible]
واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا لیکن الفاظ [illegible]

حالدہ گیلری سے [illegible] کے پاس کھڑی تھی۔ دروازہ بند کر کے
لیمپ بجھا دو۔ روشنی باہر آ رہی ہے [illegible] امداد کو اپنی حماقت پر پشیمانی ہوئی۔
[illegible] کا سہارا لے کر [illegible] پر پاؤں [illegible] حالدہ اوپر چڑھ آئی اس نے [illegible] دروازہ
کھولا اور اندھیرے کمرے میں داخل ہو کر آہستہ سے کواڑ بھیڑ دیئے۔

"اب لیمپ جلا دو امداد۔" اس نے لمبا سانس لیتے ہوئے اور گردن کے گرد شال لپیٹتے ہوئے کہا۔

امداد دیا سلائی پر بار بار رگڑتا تھا لیکن وہ نہ جلتی تھی۔
"مصالحہ والا سرا تمہارے ہاتھ میں تو نہیں" حالدہ نے کہا۔

"اوہ"! امداد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

آخر دیا سلائی جلی۔ لیمپ روشن کرتے وقت امداد کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"سردی میں میں آئی ہوں اور کانپ تم رہے ہو" خالدہ نے پلنگ کے سرہانے بیٹھ کر لحاف اوڑھتے ہوئے کہا۔

"نہیں... وہ ..... بس... ٹھیک ہے" امداد دونوں ہاتھ بغلوں میں دبا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

خالدہ نے پائنتی سے کمبل اٹھایا اور امداد کے گھٹنوں پر ڈال دیا۔ پھر اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولی۔

"امداد! اگر اب تمہاری ماں آجائے تو؟"

"تو ہاں... تو پھر کیا ہوگا.... تمہیں بتاؤ ہم کیا کریں گے؟" امداد کے لہجے میں انتہائی لجاجت تھی۔

ایک شرارت آمیز تبسم خالدہ کے لبوں پر آیا۔ اس نے امداد کا ہاتھ اس کی بغل سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"تمہارا ہاتھ تو اتنا گرم ہے ..... پہلے کسی لڑکی سے تنہائی میں نہیں ملے شاید!" اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ "گھبراؤ نہیں امداد۔ میرے ابا آجائیں یا تمہاری ماں آجائے نہیں کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا" پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولی۔ "اور سنو وہ تصویریں پسند آئیں کیا؟ تصویریں کھینچنا میرا پرانا شغل ہے اور پانچویں جماعت سے اس سال آرٹ اسکول چھوڑنے کے بعد تک بھی میں برابر تصویریں کھینچتی رہی ہوں۔ بس تو سمجھتی ہی دو چیزوں کے سہارے پر ہوں امداد۔ ایک مصوری دوسرے موسیقی۔ اور پھر دنیا میں شکلوں اور آوازوں کے سوا اور ہے ہی کیا!... لیکن غالباً تمہیں تو کوئی دلچسپی......" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر جواب کی امید میں امداد کی طرف دیکھا جس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں۔ ہاں ہاں مجھے پتہ تھا تمہیں ان باتوں سے لگاؤ نہ ہوگا۔ اس میں تمہارا قصور نہیں امداد۔ ایک تو یہ قدرتی بات ہے دوسرے تم میٹرک کے بعد ہی دفتر میں جا بیٹھے۔ پر میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں گی کہ میں نے خاکہ کشی کیسے شروع کی۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی کہ ایک دن اگلے بنچ پر بیٹھی ہوئی سہیلی سے بات کرنے کے جرم میں میری استانی نے پورے زور سے ایک چپت میرے دونوں گالوں پر جما دی۔ تم تو سوتے جا رہے ہو امداد؟"

"نہیں نہیں میں جاگتا ہوں"۔ امداد نے کہا۔ پھر خالدہ کو ہنستے دیکھ کر وہ ایک مصنوعی ہنسی ہنسا۔

"ہاں تو استانی نے بڑی سخت سزا دی مجھے۔ میں نے گھر آکر اس کی تصویر کھینچی۔ اس کا جسم خاصا بھاری تھا۔ میں نے ایک بے تحاشہ ابھری ہوئی توند زنانہ لباس میں لپیٹ دی اور نیچے لکھ دیا "ڈرم بی بی" اگلے دن

صبح سویرے میں وہ خاکہ گوند سے سکول کی حاضری کے بڑے تختے پر چپکا کر واپس آگئی پھر میں اس سکول میں رہ گئی مگر میری ایک سہیلی راشدہ نے مجھے بتایا کہ اسکے بعد اسکول بھر میں وہ استانی ڈرم بی بی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ کمروں میں دیواروں پر جگہ جگہ ڈرم بی بی لکھ دیا جاتا تھا اور کیا لڑکیاں اور کیا استانیاں سب ہی ہنستی تھیں۔ آخر کچھ عرصے بعد وہ بے چاری کسی دوسرے اسکول میں چلی گئی۔ دوسری تصویر میں نے راشدہ کی بنا لیکن اس میں مذاق نہیں تھا محبت تھی۔ بڑی پیاری تصویر تھی وہ۔ آج سے دو سال پہلے راشدہ نے اپنی ایک سہیلی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہے خالدہ۔ خاکے کھینچتی بھی ہے اور اُڑاتی بھی ہے۔ اس سے بچیا" اس کی یہ بات مجھے پسند آئی۔ میری تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔ میں جس سے نفرت کرتی ہوں اس کا خاکہ اُڑاتی ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے اس کا خاکہ کھینچتی ہوں۔"

"تم نے شیخ جی کا خاکہ اڑایا ہے نا؟" امداد نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں مجھے ابا کی دو باتیں بہت بری لگتی ہیں ایک وہ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں دوسرے پیسے کا بہت لالچ ہے انھیں۔"

"اور میرا خاکہ کھینچا تم نے ؟" امداد نے کہا۔

"ہاں کھینچا تھا اس لئے کہ تم مجھے اچھے لگے تھے اس لئے نہیں کہ تم میرے ابا کو برا جانتے ہو" خالدہ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر جواب دیا جیسے اس نے کوئی بہت ہی حقیر بات کی ہو "وہ تمھیں کیوں برے لگتے ہیں امداد؟"

"شیخ جی نے ہم پر ایک نہیں بیشمار زیادتیاں کی ہیں۔ کئی باتیں میں نے ماں کی زبانی سے سُنی..."

"کوئی اچھی بات کرو امداد!" خالدہ نے مسکراتے ہوئے بات کاٹی۔ وہ ایک کہنی تکیے پر ٹیک کر نیم دراز ہو گئی اور اس نے بازو پھیلا کر دوسرا ہاتھ امداد کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"احاطے کے سب لوگ شیخ جی کی شکایتیں کرتے تھے لیکن ہمیں کبھی یقین نہ آتا تھا۔ آخر شیخ جی نے ہم سے دعدہ خلافی کی اماں سے نیا کرایہ نامہ لکھوا کر بھی ہمارے زینے اور چھت کی مرمت نہ کروائی۔ پھر ہمارا بجلی کا کنکشن کٹوا دیا۔ بعد میں تو خیر ہم صبح شام اترنے چڑھنے کے عادی ہو گئے تھے اس وقت میں نے یہی طریقہ نکالا کہ وہ انتہائی شکستہ زینہ جو چڑھتے وقت تیسرا اور اترتے وقت گیارھواں تھا چھوڑ دیا جائے جس دن

کشمکش کھا اُس رات زینہ سے اُترتے وقت میں گنتی بھول گیا اور ایک زیادہ گن گیا۔ میں نے دسویں زینے کو گیارہواں گن کر چھوڑ دیا اور ٹانگ آگے بڑھا کر اگلے زینے پر قدم جمانا چاہا لیکن وہ تو تھا ہی برائے نام۔ میری زبان پڑ گیا...... ر..... تھا اور میں قلابازیاں کھاتا سائیکل والے کھڈ کے سامنے جا ٹھہرا۔"

خالدہ ہنسی ضبط نہ کر سکی اور اُس نے اپنا منہ لحاف میں چھپا لیا۔ قدرے توقف کے بعد بولی "پھر"؟

"پھر کیا مجھے چوٹیں آئیں اور اگلے دن مجھے شیخ جی سے لڑنا پڑا۔ ابا۔ امی۔ پھوپھی سب نے کہا کہ شیخ جی سے ذرا بات تو کرو۔"

"میں سمجھتی تھی تم خود لڑنے گئے" خالدہ نے کہا۔ "تم نلکہ بند ہو جانے پر خاموش رہے غالباً میرے خیال سے"؟

"نہیں ماں کے کہنے پر" ایک لمحہ رک کر بولا۔ "اور ہاں تمہارا خیال بھی تو تھا۔"

خالدہ نے بولنے سے سر جھٹکا۔ شال سرک کر اس کے کندھے پر ڈھلک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔ "اس شام کے بعد تم کمیٹی کے نلکے پر پھر کبھی نہ نہائے۔"

"ماں نے منع کر دیا تھا۔ وہ کہتی تھیں تم مجھے نہاتے دیکھ رہی تھیں۔"

"تم اپنی ماں کے کتنے اچھے بیٹے ہو امداد!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "کاش میں بھی اپنے ماں باپ کی اتنی اچھی بیٹی ہو سکتی جس کی مرضی کے خلاف میں آرٹ اسکول میں داخل ہوئی۔ جس نے مجھے خوش رکھنے کے لئے اور دولت مند ہونے کے باوجود میری امی کے مرنے کے بعد مدت تک دوسری شادی نہ کی اور اگر کی تو میری سگی بیوہ خالہ کے ساتھ جو میری اتنی ہی ہمدرد ہے جتنی میری امی تھی۔ یا جتنی تمہاری ماں تمہاری ہے۔ کاش میں اس باپ کی اتنی اچھی بیٹی ہوتی جس کی اجازت کے بغیر میں اب بھی آرٹ اسکول میں پیانو بجانے اور سینما دیکھنے چلی جاتی ہوں۔ اور جس کے علم کے بغیر میں اس وقت تمہارے پاس بیٹھی ہوں......"

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے کہنی نیچے سے نکال کر سر تکیے پر رکھ دیا۔ اس کے کھلے سیاہ چمکیلے بال پلنگ سے نیچے لٹک رہے تھے اور فرش کو چھو رہے تھے۔ اور وہ بڑی بے چینی کے ساتھ بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ان میں کنگھی کر رہی تھی۔

"ٹوں..... ٹوں ٹوں...... ٹوں..." باہر سے ایک سریلی آواز کمرے کی خاموشی کو توڑتے ہوئے اندر آئی۔ امداد جلدی۔

خالدہ نے اسی طرح لیٹے لیٹے امداد کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے حسین چہرے پر حسرت چھا رہی تھی۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد اس کے لب کھلے۔ "امداد تم اپنی ماں کے بہت ہی اچھے بیٹے ہو۔ لیکن کاش تم اپنی ماں کے اتنے اچھے بیٹے نہ ہوتے! ... تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"یہ"۔ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹوں ... ٹوں ..." باہر سے آواز آ رہی تھی۔

خالدہ اٹھی اور دوشالے کو کندھے پر ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی پھر امداد سے کہنے لگی۔ "لیمپ بجھا دو اور باہر آ جاؤ۔"

کمرے میں ایک بار پھر اندھیرا ہو گیا۔ خالدہ اور امداد صحن کے دروازے میں جا کھڑے ہوئے جہاں ٹال کی ٹکٹکی کا دیکھا سلسلہ اس سے مخمور رہا تھا۔ تاکہ ایک ماں ٹال کے کونے میں لکڑی کے جھونپڑے کے نیچے رکھے ہوئے تخت پر بیٹھا دنیا و مافیہا سے بے خبر رباب بجا رہا تھا۔ اور اس کے پانچ سات ملازم تخت کے دائیں بائیں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس پر بیٹھے پرانے کمبلوں میں بڑے سو رہے تھے۔ حقہ سامنے پڑا تھا۔ اس کی لے خان کی ٹھوڑی کے ساتھ لگی ہی تھی اور پیچھے دیوار میں کا دیا دھرا تھا۔ اس کی اندھی روشنی میں خان کا سرخ چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور گول کلاہ کے اوپر پیچ دار پگڑی میں تعویذوں کا گچھا چمک رہا تھا۔

"یہ اکثر رات کو اور صبح کے وقت ایسے ہی ٹوں ٹوں کرتا ہے۔" امداد نے خالدہ کو مطلع کیا۔

"اچھا!" خالدہ نے دلچسپی ظاہر کی۔

"عجیب چیز ہے یہ پٹھان بھی۔" امداد نے کہا۔ "اس کا حال ذرا ذرا تو لطف آتا ہے۔"

خالدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ چھجے سے اتر کر سیڑھیوں کے نیچے پہ اور وہاں سے گیلری میں چلی گئی۔

امداد سمجھ گیا کہ وہ کتنا غیر محتاط تھا کہ چھجے پر کھڑے ہو کر اتنی باتیں کرتا تھا۔

اس رات خالدہ کے جانے کے بعد امداد نے ارادہ کیا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ لکھ کر ضرور گیلری پر پھینکے گا۔ اور وہ اس کی باتیں کہنے میں کوئی شرم یا جھجک محسوس نہیں کرے گا۔ لیکن صبح جب وہ سو کے اٹھا تو اسے رات والی بات پر ہی پشیمانی ہونے لگی۔ اور جب اس کی ماں اس کی پھوپھی کے گھر سے واپس آگئی تو یہ پشیمانی

پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔

رات والی بات کا پتہ ماں کو چل گیا تو کیا ہوگا —؟ کیا سامنے فیروز کے گھر والوں نے انہیں دیکھ تو نہیں لیا تھا — ، کیا ٹال والے پٹھان نے اس وقت جان بوجھ کر رباب کے تاروں کو نہیں چھیڑا تھا —؟ .... امداد دفتر میں فائلیں آگے رکھے بیٹھا تھا اور طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں آرہے تھے۔ اور اس نے خدا کا ہزار شکر کیا۔ جب دفتر سے واپس آنے پر اس نے اپنی ماں کے رویے میں کوئی بات معمول کے خلاف نہ دیکھی۔

• خالدہ کو امداد کے پاس آئے ڈیڑھ مہینہ گذر چکا تھا۔ اس عرصے میں نہ تو کوئی کاغذ کا ٹکڑا اسکی طرف پھینکا گیا تھا اور نہ کوئی مشتاق نظر ہی اس پر ڈالی گئی تھی۔

آخر ایک طویل کشمکش کے بعد موت اس کی پھوپھی کو زندگی کے ہاتھوں سے چھین کر لے ہی گئی۔ اسے دفن کر کے گھر پہنچا تو شام ہو گئی تھی احاطے میں گزرنے کی راہ نہ ملتی تھی۔ کوئی پندرہ بلیں بیل گاڑیاں لکڑی سے لدی ہوئی ریں ریں چیں چیں کرتی باہر نکل رہی تھیں۔

ماں کچھ روز گھر سے باہر رہے گی کیا پتہ آج خالدہ پھر آجائے لیکن شاید اسے معلوم نہیں کہ میں اکیلا ہوں...... وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کرسی سے اٹھا۔ کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ کر ایک ٹھیکری اس میں لپیٹ دی اور موقع کی تلاش میں وہ چھجے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دائیں طرف نظر ڈالی تو سوائے چھجے کے ساتھ والے اونچے سلسلہ کے اسے ٹال میں کہیں لکڑی دکھائی نہ دی۔ اس نے کاغذ پھینکنے کے لئے بازو اوپر اٹھایا ہی تھا کہ سامنے والے مکان کی کھڑکی کھلی اور فیروز نے کھانستے ہوئے نیچے گلی میں تھوکا۔

امداد کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ ٹھیکری نیچے گر پڑی تھی اور کاغذ اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ وہ گھبرا کے کمرے میں آگیا تھا اور اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

اس کے دم میں دم آیا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اس نے پھوپھی کی موت کا بھی خیال نہ کیا۔ اور ایسے رنجیدہ موقع پر ایسی لایعنی حرکت کی۔

• پھر کچھ دیر بعد اُسے خیال آیا خالدہ کا غذ اس وقت پھینکتی تھی جب وہ چھجے پر موجود ہوتا تھا اور اس نے

تو کاغذ کا گولہ یوں ہی گیلری پر دھرا رہ گیا تھا۔ کیونکہ خالدہ وہاں نہ تھی۔ فیروز کی کھانسی فی الحقیقت ندائے غیب تھی۔

"ٹوں.... ٹوں ٹوں.... ٹوں...." شاں وان پٹھان رباب بجا رہا تھا۔

اگلی صبح نیچے احاطے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ امداد نے گھبرا کر لحاف ایک طرف پھینکا اور بیتابانہ اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔ گلی میں نکلنے پر اس نے شیخ جی کو زینے کے پاس پڑے ہوئے دیکھا۔ لوگ انہیں اٹھانے اور بازوؤں پر اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھے [illegible] خالدہ کی حالت [illegible] شیخ جی کی پگڑی سے لپٹی جھانک رہی تھی اور رو رہی تھی۔

فیروز [illegible] کہہ رہا تھا۔ "کچھ نہیں جی [illegible] عزت خاک میں ملا دیتی ہیں۔ [illegible] روپیہ اور زیور تو [illegible] تمہارے [illegible]"

امداد کے پاؤں سے جیسے کانپنے لگے۔

"ہائے خالدہ میں نے تیری بات کیوں نہ مانی۔ خالدہ!" شیخ جی ہوش میں آگئے تھے اور لوگ انہیں سنبھالے ہوئے ان کے مکان کے قریب لے جا رہے تھے۔ خالدہ کی ماں نے پہلے [illegible] کا کاغذ زمین سے اٹھا لیا جو شیخ جی کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

امداد حیران و سرگرداں تھکے سے بستر کر پلنگ پر آ بیٹھا۔ وہ باہر دیکھ رہا تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر احاطے کے مکانوں کی کھڑکیوں میں سے بیسیوں لوگ نیچے جھانک رہے تھے۔ پھر اچانک اسکی نظر نیچے فرش پر پڑی۔ وہ بستر کے پاس ایک پیکٹ سا پڑا تھا۔ اس نے اسے جلدی اٹھا کر دروازہ بند کر لیا۔ پھر لیمپ جلا کر ریشمی ڈورے کے بند کھولے۔ ڈرائنگ پیپر کے دو ورق تھے ایک پر کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی اور دوسرے پر ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔

تصویر میں شیخ جی اور شاں وان پٹھان دکھائے گئے تھے۔ شیخ جی کارٹونی شکل میں تھے اور پٹھان اپنی صحیح صورت میں۔ درمیان میں ایک کمسن بچہ الٹا دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ اس کا سینہ پیٹ اور گھٹنے زمین سے لگ رہے تھے اور اس کے ننھے ننھے پیر ہوا میں لہرا رہے تھے۔ لیکن اس کے ننھے سر والی گردن اوپر اٹھی ہوئی

اور اُس کا چہرہ . . .   اب وہ تو امداد کا اپنا تھا . . . . . اس کے ہاتھ کانپنے لگے ۔ اور اُس کے کانوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگیں ۔ اُس نے چاہا کہ وہ کاغذ کو پھاڑ دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اور اُس کی نظریں تصویر پر گڑی رہیں نیچے کی دبی سی کمر پر ایک پاؤں رکھے خالدہ شیخ جی کی طرف سے ٹال والے اکبر خاں کی طرف قدم بڑھا رہی تھی ۔ اس طرح کہ اُس کے آنچل کا پلو شیخ جی کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ پٹھان کے مضبوط آہنی ہاتھوں میں جکڑے ہوئے تھے ۔

ڈرائنگ پیپر کے دوسرے ورق پر لکھا تھا ——

"امداد تم اپنی ماں کے جتنے اچھے بیٹے ہو افسوس میں اپنے باپ کی اتنی اچھی بیٹی نہ ہو سکی ۔ اکبر خاں بُرا نو تمھیں لگا لیکن تم نے اس کا مذاق اڑا لے میں میری مدد مانگی ۔ تمھیں یاد ہو گا ۔ میں نے تمھارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا ۔ میں نے کبھی کسی کے کہنے پر کسی کا خاکہ نہ اڑایا ۔ تم نے میری توہین کی میرا خیال ہے تمھارا خاکہ اڑانے میں میں نے زیادتی نہیں کی ۔

تمھاری زینے والی کہانی مجھے بہت اچھی لگی ۔ تم بچوں کی طرح گرنے سے ڈرتے تھے لیکن تم نے دیکھ لیا کہ تم گرنے سے بچ نہ سکے ۔ اس پر بھی تم نے کچھ ۔ سیکھا ۔ شکستہ زینے کا خیال تمھارے حواس پر چھایا رہتا تھا ۔ کیونکہ تم اسے ہر بار چھوڑ دینا چاہتے تھے اگر تم ہر زینے پر احتیاط سے پاؤں رکھتے اور اسی طرح ٹوٹے ہوئے زینے پر بھی قدم جمانے کی کوشش کرتے تو کبھی نہ گرتے . . . . . میری طرف دیکھو تم کچھ کم شکستہ نہ تھے ۔ مگر میں تم پر احتیاط سے قدم رکھ کر جرأت سے آگے نکل گئی ہوں ۔

تمھارا تجربہ میرے کام آیا . . . . . بہت بہت شکریہ ۔"

کرشن چندر

چور

وہ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے اُسے دیکھ کر ناگہانی کراہیت محسوس ہوئی۔ میلی چکٹ قمیض گندی تار تار پتلون۔ جگہ جگہ مٹی کے دھبے جیسے وہ غسل سے اس پتلون میں زمین پر سو رہا ہے۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور رخسار اندر کو پچکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ایک غیر معمولی غیر صحت مند چمک تھی جیسے وہ آنکھیں ہانپ رہی ہوں جیسے ایک جنگل ہو چاروں طرف بھیڑیئے ہوں۔ اور بیچ میں ایک ہرن ہو۔ مگر ہرن تو بہت خوب صورت ہوتا ہے مگر اس آدمی میں خوب صورتی نرمی ملائمیت نام کو نہ تھی۔ اُس کی سوکھی دبلی پتلی گردن پر میل کی اتنی پرانی تہیں جمی تھیں کہ اُنہیں کھرچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ممکن ہے میل نے جلد کو کھا لیا ہو، جیسے زنگ لوہے کو کھا ڈالتا ہے۔ آپ نے میل کو ناخن سے ذرا سا کھرچا اور اندر سے جلد کے بجائے خون نکل آیا۔ کچھ ایسا احساس مجھے اس کی گردن، چہرے اور ہاتھوں پر میل کی تہوں کو دیکھ کر ہوا اور میں دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ کیا حرج تھا اگر وہ لیمن رنگ کا فیتا کا فراک پہنے ہوئی خوبصورت لڑکی میرے پاس بیٹھ جاتی۔ یا وہ نائلون ساڑھی سے چھن کر نظر آنے والی عورت، جیسے پھٹی ہوئی بدلی میں مہتاب، اس سے تو آنکھوں میں کاجل اور بالوں میں ورنی اور دماغ میں چابیوں کا گچھا چھپائے ہوئے وہ گجراتی لڑکی ہی بہتر تھی جسے میں نے کسی بہتر شخص کی تلاش میں اپنے دل ہی دل میں رد کر دیا تھا لیکن یہ داڑھی بڑھائے ہوئے دبلا پتلا زرد رو مرد کھانستا اور چونکہ میں کھڑکی کی طرف تھا بلکہ کھڑکی میری طرف تھی اسلئے وہ کھڑکی سے باہر تھوکنے کے لئے میری جانب جھکا۔ اور تھوک کر جب واپس لوٹا۔ اور مجھے اس کے جسم پر سے کہیں سے کیڑے سے چھترانے کی آواز آئی۔ اور پھر مڑ کر جب میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ تو معلوم ہوا کہ جہاں جہاں اُس کا کپڑا میرے بدن کے کپڑوں سے چھو گیا تھا،

غلاظت کی دھاریاں بناتا چلا گیا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میری قمیض سپید براق تھی، اور اب دھاری دار، ایک لمحہ پہلے میری پتلون کریم رنگ اور امریکی شارک سکن کی تھی اور اب بھورے کھدر رنگ کی۔ ایک غریب آدمی ساری بس کو کیسے گندہ کرتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہی ہوا۔ آخر یہ گورنمنٹ غریب دیہاتیوں کے لئے الگ بسیں کیوں نہیں چلواتی؟ کس لئے ہم سے یہ انکم ٹیکس لیتی ہے؟

میں نے ذرا گھور کر اس مفلس آدمی کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب میں اور بھی زیادہ گھور کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی خشمگیں چمک اور ابھر آئی۔ اور پتلی گردن کا ٹینٹوا اوپر نیچے حرکت کرنے لگا۔ اتنے میں بس کنڈکٹر قریب آیا۔ دبلے پتلے ہمراہی نے اپنی پتلون کی جیب سے ٹٹول ٹٹول کر ایک اکنی نکالی اور اندھیری کا ٹکٹ لے لیا۔ یہ اندھیرا اندھیری تک میرے ساتھ رہے گا، کم بخت۔ اسے میری سیٹ ہی پر بیٹھنا تھا؟ کتنی خوب صورت بس ہے۔ جسٹ کیسے نازک خطوط اور اس طرح سبک رفتار، سبز رنگ سیٹیں اور نیلے رنگ کی دیواریں اور سپید روشنی کی ٹیوبیں جن سے نافیٹا کا ھورا رنگ اور نائی لان کا شفاف پن اور لپ اسٹک کا گہرا سرخ رنگ چمک اٹھتا ہے۔ اس بس میں ایسا آدمی میرے پاس بیٹھا ہے! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے فٹ پاتھ سے کوڑا کرکٹ اٹھا کے میری سیٹ پہ ڈال دیا ہو۔ انتہائی بدمذاقی ہے یہ۔ اُفوہ!

میری مصیبت یہ ہے کہ میں ایک خوش ذوق آدمی ہوں۔ میں گاڑی میں کیڈی لیک کو، گیبرڈین کو، شارک سکن کو اور ادب میں دوامی قدروں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مگر یہ زندگی یہ دنیا ایسی ہے کہ اکثر میرے جذبات مجروح کرتی رہتی ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ میں نے اپنی گود میں لیٹی ہوئی کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور اس کے صفحات میں پناہ دی۔ یہ ایک خوب صورت فرانسیسی ناول تھا جس میں ایک بیٹی اپنے باپ کی محبوبہ سے رقابت محسوس کرتی ہے اور ایسے اقدامات کرتی ہے جن سے اس کے باپ کی محبوبہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے ——— یعنی کس قدر زندگی کی ابدی قدروں سے بھرپور ناول تھا یہ۔ ابھی میں اس کے دو ایک صفحے ہی پڑھ سکا تھا کہ اگلے بس اسٹاپ سے مسافروں کا ایک ریلا اندر آیا۔ اور بس اس کونے سے اس کونے تک کھڑے ہوئے زور زور سے باتیں کرنے والے مسافروں سے بھر گئی۔ میں نے گھبرا کر کتاب بند کر دی، یہ لوگ پڑھنے بھی

دیں گے۔ اب تو میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ کہ پہلو زندگی کی چلتی پھرتی عارضی قدروں کی سے
ہی بھلا لیا جائے۔

بے چارہ بس کنڈکٹر جلدی جلدی اپنے مسافروں کو بھگتانے میں مصروف تھا۔ پیسے لے رہا تھا،
ٹکٹیں کاٹ رہا تھا اور پیسے دے رہا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے بس سٹاپ پر سیٹی اور تیزی سے ٹکٹیں
دے کر گھنٹی بجانے میں مصروف تھا۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ سہارنپور یا میرٹھ کے علاقے
کا ہے۔ اس کے سر کی ٹوپی ایک طرف کو کھسک گئی تھی اور جیسے نیچے چپکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔
خاکی کوٹ کے دو بٹن ندارد تھے اور پتلون پر ... طرح سے لکھی تھی جیسے ... کی سے علامت
ہے۔ یہ سب دیکھ کر بالکل حیرت نہیں آتی تھی اس سلسلے میں ایک خاص طرح کی لطافت تھا
اسے دیکھ کر اس ایک عجیب طرح کی مایوسی اور محرومی کا احساس ہوتا تھا۔ خیال آتا تھا کسی کھوئے ہوئے
جانور کا کسی گھرے ہوئے شہر کا اسی سوکھے ہوئے درخت کا، کسی ناموزوں مصرعے کا خیال آتا تھا
جس کی جڑیں اکھڑ رہی ہوں اور اس پتوں کا جو اس کی گرد تکلیف دہ دلیوں کا اور بے کس
جانوروں کا جو موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ مانگ کر کسی پیپل تلے جھنڈی چھاؤں تلے ہانپتے
ٹھہرے رہ جاتے ہیں۔ یہ بس کنڈکٹر بھی اس وقت اسی طرح ہانپ رہا تھا۔ پسینہ اس کے ماتھے
سے گر رہا تھا ہمارے پیچھے کی سیٹ پر دو نوجوان بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ
دیا اور دو ٹکٹ مانگے۔ کنڈکٹر نے جلدی سے دو ٹکٹ کاٹ کے ان کے حوالے کئے اور جب اس
نوجوان نے باقی پیسے مانگے۔ تو کہا۔ ابھی دیتا ہوں۔ اور جلدی سے ان دو آدمیوں کے ٹکٹ کاٹنے میں
مصروف ہو گیا جو اگلے اسٹاپ پر دروازے سے باہر جانے والے تھے۔ پتہ ہوا اس نے انہیں دو کے
دو ٹکٹ دے دیے۔ ورنہ وہ تو مفت کی سواری کر گئے تھے۔ وہاں سے بے چارہ بس کنڈکٹر جو لوٹا۔
تو اسے ایک موٹے سندھی نے گھیر لیا اور اسے دو روپئے دیئے۔ اور دو آنے کا ٹکٹ مانگی۔ اتنے میں
اگلا اسٹاپ آ گیا۔ اور بس کنڈکٹر جلدی سے سب کام چھوڑ کر بس کے دروازے پر لپکا۔ کہ لوگوں کو
اندر آنے سے روکے۔ کیونکہ بس بھر چکی تھی۔ یہاں پھر دو آدمی اتر گئے۔ اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت
ایک بچے کو انگلی سے لگائے اندر داخل ہوئی۔ عورت چونکہ بھدی، موٹی اور بدصورت تھی۔ اسلئے

بس میں کوئی مرد اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُسے سیٹ دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ نہ ہی کسی نے اُس کے بدصورت بچّے سے پیار کیا۔ اگر اُس کی جگہ کوئی خوبصورت عورت ہوتی، یعنی زندگی کی دوامی قدر ہوتی۔ تو چار چھ لوگ اُس کے اندر آتے ہی اپنی سیٹ اُس کے لئے خالی کر دیتے۔ پھر وہ ایک جگہ بیٹھ جاتی تو کوئی اُس کے بچے کو اپنی گود میں لے لیتا۔ ارے کس قدر پیارا بچّہ ہے۔ اُسے چومتا چاٹتا۔ لالی پاپ اور اس طرح پیار ظاہر کرتا کہ دراصل وہی اُس بچے کا باپ ہے۔ کئی لوگ تو اس موقع پر بچے کو گود میں لئے وہیں اتر جاتے ہیں جہاں اُس خوب صورت عورت کو اترنا ہوتا ہے اور باتیں کرتے ہوئے بچے اور اُس کی ماں کو گھر تک پہنچا کے آتے ہیں اور لگتے ہات کی دعوت قبول کر کے آتے ہیں۔ مگر یہاں تو کچھ نہ ہوا۔ بدصورت عورت، بدصورت بچّہ۔ دونوں بھیڑ میں کھڑے رہے اور دوسرے مسافروں کے دھکے کھاتے رہے۔ بس کنڈکٹر نے لوٹ کر موٹے سندھی کو ایک روپیہ بارہ آنے دیئے۔ اُس بدصورت عورت اور اُس کے بچے کا ٹکٹ کاٹا۔ پھر اُسے یکایک خیال آیا کہ اُسے کسی اور آدمی نے بھی ایک روپیہ دیا تھا۔ اور اُس میں سے اُسے تیرہ آنے واپس کرنے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے چرمی تھیلے سے تیرہ آنے نکالے اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سوکھے پتلے چمرخ آدمی کی ہتھیلی پہ رکھ دیئے۔

ایک لمحے کے لئے چمرخ آدمی کی آنکھوں میں حیرت جھلکی، پھر غائب ہو گئی۔ دوسرے لمحے میں اُس کے ہاتھ نے زور سے اُن تیرہ آنوں کو اپنی مٹھی میں چھپا لیا۔ اب مٹھی اُس کی پتلون کی جیب میں چلی گئی تھی۔ اور وہ تن کر سیدھا بیٹھ گیا۔ اور اپنے بالکل سامنے دیکھنے لگا، جیسے اُسے اس پورے واقعے سے کوئی تعلق نہ ہو۔

پچھلی سیٹ کے دونوں نوجوان لیموزنگ ٹا فیتا کے فراک کو تعریفی نگاہوں سے تک رہے تھے۔ کب سے تک رہے تھے۔ کیسی خوب صورتی تھی اُن کی آنکھوں میں! کتنے ہی پھول کھلے تھے۔ کتنی بہاریں آئی تھیں۔ کتنے ہی آبشار گائے تھے۔ آرزوؤں کے کتنے ہی سمندر۔ خوشبوؤں کے کتنے ہی کھیت، خوابوں کے کتنے ہی سنہرے جال اُن آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ یہ آنکھیں جو دیکھتی ہیں، سنتی ہیں، بولتی ہیں اور انسانوں کے دل کی طرح دھڑکتی ہیں۔ ان جاننے والی

آنکھوں کی خوب صورتی کا جواب کس حسن کی رعنائی میں ہے؟ اُن دونوں نوجوانوں نے اپنے نوٹوں کو کسی دوسرے کی جیب میں جاتے ہوئے نہ دیکھا کیونکہ اس وقت اُن کی آنکھیں وہ دیکھ رہی تھیں جو تیرہ آنے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ روپیہ بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن وہ انسان کی آنکھ تو نہیں ہے۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحے کے حُسن نے کیا۔ دوسرے لمحے میں وہ لیمونگ ٹافٹیا فراک والی عورت اپنی سیٹ سے اُٹھی اور خراماں خراماں دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس کے ریشم کی سرسراہٹ ایک اُداس خوشبو کی طرح بس میں بکھر گئی۔ ایک شفق کی طرح چاروں طرف کھل اُٹھی۔ دوسرے لمحے میں سورج ڈوب گیا۔ اور بس میں تاریکی چھا گئی۔ مگر اُن دونوں نوجوانوں کو ایسا ہی محسوس ہوا۔ اُن کی نگاہوں میں رات چھا گئی چند لمحوں کے لئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن جب رات آئی تو یاد آئی۔ اور جب نوجوان نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ دیا تھا اسے شاید تیرہ آنے یاد تھے جو اُسے بس کنڈکٹر سے وصول کرنے تھے۔ یونہی ہوتا ہے۔ اس زندگی میں یونہی ہوتا ہے۔ جب خوب صورتی چلی جاتی ہے تو روپیہ یاد آتا ہے۔ جب محبت چلی جاتی ہے تو انتقام یاد آتا ہے۔ جب شباب گذر جاتا ہے تو اخلاق سر اُٹھانے لگتا ہے۔ جب زندگی سے اچھی چیزیں نکل جائیں تو صرف کمینہ حرکتیں باقی رہ جاتی ہیں —— اے میری پیاری لیمن ٹافٹیا تو کیوں اس بس سے اتر چلی گئی۔ اگر تو نہ جاتی تو پھر وہ تو نہ ہوتا جو اب ہوا۔ جو پہلے بھی ہوا تھا۔ جو آگے بھی ہوگا۔ تو کیوں نہ اس بس میں آکے بس گئی۔ تو نے کیوں نہ اس سے دوامی پیار کرلیا۔ اے میرے ابدی حُسن! تو کیوں ایک لمحے کی طرح آیا اور اک چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔

اے میاں افسانہ نویس! یہ کیا بکواس ہے۔ میں تمہاری پیاری لیمن ٹافٹیا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ جو لیمن ٹافٹیا ہے اصل میں اُس کا نام جوزیفائن گگرٹیل ہے۔ یہ باندرے کی رہنے والی ہے۔ اس کا باپ [illegible] خود یہ شراب بیچتا ہے۔ دو مرتبہ یہ جیل جا چکی ہے۔ ایک مرتبہ بچہ نکلوا چکی ہے۔ [illegible] عاشق ہیں۔ پاپو مرڈا نسنگ ہال میں ناچ سکھاتی ہے اور امیر سیٹھوں کے نوجوان چھوکروں کو اپنے جال میں پھنساتی ہے۔ ہر وقت پئے رہتی ہے۔ کچی پیاز کھانے

کا اسے اس قدر شوق ہے۔ اور تم اس کی خوشبوئیں بس میں بکھیر رہے ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ارے کچھ تو سچ بولو۔ میاں!

ارے رے رے تو کہاں سے آمرا۔ کم بخت میرے چلتے ہوئے افسانے میں بریک لگا دی۔ اُتر جا میرے بھائی۔ اپنے افسانے کی بس سے اُتر جا۔ میں اگر سچ بولوں گا۔ تو ایڈی قدروں والا افسانہ کیسے لکھا جائے گا۔ وہ خوبصورت دھندلا دھندلا پن جیسے کچھ ہے اور کچھ نہیں بھی ہے۔ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں بھی آتا ہے بلکہ اگر بالکل ہی نہیں آتا ہے۔ تو بہت ہی اچھا ہے۔ پھر میں وہ سب کہاں سے لاؤں گا۔ اتر جا میرے پیارے۔ دیکھ۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے پڑھنے والوں کو ڈھرے پر لگایا تھا۔ تو نے آکے سب گڑ بڑ گھٹالا کر دیا۔ کم بخت ..... گٹ آؤٹ!

پیچھے کی کھڑکی پر بیٹھے ہوئے نوجوان جس کا نام موتی تھا اپنی جیبیں ٹٹولیں اور پھر اپنے ساتھی سے پوچھا "گلشن تم نے باقی پیسے کنڈکٹر سے لیے؟"

اب کے گلشن نے اپنی جیبیں ٹٹول کر کہا "نہیں!"

"اچھی طرح سے یاد ہے؟"

"اس میں یاد کرنے کی کیا بات ہے؟ ہم دونوں اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔"

"اچھے موقع پر یاد آیا۔ ورنہ روپیہ گل تھا اسے مسٹر کنڈکٹر.....!"

مگر اس موقع پر پانچ چھ کنڈکٹر جو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہے تھے۔ تانتا کروز کے اڈے سے بس میں سوار ہو گئے۔ اور ان سب لوگوں میں باتیں ہونے لگیں۔ سہارنپوریا کنڈکٹر بہت پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ماں بیمار تھی جیسا کہ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا۔ اور تین چار روز سے وہ ایک دن کی چھٹی مانگ رہا تھا مگر اُسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے جو دوا تجویز کی تھی اُس دوا کے پیسے بھی اُس کے پاس نہ تھے۔ بھلا سات روپے کی دوا میں کہاں سے لاؤں گا۔ سو روپیہ تو صرف اپنی پگار ہے۔ سو روپوں میں بھی ہوتا کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے سو روپے کا بجٹ گن کر سنایا۔ یہ مہینے کے آخری دن تھے۔ اور اُس کی جیب بھی آخری لمحوں پر تھی۔ غریب آدمی

کی جیب ہر مہینے مرتی ہے زندگی میں ایک دو بار مرنا اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن ہر ماہ مرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ زندگی سے مذاق معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ جو سو روپیہ پلنے والے تو تھے ہی۔ اور ان کی اپنی بڑی مضبوط یونین تھی۔ جو بہت سی باتیں منوا بھی لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی اس قدر پریشان تھے۔ سہارنپور کنڈکٹر نے بات کیا چھیڑی گویا بھڑوں کا چھتہ چھیڑ دیا۔ سبھی کنڈکٹر اُبھر پڑے اور کمپنی کو گالی دینے لگے۔ زندگی سے، ماحول سے، نیچر سے، تم سے، مجھ سے، شکایت کرنے لگے۔ کیسے ناشکرے لوگ ہیں یہ۔ میں نے انھیں دیکھ کر سوچا۔ انھیں کمپنی سے باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے۔ وردی ملتی ہے۔ مہنگائی کا الاؤنس ملتا ہے۔ چھٹی ملتی ہے اور کیا چاہیے۔ انھیں تو موت۔ ان مزدور لوگوں سے آپ جتنا اچھا سلوک کرتے جائیں گے۔ یہ اتنا ہی آپ کے سر چڑھتے جائیں گے۔ اونہہ کمینے کہیں کے!

وہ سہارنپوریا کنڈکٹر کہنے لگا "بیچ جانو۔ جیب میں صرف ایک روپیہ پانچ آنے ہیں۔ سات روپے کے انجکشن کیسے آسکتے ہیں؟

اور ماں کی زندگی کا سوال ہے! کنڈکٹر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اے مسٹر کنڈکٹر!" موتی اپنی سیٹ سے پھر زور سے چلایا۔ "ذرا ادھر آنا بھائی!"

"کیا ہے؟"

"تم کو ایک روپیہ دیا تھا۔ ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ تم نے ہم کو دیا۔ ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ اس کو دیا۔ (گلشن کی طرف اشارہ کر کے) باقی تیرہ آنے لاؤ۔"

"تیرہ آنے تم کو نہیں دیئے؟" کنڈکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔ اُس وقت رش بہت تھا تم نے کہا۔ ابھی دیتا ہوں۔ ابتک تو دیئے نہیں۔ تین چار سٹاپ گذر گئے۔ اب لاؤ!"

یکایک بس کنڈکٹر کو کچھ یاد آیا، مگر اُسے یہ یاد نہ آیا کہ اُس نے کسے وہ پیسے دیئے ہیں۔ بولا۔ "مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے تمھیں پیسے دیئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر اُس نے گلشن کی طرف اشارہ کیا۔

گلشن نے سر ہلا کے کہا "تم نے مجھے پیسے نہیں دیئے۔"

"تو پھر میں نے تمہارے دوست کو دیے ہوں گے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔"

"تم نے مجھے بھی نہیں دیئے"۔ موتی نے غصّے سے چلاّ کے کہا۔

دو ایک اور بس کنڈکٹر آگئے۔ بولے "صاحب اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ اپنی جیب تو دیکھیے۔"

یہ سننا تھا کہ موتی اور گلشن دونوں کھڑے ہوگئے۔ دونوں نے اپنی پتلون کی جیبیں باہر نکال دیں جیبیں بالکل خالی تھیں گلشن نے ذرا اُداس لہجے میں کہا "ہم لوگوں نے نوبہار سٹوڈیو تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ ہماری جیب میں صرف ہی ایک روپیہ تھا۔"

یہ کہہ کر دونوں بیٹھ گئے۔ محجوب اور شرمندہ۔ جیسے بھری محفل میں کسی نے اُن کی بے عزّتی کی ہو۔ کیوں ان کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا، وہ دونوں نوجوان تھے، اور چال ڈھال سے فلمی ایکسٹرا معلوم ہوتے تھے، مگر دونوں کے کپڑے صاف ستھرے تھے، دونوں تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے، مگر بے کار، اُن کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا، ایک سو ہوتا، ایک ہزار ہوتا، ایک لاکھ ہوتا تو کیا وہ اس طرح اپنے روپیہ کا مطالبہ کرتے، مگر اب وہ مجبور تھے، ایک ہی روپیہ تھا اور رات کو نوبہار سٹوڈیو میں شوٹنگ تھی، اس ایک روپئے میں دو آدمیوں کی چائے، پانامہ سگریٹ، کھانا اور واپسی میں بس کا کرایہ، ایک ایک پائی زنجیر میں بندھی تھی۔ اِدھر سے اُدھر نہ جاسکتی تھی، یہ تیرہ آنے تو انھیں ملنا ہی چاہئیں۔

"مگر میں تیرہ آنے دے چکا ہوں۔ بس کنڈکٹر نے جس کی ماں بیمار تھی، تقریباً روہانسا ہوکر کہا۔

"کس کو دیئے تم نے؟" گلشن نے ذرا غصّے سے کہا۔

بس کنڈکٹر نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اُس کی نظر موٹے سندھی پر پڑی اُسے کچھ یاد آیا "شاید غلطی میں آپ کو دے گیا۔"

"غلطی میں نہیں۔ تم نے ٹھیک دیئے، میں نے یہ ٹکٹ دو آنے کا خریدا۔ میں نے دو روپیہ دیا تھا، تم نے ایک روپیہ چودہ آنے واپس کیا۔ اب مجھ سے کیوں جھگڑتا ہے سائیں؟"

بس کنڈکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ کس سے کیا کہے، میں غور سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی پتلون میں ہاتھ ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا، نہ اِدھر دیکھ رہا تھا، نہ اُدھر جیسے اُسے اِس

پورے واقعے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اُس کے زرد رخسار اور زرد ہوگئے تھے اور اُن کی کھال اندر کھنچ گئی تھی اس کی سانس تیزی سے آتی جاتی معلوم ہوتی تھی اُس کی آنکھوں کی چمک بے قدر بھوکی مگر سنگدلی معلوم ہوتی تھی، وہ چمک گویا کہہ رہی تھی یہ تیرہ آنے جو میری مٹھی میں ہیں میری زندگی ہیں یہ تیرہ آنے نہیں ہیں یہ زندگی کے تیرہ دن ہیں، تیرہ ہفتے ہیں، تیرہ سال ہیں، تیرہ صدیاں ہیں، میرے [illegible] میں انھیں کبھی نہ دوں گا، کبھی نہ دوں گا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی مٹھی پتھروں کے اندر [illegible] گئی اُس کا نچلا جبڑا اُس کے اوپر کے جبڑے [illegible] گویا اب اُسے کسی پیچ کش ہی سے کھولا جا سکتا ہو۔

[illegible] جہاں سے [illegible] پہلے ہی سے پیسے نہیں تھے [illegible] غصے سے لال ہوگیا [illegible] کرتے ہوئے [illegible]

[illegible] یاد باتیں نہ کرو [illegible]

[illegible] تیرہ آنے۔

[illegible] تو میرے پاس ہیں [illegible] تیرہ آنے [illegible] تو پھر کیا بچا؟

تیرہ آنے!

[illegible] جھڑکیاں [illegible] جائے [illegible] تیرہ آنے کافی ہوں گے مگر یہ [illegible] ہوگا۔

تیرہ آنے!

کون کہتا ہے تیرہ آنے ہمارے نہیں ہیں؟ میں جو آٹھ دن سے بھوکا ہوں، کہ دس دن سے بھوکا ہوں، کہ دس ماہ سے بھوکا ہوں، میں جو فٹ پاتھ پر سوتا رہا ہوں، اور مدھم مدھم آنچ کی طرح سلگنے والے بخار میں مبتلا ہوں، فٹ پاتھ جس کا بچھونا ہے، اور پولیس کے سنتری کی ٹھوکر جس کی قسمت

"، میں تو تیرہ آنوں سے بہت دن زندہ رہ سکتا ہوں۔

یہ تیرہ آنے جو میری زندگی ہیں، اگر میرے نہیں ہیں تو پھر کس کے ہیں؟

یکایک وہ تیرہ آنے گویا میرے لئے فضا میں اُچھلے، اور مجھ سے پوچھنے لگے، ہم کس کے ہیں؟ کس کے ہیں؟

اگر تم جانتے ہو تو بتا دو، ہم کس کے ہیں؟

وہ تیرہ آنے جڑ کر بلیڈ کی دھار کی طرح تن گئے، کتنی ہی زندگیاں اس پر ناچ رہی تھیں، ایک کنڈکٹر، ایک بھکاری، دو بے کار!

صرف تیرہ آنے!

پانچ ہزار برس کا کلچر، اجنتا، ایلورا، بخشش، سخاوت، فیاضی، دریا دلی، دیا، دھرم، وسعت، بغت، فکر، ثقافت، کلچرل ڈیلیگیشن، کتھا کلی، ابدی قدریں، اسلامی ادب، آریہ سماجی ادب جھنڈا اونچا رہے ہمارا!

صرف تیرہ آنے!

بس کنڈکٹر کا چہرہ لٹک گیا، دھیرے دھیرے اُس نے اپنے چرمی تھیلے سے تیرہ آنے نکالے، جیسے وہ اپنی ماں کے آخری سانس گن رہا ہو۔

موتی نے وہ آنے جلدی سے جھپٹ کر اپنی جیب میں رکھ لئے، وہ دونوں موتی اور گلشن اس طرح خلا میں دیکھنے لگے، جیسے بس میں اُن کے سوا اور کوئی بیٹھا نہ ہو۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے دبلے پتلے آدمی نے زور کا سانس اندر کھینچا، اور پھر بالکل تن کر بیٹھ گیا، اُس کے رخساروں کی رنگت بالکل سفید ہو گئی۔

میں نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا، مجھے اُس سے سخت گھن آئی، چور ہے، چور ہے، اور یہ صاف بچ کے نکلا جا رہا ہے، میرے دل میں آیا کہ میں اُسے چور کہہ دوں، میرا ایک لفظ اُسے گرفتار کرا دینے کے لئے کافی تھا، مگر نہ جانے وہ لفظ میرے منہ سے کیوں نہ نکلا، میں چپ چاپ اُس کے پاس بیٹھا رہا، اس واقعے کے بعد کسی نے بس میں کسی سے بات نہ کی، کنڈکٹر بھی خاموش

تھا، وہ دونوں نوجوان بھی، دوسرے مسافر بھی، ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر کچھ سوچ رہا تھا۔

اتنے میں اندھیری کا بس اسٹاپ آگیا۔ وہ دُبلا پتلا آدمی ایک ہاتھ پتلون میں ڈالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بس کی آہنی سلاخ پکڑے ہوئے بس کے اندر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا گیا۔ میں بھی اندھیری پر اُتر گیا اور اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ دراصل میرا جی یہ چاہتا تھا کہ میں اُس کمبخت کو اتنا تو جتا دوں کہ میں نے اُس کی یہ بُری حرکت دیکھ لی ہے۔ میں اُسے آنا جتانا چاہتا تھا اور صرف ایک بار انگلی اُٹھا کر اُسے چور کہنا چاہتا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اندھیری اسٹیشن کی طرف مُڑ گیا۔ نکڑ پر ایک چنے والا بیٹھا تھا، آخری فاصلہ اس نے تقریباً دوڑ کر طے کیا اور چنے والے کے پاس پہنچ کر وہ آنے اسکی طرف پھینک کر وہ چنوں پر اسی طرح ٹوٹ پڑا جیسے کوئی مدتوں کا وحشی بھوکا جانور شکار جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کھا رہا ہو۔ اُس کی نگاہوں میں تشنگی کسی قسم کی انسانیت نہ تھی، صرف بھوک ہی بھوک تھی، اور ایک حشمیں چمک۔

جب میں اس کے قریب گزرا تو بجائے اس کے کہ میں اُس سے کچھ کہوں وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنسا پھر اس نے اپنی پتلی انگلی میری طرف اُٹھائی اور بڑی سختی سے کہا۔

"چور!"

مومی اور میمونہ

نہ جانے کب سے وہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

جب وہ سیف الملوک پہنچے تھے تو اس منظر کو دیکھ کر آن جانے میں ایک ہاتھ سے سینہ تھام کر دوسرے ہاتھ کی انگلی منہ میں ڈال کر میمونہ حیرت سے چلائی تھی" ہائے اللہ" لیکن اب وہ جذبۂ حیرت ختم ہو چکا تھا۔

جھیل کے کنارے سبز گھاس پر بیٹھے ہوئے وہ محسوس کر رہی تھی جیسے وہ خود اس منظر کا ایک حصہ ہو۔ وہ یہ بھول چکی تھی کہ وہ میمونہ ہے اور وہ اپنی ماں اور خالد کے ہمراہ وہاں آئی ہے حتیٰ کہ وہ مسرت وانبساط کے اس جذبہ کو بھی فراموش کر چکی تھی جو اس تفریحی سفر پر روانہ ہونے کی وجہ سے اس پر طاری تھا۔

تین سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اب جب کہ ایک نوخیز سی۔ایس۔پی افسر کے ساتھ شادی ہو جانے کے امکانات اس حد تک روشن ہو چکے تھے کہ ماں اور بیٹی کو یقین ہو گیا تھا کہ خالد کا پیمانۂ صبر اس تفریح کے دوران میں چھلکے بغیر نہ رہ سکے گا اور حالات اس حد تک نازک صورت اختیار کریں گے کہ میمونہ سے نکاح پڑھوائے بغیر اس کا واپس کراچی پہنچنا ناممکن کر دیا جائے گا۔

کسی بڑے افسر کو شادی کے بندھن میں پھنسانا گذشتہ تین سال سے ماں اور بیٹی کا واحد مقصد تھا۔ جس کے لئے ان دونوں نے تین سال بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ماں اور بیٹی دونوں کوشاں تھیں اور اسے پانے کے لئے وہ اشاروں سے ایک دوسرے کی رہنمائی کیا کرتی تھیں اور اس وقت خالد کے دل میں میمونہ کی خواہش کی چنگاری کو ہوا دینے

کیونکہ وہ مکمل طور پر تنگ بخشی کے اصول پر کاربند تھیں۔

خالد تو ہوش مند تھا اور اسی لئے اس قدر جوشیلا نوجوان تھا وہ تنگ بخشی کو استعفیٰ سے رد نہ کر سکتا۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس نے بھی اس حقیقت کو نہ پایا تھا کہ وقتی طور پر جام و سبو کو نگوں کر دینا حقیقت جام و سبو کو دائمی طور پر چھلکانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔

اس تنگ بخشی اور ذوق و شوق کا نتیجہ اب نہائی طور پر واضح ہو چکا تھا۔ اسی طرح جھیل کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ناران کے ہوٹل میں خالد اور میمونہ کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ اسکی تیلون کی کریز سے تنگ بخشی کا امر کی شارہ تھی اور میمونہ کی ماں کی طرف اس کی خصوصی توجہ غمازی کر رہی تھی کہ اس نے یہ پورے طور پر محسوس کر لیا ہے کہ میمونہ کو حاصل کرنے کے لئے اس کی ماں کی منظوری از بس ضروری ہے۔

میمونہ کی ماں کے لئے اب صرف آخری مرحلہ درپیش تھا۔ وہ بالغ تھا صرف ایک چوٹ کی ضرورت تھی اسے خالد کو میمونہ کے رشتے کے لئے رسمی استدعا کرنے پر آمادہ کرنا تھا۔ اور شاید اسی لئے جب خالد نے جیل سیف الملوک کو سامنے چاندنی کی چوٹی سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا تو ماں نے بڑی حجت سے زیڑی کو خبردار کر دیا تھا اور زیڑی نے معاملے کو بھانپ کر ان کے ساتھ جانے سے معذوری کا اظہار کر دیا تھا تاکہ تنہائی میں انہیں بات کرنے کا موقع مل جائے اور وہ خود گھاس پر لیٹ کر رسالہ میں کھو گئی تھی — اس قدر کھو گئی تھی کہ وہ اپنے مقصد کو پا لینے کی شدید مسرت کو بھی بھول چکی تھی۔

جب وہ تینوں سیف الملوک کی جھیل پر پہنچے تھے اور میمونہ اپنے مخصوص انداز میں چلائی تھی "ہائے اللہ!" اور اس نے خالد کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر ابھرا ہوا سینہ ایسے انداز سے تھام لیا تھا جو عمر دراز کی مشق اور وسیع تجربے کے بعد حاصل ہوتا ہے تو خالد نے ہنس کر کہا تھا کہ مومی یہ وہ مقام ہے جہاں پری شہزادہ سیف الملوک کو رومان کے لئے لائی تھی۔

"ہائے سچ!" میمونہ نے پوچھا تھا۔ "رومان کے لئے لائی تھی؟"

رومان کے متعلق میمونہ کا تخیل مختلف تھا جو کراچی کے خاص حلقوں میں پانچ سال کی مسلسل

گھما گھمی و بے باک تفریحی و لذت پرستی سے بھرپور زندگی کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اسی لئے پہلی نظر میں منظر کی لطافت کو سمجھے بغیر خالد کو اکسانے کے لئے وہ بولی تھی " ہائے اتنی رومان پرور جگہ ہے یہ کہ میں بھی کسی شہزادے کو رانی نہیں لاتی۔"

یہ سن کر خالد یوں شاہانہ انداز سے ایستادہ ہو گیا تھا جیسے وہ شہزادہ ہو اور میمونہ کی ماں نصرت ہنس کر بولی تھی " تبھی تو بھائی کوئی نہیں لایا میں تو آپ ہی آئی ہوں" اور پھر وہ جوتا ٹھیک کرنے کے بہانے رک گئی تھی تو خالد نے چپکے سے میمونہ سے زیر لب پوچھا تھا " سچ مومی تم بھی شہزادے کو رومان کے لئے نہیں لاتیں؟" اور میمونہ نے معصومانہ انداز سے بہ آواز بلند کہا تھا " کیوں رومان پرور جگہ نہیں ہے کیا؟" اور خالد نے کہا تھا " لیکن ——" اور وہ ہنس کر بولی تھی " ہم نہیں جانتے لیکن ویکن۔"

اس وقت رومان سے میمونہ کی مراد وہی تھی جو کراچی کے ان مخصوص حلقوں میں سمجھی جاتی ہے جہاں اس نے گذشتہ چار سال گزارے تھے اور جہاں معصوم بچیاں دیکھتے دیکھتے مومی سے میمونہ بن جاتی ہیں۔

لیکن اس لطیف پرسکوت لالہ زار خطۂ زمین پر گھاس میں پڑے پڑے نہ جانے میمونہ کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ لطافت کو اس کے جسم میں سرایت کرتے روح کی گہرائیوں میں جا پہنچی تھی۔ اس مہکتے ہوئے گہرے سکوت میں کراچی کا وہ شور و شغب اور اشتعال اور شدت غائب ہو چکے تھے اور گویا پھر وہ میمونہ سے مومی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

چھ سال قبل جب پہلی مرتبہ مہاجروں کی حیثیت سے ماں بیٹی کراچی پہنچی تھیں تو وہ اس وقت بھی مومی ہی تھی اور اسی وجہ سے اپنی اکیلی ماں کے لئے زیادہ پریشانی تھی۔ مومی کی ماں نصرت کا دل دو بارہ جا رہا تھا بغیر کسی سہارے کے ایک اجنبی شہر میں داخل ہونا اس کے لئے ایک نئی اور انتہائی پریشان کن بات تھی۔ اس وسیع شہر میں ٹھکانا کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی جگہ نہ تھی صرف چار ایک زیورات کے علاوہ جو نصرت نے اپنے ڈھیلے پیٹ کی تہوں میں چھپا کر باندھ رکھے تھے ان کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا۔

مسافر خانہ میں بیٹھے ہوئے وہ بار بار مومی کی طرف دیکھتی اور اسے خیال آتا کہ اگر مومی کی
ماں کا ایک بیٹا ہوتا تو اس مصیبت میں ماں کے لئے سہارا بن جاتا۔ اور مومی جس کی عمر اس وقت
سال کی تھی سہارا بننے کے بجائے اس کی پیٹھ کا بوجھ بنی ہوئی تھی۔ اس وقت نصرت کو کچھ بھی
نہ معلوم تھا اس کا خیال تھا کہ مومی مومی ہی رہے گی اور وہ خود اس مومی کی ماں۔
اسے کیا معلوم تھا کہ جلد ہی وہ خود مومی کو اس غیر معروف پگڈنڈی سے گھسیٹ کر شاہراہ پر
لے گی اور وہ مومی سے میمونہ بن جائے گی اور اس کی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ اس وقت
اس بے بسی کے عالم میں اسے ان باتوں کا کیا علم ہو سکتا تھا۔ اس وقت تو مومی اس کے لئے ایک
ل بوجھ تھی بیٹے کے علاوہ اس کا فکر بھی کرنا تھا اور اسے دنیا والوں کی نگاہوں سے
ہ رکھنا تھا۔ ہر حال نصرت اپنے آپ کو تسلی دیتی "چاہو دل کی بات کرے کے لیے ایک ساتھی
ہے جو مصیبت پڑے گی مل کر سہیں گے اللہ کارساز ہے"۔ اس زمانہ میں وہ اللہ سے مایوس
نہ تھی حالانکہ جن مشکلات سے وہ دوچار رہی تھی اور جو مصائب انھوں نے جھیلے تھے انکے
د اللہ کی کارسازی پر بھروسہ رکھنا آسان بات نہ تھی اور اب ـــــ اللہ سے مایوس ہونے
یا بھروسہ رکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا جب اپنی بیٹی مومی سے میمونہ بن جائے تو اللہ
کی کسی سے دوری کہاں رہتی ہے۔
کراچی پہنچ کر وہ گاڑی سے اتر کر مسافر خانہ میں بیٹھی ہوئی تھیں اور گشت والا سپاہی انکے
پاس آ کر درشت لہجے میں بولا تھا "ہے یہ مسافر خانہ ہے سرائے نہیں چلئے جو یہاں سے اور
ہی ہے اس کی گٹھری کو زور سے ٹھوکر ماری تھی اور نصرت کی منتوں کے باوجود اس نے اپنی
کی تھی اور نصرت نے مایوس ہو کر مومی سے کہا تھا "چل بیٹی یہاں یہ بیٹھنے نہیں دیں گے"۔
اور پھر مومی کی طرف دیکھ کر سپاہی چونک کر بولا تھا "یہ تیرے ساتھ ہے کیا ـــ اچھا بیٹھ لو
ری دیر ـــ "اور پھر وہ مومی کے روبرو کھڑے ہو کر مونچھ مروڑنے میں مصروف ہو گیا تھا۔
اس اجازت کا معاوضہ حاصل کر رہا ہو۔
پھر جب سنار کے پاس وہ زیور بیچنے گئی تھی اور سنار نے اپنے مخصوص انداز سے پہلے زیور

پھر نصرت کو مشتبہ نظروں سے دیکھا تھا جیسے وہ زیور چوری کا ہو اور پھر مومی کی طرف دیکھ کر
ںَ ہو گیا تھا۔ جیسے اُسے مومی کو دیکھ کر یقین ہو گیا ہو کہ انھیں چوری کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔
وہ ہنس کر کہنے لگا تھا۔" تو یوں کہو نا ۔ ٹھیک ٹھیک ہے' گھر لیں گے ہم' پر دام وہی ملیں گے۔"
پھر جب ایک مختصر سا مکان کرایہ پر لینے کے لئے وہ دفتر کے بابو سے ملی تھیں جس کے نام وُ
ن الاٹ تھا اور جان پہچان نہ ہونے کی وجہ سے بابو نصرت کو اپنا مکان دیتے سے ہچکچا رہا تھا
، وقت مومی داخل ہوئی تھی اور مومی کی طرف بابو نے حیرت سے ایک نظر دیکھا تھا تو دفعتاً اُسے
، بیٹی کی بدقسمتی پر ترس آ گیا تھا اور پھر اس گنجے دفتری نے بھی نصرت کو سینے کا کام دینے سے
لے مومی کی طرف دیکھا تھا اور پھر جیسے اسے نصرت کے سلائی کا کام کرنے کی صلاحیت پر یقین
یا ہو۔ وہ خلوص سے مسکرانے لگا تھا۔ یوں نصرت پر نئے حقائق روشن ہونے شروع ہو گئے تھے۔
راس نے محسوس کیا تھا کہ مومی اس کی پیٹھ کا بوجھ نہیں' بلکہ ـــــ اس خیال پر اُس نے
حول بھی پڑھی تھی اور نماز کے بعد گڑگڑا کر دعائیں بھی مانگی تھیں' لیکن اس کے باوجود اس کے
ہن میں وہ احساس کانٹے کی طرح چُبھ کر رہ گیا تھا کہ مومی اس کی پیٹھ کا بوجھ نہیں۔
اس خیال پر وہ شعوری طور پر لرز گئی تھی اور اسے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا تھا اور مومی کو
فوظ کرنے کے لئے اس نے سوچا تھا کہ اس کی شادی ہو جائے' کسی اچھی جگہ جہاں وہ آسائش
آرام سے زندگی بسر کر سکے۔ ایسا ہو جائے تو سب اندیشے دور ہو جائیں آخر ایک ماں کو بیٹی کی شادی
سے بڑھ کر اور کیا فکر ہو سکتی ہے۔ اپنی جان کا کیا ہے' جیسے تیسے زندگی کٹ ہی جاتی ہے۔
اس روز کے بعد نصرت نے پیٹ کاٹ کاٹ کر محنت مزدوری کر کے' پیسہ پیسہ جوڑ کے'
مومی کے لئے خوبصورت کپڑے بنوانے شروع کر دیئے تھے لیکن وہ بھڑکیلے کپڑے مومی کی معصومیت
کی وجہ سے عجیب سا تضاد پیدا کر دیتے تھے۔ لیکن یہ تضاد بھی جاذب نظر تھا۔ اس زبردستی کی بھڑ
بس سے اس کی معصومیت چھن چھن کے نکلتی تھی اور اس حد تک نمایاں دکھائی دیتی تھی کہ لوگ
دیکھ کر چونک جاتے تھے۔ وہ بھڑکیلے کپڑے مومی پر یوں دکھائی دیتے تھے جیسے مسجد کے گنبد پر
طلائی کلس چڑھا ہوا ہو۔

سب سے پہلے جو شخص اُسے دیکھ کر چونکا وہ ان کا پڑوسی فدا حسین تھا جو بحالیات کے شعبہ میں اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز تھا۔ اُسے دیکھ کر فدا حسین نے مخلصانہ طور پر شدت سے ہمدردی کا جذبہ محسوس کیا۔ اس کے بعد وہ ان کے گھر آنے جانے لگا اور نصرت کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں اس کی دکھ بھری کہانی سنتا رہا۔

پھر رفتہ رفتہ نصرت کی غیر حاضری میں فدا حسین کا جذبۂ ہمدردی اس حد تک جوش میں آ گیا [illegible] نفس کا رنگ ہی بدل گیا۔ [illegible] بیٹھے [illegible] تر بتر ہو گئی۔ جیسے ہی [illegible] واقعہ [illegible] تھا۔

اس روز جب نصرت [illegible] لوٹی [illegible] موسیٰ [illegible] بات [illegible] لیکن موسیٰ نے [illegible] کوئی جواب [illegible] آنسوؤں [illegible] موسیٰ کے چہرے [illegible] غصہ [illegible] جب [illegible]

ادھر [illegible] موسیٰ [illegible]

[illegible] تو اس میں اپنی ہی بدنامی تھی اور اس غریب الوطنی کے عالم میں لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے زندگی گزارنا بھی آسان نہ تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہوتا ہے۔ یعنی وہی حادثہ ایک بار پھر دہرایا گیا۔ [illegible] بار بار دوہرایا جانے [illegible] اور موسیٰ سے شرمانے کی بجائے [illegible] اس کے قریب بیٹھ کر [illegible] تسلیاں دیتی رہتی [illegible] کہ کس طرح موسیٰ کو تسلیاں دے رہی تھی۔ اس وقت وہ کرائے کے کوارٹر کی بجائے ایک ایسے مکان میں رہتی تھی جو ان کے نام الاٹ ہو چکا تھا اور جس کا قبضہ

انھوں نے اسی روز لیا تھا۔

پھر رفتہ رفتہ مومی کا رونا کم ہوتا گیا اور نصرت کا اُسے تھپک تھپک کر تسلی دینا بے باک ہوتا گیا۔ "کیا ہوا مومی" یا "نہ رو بیٹی" کے بجائے نصرت مسکرا کر کہنے لگی "میری پگلی بیٹی اُٹھ۔ اٹھ کر اپنے بال تو بنالے۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ کوئی آگیا تو کیا کہے گا دیکھ کر۔ اپنی عزت کا بھی خیال ہے تجھے؟"

بات بھی ٹھیک تھی۔ جب ایک رہائشی مکان کے علاوہ سینما کا حصہ بھی [illegible] کرسیوں اور دریوں کے علاوہ سنگار میز اور ڈریسنگ ٹیبل بھی آ جائیں تو انسان کو [illegible] کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ وہ مشین کا کام تو دیسے ختم ہو چکا تھا اب تو ماں بیٹی [illegible] کے پاس چلے جاتے تھے اور گھر میں کام کاج سے لئے ایک بڑی ہوشیار ملازمہ موجود [illegible] ان سب باتوں کے باوجود نصرت مطمئن نہیں تھی۔ اسے ایک فکر دامن گیر تھا کہ کسی طرح [illegible] اچھا رشتہ مل جائے اور اس کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔

جس روز پہلی دفعہ مومی رونے کے بجائے مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی تھی [illegible] بیٹی سے اپنے خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس نے کہا تھا "اب بیٹی تجھے تو بیاہ کر کے [illegible] کوئی اچھا سا لڑکا مل جائے جو نصرت ہو لیکن خاندانی بندھنوں سے آزاد ہو [illegible] اور میرا کیا ہے بیٹی، میں تو جیسے تیسے زندگی بسر کر ہی لوں گی۔" وہ پہلا دن تھا جب [illegible] طور پر تسلیم کیا تھا کہ اگر وہ مومی کو لوگوں کی نگاہوں سے بچا نہیں سکتی تو [illegible] کیوں نہ بنے پائیں۔

"چھوڑو امی مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔" کہہ کر مومی نے ماں کی بات ٹال دی تھی۔ [illegible] اسے ماں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو کیا۔ ایسی بات [illegible] تھا۔ خصوصاً مومی کے دل میں جب جب مومنہ کی اولیں بیداری نے کروٹ لی تھی۔

جب کسی نے نئے نئے رونا چھوڑ کر مسکرانا سیکھا ہو تب اسے [illegible] مستقبل [illegible] تو وہ بھی لاشعوری طور پر اپنی گذشتہ آبدیدہ حماقت کو فراموش کرنے کی کوشش [illegible] کے دھندلکے سے نکل کر پہلی مرتبہ تبسم سے آشنا ہوئی ہو۔ اس کیلئے زمانہ حال اس قدر [illegible]

سے تعلق کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ماں کو معلوم تھا کہ چاہے وہ روئے یا مسکرائے عورت کے لئے [illegible] میں بدلتے ہوئے دیر نہیں لگا کرتی۔

اس روز مومی نے نئے نئے محسوس کیا تھا کہ وہ بے بس نہیں بلکہ با بس ہے اور اس کا بس چلتا ہے جانے کب سے اس نئے احساس نے اس کے انداز کو قطعی طور پر بدل دیا تھا۔ نہ جانے کیسے دفعتاً اس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اس کی جنسیت اور ایک سرسری نگاہ، زیر لب تبسم حتیٰ کہ اس کے آنسو بھی عظیم طاقت تھے جن سے وہ تسخیر کر سکتی تھی۔ وہ اس نئی طاقت کے احساس پر اس قدر خوش تھی کہ اسے بے مقصد استعمال کرنے میں یوں مسرور تھی جیسے کسی بچے کو نیا کھلونا مل گیا ہو۔

اسی زیر لب مسکراہٹ کے بعد مومی نے محسوس کیا تھا کہ زندگی خود ایک رومان بھرا تسلسل ہے۔ اس کے لئے ہر جنبش ہر حرکت رومان تھی۔ مثلاً وہ کنکھیوں سے کسی کی طرف دیکھتی، شرما کر آنکھیں جھکا لیتی، گردن موڑ کر سیڑھیاں چڑھا کرتی یا اپنی لمبی خوبصورت انگلیوں سے کچھ تھامتی تو اُسے ایک لذت سی محسوس ہوتی۔ لیکن ابھی خوشی اُس کے لئے ایک ساکن جھیل کے مترادف تھی جس میں گرد و پیش کا عکس [illegible] رقص کرتا ہے۔ ابھی اس لرزش نے طوفان کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

اگر مومی اور اُس کی ماں کا حلقۂ ملاقات محدود رہتا تو شاید رومان کے متعلق اُس کے احساسات مبہم لطافت اور ذہنی حرکات تک ہی محدود رہتے اور وہ کبھی ذہنی سے جسمانی نہ بنتی اور ماں کے خدشات کو کبھی شدت سے محسوس نہ کرتی۔ لیکن حالات کا دھارا کسی اور طرف بہہ رہا تھا اور محض اتفاق کی وجہ سے وہ کراچی کے اونچے مجلسی حلقوں کی طرف چلی جا رہی تھی۔

ان کی اس اڑان کی سب سے بڑی وجہ ارجمند تھا جو لکھپتی مہاجر کا رنگیلا بیٹا تھا۔ ارجمند سے مومی کی ملاقات محض اتفاق سے ہوئی تھی اور ارجمند نے اس کا تعارف ڈبلیو محمود سے کرایا تھا جو مرکزی حکومت میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا اور ڈبلیو محمود مومی سے اس درجہ محظوظ ہوا تھا کہ جب اُس کا تبادلہ کراچی سے ہوا تو اپنا فلیٹ انہیں دے گیا۔ اس طرح وہ شہر کے اس حصہ میں آ مقیم ہوئی تھیں جہاں [illegible] طبقہ کے افراد رہتے تھے۔

عملی طبقہ کے افراد بھی رومان کے شدت سے قائل تھے لیکن رومان کے متعلق اِن کا تصور مبہم نہ تھا۔

رومان اُن کے نزدیک کیفیت نہ تھی بلکہ ایک ٹھوس اور مادّی حقیقت تھی جسے براہِ راست عمل سے تعلق تھا۔ اُنھیں وقت کی کمیابی اور اُس کی اہمیت کا شدّت سے احساس تھا اس لئے رومانس میں اسے ضائع کرنا پسند نہ کرتے تھے اور وقت ضائع کرنے والوں کو پسماندہ اور جاہل سمجھتے تھے اور ایسے لوگوں سے ملنے جُلنے سے احتراز کرتے تھے۔ وہاں آنکھیں مٹکانا یا ترچھی نگاہ سے دیکھنا تسخیر کرنے کے لئے بلکہ متوجہ کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا تھا اور ایک مرتبہ متوجّہ کر لیا جاتا تو تمہید یا اشارہ کنایہ میں وقت ضائع کئے بغیر کوئی کہہ دیتا "جانِ من چلو رومان کریں" اور جواب میں شرما جانے یا اثبات میں آنکھیں جھکانے کی بجائے وہ جواب دیتی "ڈارلنگ میں تو کب سے منتظر ہوں"۔

اعلیٰ حلقے میں پہنچنے کے بعد مومی کو بھی رومان کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑا تھا حتّٰی کہ ایک روز بیگم ناز کی پارٹی کے بعد جب وہ ایک اجنبی نوجوان کی کار میں لفٹ لے رہی تھی اور راستہ میں اجنبی نے کسی وجہ سے کار روکی تھی اور پھر چاند کو دیکھ کر غالباً کچھ کہنے کے لئے بولا تھا۔ "ہاؤ رومانٹک" تو مومی نے جواب دیا تھا "مسٹر دیکھئے! اگر رومان کا موڈ ہے تو یہاں آ جاؤ پچھلی سیٹ پر میرے پاس"۔

اُس روز میمونہ کی تکمیل ہو گئی تھی اور پسماندہ مومی نے آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر میمونہ ایک شانِ بے نیازی سے بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے ہاتھ کسی کے گالوں سے کھیل رہے تھے۔

میمونہ بن کر اُسے آزادی کا ایک انوکھا احساس ہوا تھا۔ اس کی زندگی سے گویا تمام رکاوٹیں اور بے معنی بندھن ختم ہو چکے تھے۔ بے کار قسم کے نسوانی تقاضے اور نسائی لوازمات جنھیں وہ گزشتہ زمانہ میں بہت اہم سمجھتی تھی، اب بے معنی دکھائی دیتے تھے۔ اب اسے پاکیزگی کا احساس دلانے کے لئے شرمانے یا لجانے کی ضرورت نہ تھی اور رومان کے لئے محبت کا بہانہ اختراع نہیں کرنا پڑتا تھا اور وفا کی قسمیں نہیں کھانی پڑتی تھیں۔

لیکن جلد ہی میمونہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ تو کر سکتی ہے لیکن انھیں اپنے سحر تلے نہیں رکھ سکتی۔ یہ احساس اس کے لئے چنداں خوشگوار نہ تھا۔ پھر جب پہلی دفعہ اس نے اپنے چہرے پر تھکاوٹ اور نقاہت کے آثار دیکھے تو اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اسے اپنے مستقبل کو محفوظ کر لینا چاہئے۔ بلکہ اس روز پہلی مرتبہ اسے مستقبل کے وجود کا احساس ہوا اور اس نے ماں کی بات

کی اہمیت کو سمجھو ۔

اس احساس کے بعد میمونہ کی زندگی میں ایک مقصد قائم ہو گیا تھا اور اس کی نگاہیں جاذب ہونے کے ساتھ ساتھ دور رس بھی ہو گئی تھیں اور زندگی کے دلچسپ اور دلفریب اندھیرے میں مقصد کا چاند ابھر آیا تھا ۔

[illegible] طاقتوں کو کسی [illegible] ہو جاتا تھا لیکن [illegible] افراد سے [illegible] بخشتے [illegible] عورت [illegible]

سب سے بڑے [illegible]

[illegible] سے تھے

[illegible] سے ایک عورت [illegible] حکومت [illegible] دلچسپی تھی [illegible] وہاں کے [illegible] مایوس ہو کر اس نے [illegible] تقاضے [illegible] توجہ کی گئی تھیں [illegible] تو ان کی [illegible] چاہتی تھی کہ شادی [illegible] مستقبل کی آزادی [illegible] اس کا مقصد اسی آزادی کو [illegible] کرنا نہیں بلکہ محفوظ کرنا تھا [illegible] میمونہ کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا ۔

پھر جوں جوں اس کے شعور سے مایوسی کا مبہم احساس ابھرنے لگا توں توں اس کی کوششوں میں

ایک بھونڈی سی شدت واضح ہونی شروع ہوگئی اور حلقے کی خواتین اس پر ہنسنے لگیں۔ عین اس وقت نہ جانے کہاں سے خالد حلقے میں وارد ہوا اور خالہ کو کنکھیوں سے جانچ کر میمونہ نے محسوس کیا کہ اگر وہ خالد کو تسخیر نہ کر سکی تو کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔

خالد اس طبقے میں نووارد دکھائی دیتا تھا اور ان کے طور طریقے سے پورے طور پر واقف معلوم نہ ہوتا تھا۔ میمونہ کو یقین تھا کہ وہ اسے متوجہ کر لے گی۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ آیا وہ اسے اپنی گرفت میں لے سکے گی یا نہیں۔ وہ اس بات پر مسلسل سوچتی رہتی تھی اور جب پہلی مرتبہ اسے خالد کے ساتھ شام گزارنے کا موقع ملا تھا تو وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اگر وہ اس مخصوص تہذیب کے مطابق مکمل خود سپردگی سے قابو میں لانے کی کوشش کرے تو شاید خالد بھی جلد ہی دام سے نکل جائے جیسے دوسرے لوگ نکل جاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ پاس رہ کر اس سے دور رہے تو شاید خالد اُسے پسماندہ اور جاہل سمجھ کر اس میں دلچسپی نہ لے۔ اس کشمکش میں ماں اس کے آڑے آئی تھی۔ ماں نے بھنوؤں کے ایک لطیف سے اشارے سے اُسے "تمام بخشی" کی بات سمجھائی تھی اور خالد میمونہ کو پسماندہ اور جاہل سمجھنے کے باوجود یا شاید پسماندہ سمجھنے کی وجہ سے میمونہ کا دیوانہ بن گیا تھا اور انھوں نے کئی ایک شامیں اکٹھے بسر کی تھیں۔ اور پھر نفسیات کی ترغیب پر وہ اُنھیں وادیٔ کاغان کی سیر کے لئے لے آیا تھا لیکن اس فریب کے باوجود خالد کا میمونہ کے لئے شوق بڑھتا گیا۔ خالد کے دوست اور میمونہ کی تمام بخشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناران کے ڈاک بنگلے میں جھیل کی طرف روانہ ہونے سے پہلے وہ دو دفعہ میمونہ کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا اور جھیل سیف الملوک کے راستے میں مومی کی ماں کی طرف خالد کی خصوصی توجہ اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ میمونہ کو حاصل کرنے کے لئے اس کی ماں کا منظوری حاصل کرنا ضروری ہے اسی لئے جب خالد نے اس ٹیلے سے جھیل کے منظر کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی تو ماں نے ہلکے سے اشارے سے بیٹی کو خبردار کر دیا تھا اور میمونہ نے معاملہ کو بھانپ کر ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا تاکہ تنہائی میں انھیں بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اسے یقین تھا کہ خالد کے لئے اب ضبط کرنا ناممکن ہو چکا ہے۔ اُن کے جانے کے بعد وہ خود گھاس پر بیٹھ کر سوچنے لگی تھی کہ جب خالد اور ماں واپس آئیں گے تو ان کے چہرے سے اُسے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ

ثابت ہوگئی تھیں۔ گزشتہ تین سال کی مسلسل جدوجہد کا اعلان ہونے والا تھا۔ وہ وقت اس کے لئے کس قدر اہم تھا۔

لیکن اس منظر نے نہ جانے اس پر کیا جادو کر دیا تھا۔

وہ سطح ارض کی بلندی پر وہ مقام نہ جانے کیسی لطافت کا حامل تھا۔ اس کے پاؤں تلے ایک [illegible] سا مثلث نما ہموار زمین کا ٹکڑا تھا جو گھاس سے ڈھکا ہوا تھا، جس پر سفید پھول یوں بچھے ہوئے تھے جیسے وہ ایک خوبصورت منقش مخمل ہو۔ بائیں ہاتھ گہری نیلی جھیل کا شفاف پانی یوں ٹھہرا تھا جیسے سبز پیالے میں آب کوثر چھلک رہا ہو۔ جھیل کے کنارے چھوٹے چھوٹے گنبد نما ٹیلوں پر نیلے رنگ کے پھول لگے ہوئے تھے۔ جب ہوا چلتی تھی تو ان کے بے ڈھنگے تنے جھک جاتے اور نیچے سے نیلے پھول جھانکنے لگتے اور جب ہوا ذرا اور تیز ہو جاتی تو نیلے پھول اور جھک جاتے اور نیچے سے سفید پھول تاروں کی طرح چمکتے دکھائی دیتے۔ سامنے مثلث کے پرے کوہ کے پرے برف سے ڈھکی ہوئی مینار نما چوٹیاں ایستادہ تھیں۔ اوپر نیلا آسمان اور نیلے آسمان پر چھایا ہر طرف ایک عظیم اور لامتناہی موجودگی کا احساس ـــــ مسلط و محیط ـــــ

اس احساس کی عظمت، اس بلندی کی لطافت، اس نیلی جھیل کی پاکیزگی، اس پھولدار حصے کی دلکشی اور ان مینار نما چوٹیوں اور گنبد نما ٹیلوں نے نہ جانے نیمو پر کیا سحر پھونک دیا تھا۔ اس منظر کی پاکیزگی اور عظمت کو دیکھ کر وہ بھول گئی تھی کہ وہ نیمو ہے اور ایک سی۔ ایس۔ پی افسر کو شادی کے بندھن میں پھنسانا اس کا مقصد حیات ہے۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہاں ایک زینت کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص عمل ہے۔

اس دلفریب منظر کو تکتے دیکھتے اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ کوئی پری ہو اور تفریح کے لئے زمین پر اتری ہو۔

قریب ہی ایک [illegible] زمین کردہ چونکی۔ اس کے سامنے ایک نوجوان چرواہا کھڑا شوق بھرے تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے متوجہ دیکھ کر چرواہے نے اسے سلام کیا اور پھر فرط انبساط سے اس کا چہرہ پھول کی مانند کھل گیا۔

دفعتاً پری نے محسوس کیا جیسے وہ کوئی شہزادہ ہو۔ جس نے گڈریے کا بھیس بدل رکھا ہو۔

دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

مومی اس پھولدار حصے کو دیکھ رہی تھی اور شہزادے کی نگاہیں مومی کے چہرے پر گویا جم کر رہ گئی تھیں۔ "اچھی جگہ ہے"۔ گڈریے نے اپنی نگاہیں ہٹائے بغیر گویا اپنے آپ سے کہا۔ وہ چونکی "ہاں بہت اچھی"۔

"اچھا"۔ اس کے چہرے پر خوشی کے چھینٹے اُڑے "میں۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ میں اس ٹیلے کے پیچھے"۔

"اچھا" وہ بولی۔

"وہاں بھی ایک جھیل ہے بڑی اچھی جگہ ہے"۔ دیر تک دونوں خاموش رہے۔

"دودھ پیو گی"۔ اس نے اپنی بکریوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دودھ؟" وہ چونکی پھر وہ ہنس پڑی۔

"کھوہ کی بوٹیوں کا دودھ جلتی بوٹی کا"۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

"اچھا"۔ وہ پھر ہنسی اور اس نے محسوس کیا جیسے وہ مومی ہو جیسے ایک بار پھر وہ میمونہ سے مومی بن گئی ہو اور وہ جگہ کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھی اور پھر وہ شہزادہ جس نے روپ بدل رکھا تھا اور اس کی مضبوط باہیں اور چوڑی چھاتی اور اس کے چہرے پہ بے لوث انبساط کے دو سُرخ و سفید چھینٹے۔

"وہاں بڑی اچھی جگہ ہے، میرے جھونپڑے کے پاس۔ وہاں کالی بکری کا دودھ ہے جو کھوہ میں جا کر جلتی بوٹی کھاتی ہے۔ پیو گی؟" وہ بولا۔

"اونہوں"۔ وہ ہنسی "نہ نہ"

دفعتاً بکری کے پاؤں کی آہٹ سُن کر وہ چونکی اُس نے مڑ کر دیکھا، اچانک اُسے یاد آیا کہ وہ میمونہ ہے اور خالد اور رماں کے انتظار میں وہاں بیٹھی ہے۔ دفعتاً کراچی۔ اس کے علاوہ اعلیٰ حلقے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ رومان بھرے قہقہوں کی آوازیں اُس کے کانوں میں گونجیں جیسے کراچی کی تمام تر زندگی اس کے گرد ناچ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہو۔

بچھا ہوا غالیچہ پر برف سے ڈھکے ہوئے گنبد اور مینار خاموش مگر متوقع نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے مسکرا رہے تھے۔ ٹیلوں پر چھوٹے چھوٹے خودرو پودے لئے اپنی طرف واپس بلا رہے تھے۔ "واپس نہ جاؤ، نہ جاؤ۔" ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ٹیلوں پر نیلے اور سفید رنگ کے پھول شوق بھری نگاہوں سے اس کی طرف جھانک رہے تھے "پاگل ہو گئی ہو؟" اس کے روبرو میمونہ کھڑی چیخ رہی تھی "وہاں نہ جاؤ، وہاں سے تم واپس نہ آسکو گی۔" نصرت کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا عقب میں خالدہ بیٹھی رو رہی تھی "سنو بھی میں نے تمہاری ماں سے بات بھی کر لی ہے۔" شگفتہ غالیچہ گویا سجدے میں پڑا تھا اور سنگلاخ برف آلود چٹانیں بلندیوں کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ "مومی مومی۔" اس نے ہر طرف پر اسرار سکوت نے سکوت توڑ دیا۔ "مومی مومی۔" اس کی آواز میں ایک سحر تھا وہ پھر کھو گئی، پھر وہ چونکی۔ اس نے گھبرا کر نوجوان کی طرف دیکھا شہزادے کے چہرے پر مایوسی کی جھلک تھی۔

"اچھا" وہ بولا "جیسے تمہاری مرضی۔"

"نہیں" وہ چلائی "میں جاؤں گی۔"

مہندر ناتھ

پٹخنی

سیٹھ دھنپت رائے حسب معمول گدّی میں داخل ہوئے تو انھیں دیکھ کر گدّی کا منشی کچھ سہم سا گیا۔ اور جلدی ہی رسیدوں اور دیگر فائلوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ سیٹھ کی نگاہیں سامنے کی دیوار پر گڑ گیئں۔ اُن کے سامنے لکشمی کی تصویر تھی۔ اور اُس کے ساتھ شری کرشن مہاراج کا رنگین فوٹو اور تیسری تصویر شری گرو گوبند سنگھ کی تھی۔ تینوں تصویروں کو باری باری ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کچھ بڑبڑانا شروع کیا اور اپنے اردگرد گھوم گئے۔ آنکھیں کھولکر گدّی کے فرش کو دونوں ہاتھ سے چھوا اور سر سے ٹوپی اُتار کر سامنے والی کیل پر ٹانگ دی۔ دائیں طرف ایک میلی دھوتی لٹک رہی تھی۔ کوٹ اُتار کر میلی دھوتی کو پکڑا اور اپنی سفید شفاف دھوتی کو اُتارتے ہوئے انھوں نے میلی دھوتی کو پہن لیا پھر سفید دھوتی کو دروازے پر لٹکا دیا۔ میلی دھوتی کو سنبھالتے ہوئے وہ چٹائی پر بیٹھ گئے اُن کے قریب ہی ایک ٹین کی ڈبیا تھی اُس میں سے ایک بیڑی نکالی اور ماچس جلا کر بیڑی کو سلگایا۔ ایک موٹے سرہانے کو کھینچ کر اور اُسے دیوار کے ساتھ لگا کر آرام سے بیڑی کا کش لگایا اور کمرے میں بیٹھے ہوئے انسانوں پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی۔ گدّی میں داخل ہوتے ہی وہ اپنے آپ کو شیر ببر سمجھنے لگتے اور گدّی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اس طرح دیکھتے جیسے یہ سب اُن کی رعایا ہیں اور وہ اُن کے پالن ہار۔

اُن کا چھوٹا بھائی جس کا نام ست نرائن تھا اور جسے وہ پیار سے سُتّو کے نام سے پکارا کرتے تھے، وہ اُس گدّی کا چھوٹا سیٹھ کہلاتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے رہن سہن، بول چال میں کافی تفاوت تھا۔ اگر بڑا سیٹھ گالی دے کر بات کرتا تو چھوٹا سیٹھ مسکرا مسکرا کر بات کرتا۔ اگر بڑا سیٹھ دھوتی پہنتا اور بیڑی پیتا تو چھوٹا سیٹھ کوٹ پتلون پہنتا اور گولڈ فلیک کے سگرٹ پیتا۔ اگر بڑا سیٹھ آنے والوں

کی خاطر مدارات کی طرف دھیان نہ دیتا تو چھوٹا سیٹھ گدی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو چائے کے لئے ضرور پوچھتا۔ جب تک بڑا سیٹھ گدی میں رہتا تو گدی میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر خوف اور دہشت کا موڈ طاری رہتا۔ تقریباً تین بجے کے قریب بڑا سیٹھ تاش کھیلنے چلا جاتا تو ساری گدی میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ چھوٹا سیٹھ ہنسنے لگتا تو منشیوں کی باچھیں کھل جاتیں اور گدی میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پیار و محبت کی باتیں کی جاتیں۔ فوراً چائے کا آرڈر دیا جاتا۔ خوشی اور مسرت کی لہریں ہر شخص کا سواگت کرتیں۔ لیکن یہ منظر زیادہ عرصہ تک نہ رہتا۔ بڑے سیٹھ کے آتے ہی یہ طلسم ٹوٹ جاتا۔ چھوٹا سیٹھ ایک بھیگی بلی کی طرح اپنی جگہ پر دیوار سے پیٹھ لگا کر کاغذوں کی ورق گردانی میں مشغول نظر آتا اور چاروں طرف ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔

دونوں بھائیوں میں کبھی کبھار ان بن بھی ہو جاتی تھی۔ معاملہ جائیداد بانٹنے تک پہنچ جاتا۔ لیکن جب کبھی روپیوں کی تقسیم کا سوال آیا بڑے سیٹھ نے بڑی چابکدستی سے اس مسئلے کو سلجھا دیا اور گدی کا کام کاج پھر اسی طرح ہونے لگا۔

لیکن کچھ دنوں سے دونوں میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ چھوٹا سیٹھ بڑے سیٹھ کی نگاہوں میں بے حد نرم مزاج واقع ہوا تھا اور یہ لچک اس کے ساتھ انسانیت کی تھوڑی سی رمق بڑے سیٹھ کو بے حد ناپسند تھی۔

"زمانہ بدل رہا ہے۔ بھیا۔ اب ہمیں اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔" چھوٹا سیٹھ کہتا۔

"لیکن چاندی کی رنگت تو نہیں بدلی منشو۔ روپے کی رنگت تو اسی طرح سفید ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں نے اپنی محنت سے کمایا ہے تم اسے گنوا کر دم لوگے اور پھر پائی پائی کیلئے مارے مارے پھروگے۔"

چھوٹا سیٹھ اس جواب کو سن کر خاموش ہو جاتا۔ وہ اپنے بھائی کی طبیعت کو اچھی طرح جانتا تھا یہاں بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے دونوں بھائی کراچی میں روپے کی لین دین کا بیوپار کرتے تھے۔ روپیہ کو سود پر دینا اور ساتھ میں ہنڈی بزنس کرنا اُن کا دھندا تھا۔ اسی تجارت میں دونوں بھائیوں نے لاکھوں روپے کمائے تھے۔ روپے لینے والے کو کس طرح اپنے شکنجے میں رکھا جاتا ہے۔ اس بزنس میں

بڑے سیٹھ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کہیں روپئے لینے والے نے روپئے دینے میں ذرا بھی تاخیر کی تو بیچارے کا گھربار آن واحد میں قرق ہو جاتا۔ بڑے سیٹھ کی ساری زندگی کچہری میں گذری تھی اُسے تقریباً تقسیم سے پہلے بھی اور تقسیم کے بعد بھی ہر روز کچہری جانا پڑتا، کچہری میں ہر روز جاتے جاتے اُسکے احساسات میں ایک پتھر یلی تہہ سی جم گئی تھی، زندگی کی نرم رَو، انسانی زندگی سے محبت، دوسروں کے دکھ درد کو اپنا سمجھنا، کسی سے ناجائز سود نہ لینا یہ تمام باتیں اُس کے ذہن سے مفقود ہو گئی تھیں، اور اُس کی جگہ وہ ایک قابل ذہین اور چالاک وکیل بن گیا تھا۔ حریف کو شکست فاش دینے میں بڑے سیٹھ کو اچھا خاصا لطف آتا اور وہ ہمیشہ دوسروں کی خامیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا۔ گاہک کو جال میں کیسے پھنسایا جاتا ہے، اُسے اپنی مٹھی میں کیسے رکھنا چاہئے، اُس سے سود در سود روپئے کیسے وصول کرنا ہے اور صرف سود ہی نہیں بلکہ موقعہ مل جائے تو اُس کی ساری جائیداد کیسے ہڑپ کی جاسکتی ہے، ان تمام حربوں اور ہتھ کنڈوں سے سیٹھ دھن پت رائے اچھی طرح واقف تھے۔ قانونی نکتوں سے واقفیت، اُس کی باریکیوں سے آگاہی اور کچہری کے پیچ وخم میں انھوں نے اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، قانونی چارہ جوئی کے بارے میں اگر کوئی بات پوچھنا ہو تو سیٹھ دھن پت رائے سے بہتر آدمی ملنا مشکل تھا۔

تقسیم کے بعد وہ کافی روپئے لائے تھے۔ لیکن اتنا روپیہ ہونے کے باوجود انھوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کی ۹۰ ایکڑ زمین جو پاکستان میں رہ گئی تھی اُس کا معاوضہ ملنا چاہئے چار کوٹھیاں کراچی میں تھیں ان کی قیمت ملنا چاہئے۔ اب حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کو اُن کی جائیداد کی تھوڑی بہت رقم مل جائے۔ تو بیچاروں کی قسمت کھل جائے۔

ویسے بمبئی میں رہ کر جلد ہی انھوں نے ہنڈی کا بزنس شروع کر دیا۔ بمبئی کی سرزمین اِس معاملے میں بڑی سرسبز و شاداب ہے۔ یہی تو ایک شہر ہے جہاں ایک ہزار کے دس لاکھ بنتے ہیں۔ منٹوں میں آدمی لاکھوں کا مالک بن جاتا ہے اور منٹوں میں فٹ پاتھ پر چکر کاٹتا نظر آتا ہے۔

لیکن خدا بھلا کرے سیٹھ دھن پت رائے کا کہ وہ روپئے کی بازی کبھی نہیں ہارے۔ دو چار ہاتھ ایسے مارے کہ بمبئی کی گدی چل نکلی۔ ایک دو سالوں میں ایک شاخ کلکتے میں کھول لی۔ دوسری مدراس میں

اور تیسری نسل بمبئی میں اور روپیہ اب خود کے گرد گھومنے لگا۔

آجکل دونوں بھائی الگ الگ رہتے تھے۔ دونوں کے پاس سکنڈ ہینڈ کاریں تھیں شاید کسی کا لک لی، جس کی ہونی ہوگی، اور جب کار کا مالک اصل اور سود ادا نہ کرسکا ہوگا تو یہ کاریں آہستہ آہستہ سیٹھوں کے پاس منتقل ہوتی گئیں اور بمبئی کی کھلی ہوئی سڑکوں پر گھومنے لگیں۔

روپیے کیسے نہیں جاتے اور پھر بمبئی جیسے شہر میں؟ کاروبار ہر شخص کر رہا ہے۔ اس شہر میں گاہکوں کی کمی نہ تھی۔ اسی شہر میں زندہ انسانوں نے بڑے بڑے قبرستان بنا رکھے ہیں یہاں انسانوں کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔ اسی بیسوی صدی میں اسی شہر میں انسان، انسان کو کھا جاتا ہے اور پولیس کو خبر تک نہیں ہوتی۔ دراصل بیوپار میں انسان بے غیرت ہو جائے تو روپوں کی کمی نہیں۔

اتنا روپیہ کما لینے کے باوجود دونوں بھائیوں کی خصلتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ہر لمحہ روپئے کی ہوس بڑھتی گئی۔ زندگی چاندی کے سکوں کے گرد طواف کرنے لگی۔ روپیہ بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ سنگدل ہوتا ہے جابر ہوتا ہے اسی لئے سیٹھ بھی پتھر کے ہوتے ہیں۔ بے رخی، سختی، بے رحمی، سنگدلی اور کمینگی بڑھتی گئی جب کبھی چھوٹا سیٹھ ترحم کے جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کہتا جس میں کچھ انسانیت کی جھلک نظر آتی تو بڑا سیٹھ ایک طرح چھوٹے سیٹھ کے ذہن پر بے رحمی، بربریت اور کمینگی کے کوڑے مارتا۔ حتی کہ چھوٹا سیٹھ اپنے حساسات کو کسی کرسانپ کی طرح کنڈلی مار کر اپنے بل میں گھس جاتا اور دل ہی دل میں کڑھتا۔ اس کے جی میں آتا کہ ابھی بٹوارہ کراؤں جائیداد کا۔ لیکن بڑے بھائی کے آگے اسکی ہمت نہ پڑتی۔ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکتا۔ بڑا سیٹھ تو باپ کے برابر تھا اور بڑے سیٹھ کی گالیاں اور گھڑکیاں سننا اس کا فرض اولین تھا۔ آجکل چھوٹا سیٹھ اس فرض کے لبادے کو اوڑھ کر گدی کا کاروبار کو اچھی طرح چلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چھوٹا سیٹھ راہ راست پر آ رہا تھا وہ جھنجھلاتا تھا چلاتا تھا لیکن اس احتجاج کے باوجود بڑے بھائی کے اشاروں پر چلتا تھا کیونکہ بنک بیلنس روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اور روپیہ تو اس شہر میں عزت اور وقار کا سب سے بڑا نشان ہے۔

آج معاملہ کچھ دگرگوں تھا بڑا سیٹھ غصے سے بھرا ہوا بیٹھا تھا ابھی تک اس کے کھردرے ہونٹوں پر تبسم کی جھلک نہ آئی تھی۔ ایک دو گاہک بڑے سیٹھ کے انتظار میں تشریف فرما تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ سیٹھ

کا موڈ ذرا ٹھیک ہو جائے۔ تو روپیوں کی بات چیت کی جائے۔ چھوٹا سیٹھ جانتا تھا کہ آج بڑے سیٹھ کا موڈ بہت ہی خراب ہے۔ نہ جانے وہ کب اور کس وقت اور کس پر برس پڑیں۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بڑے سیٹھ نے عینک کو اپنی ناک پر جماتے ہوئے کہا۔ سالی اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے، دو ٹکے کی چھوکری اور سیٹھ دھن پت رائے سے ٹکر لیتی ہے۔ حرام جادی کو ایسی پٹخنی دوں گا کہ ساری عمر یاد کرے گی۔ کہتی ہے شوٹنگ میں نہیں آؤں گی۔ میں دیکھتا ہوں وہ شوٹنگ میں کیسے نہیں آئے گی۔ کیوں منو؟"

ایک گاہک جو روپئے لینے آیا تھا، سیٹھ کے بگڑے ہوئے تیوروں کو دیکھ کر ذرا چاپلوسی کے انداز میں بولا "کون سی لڑکی ہے جی!"

"ارے وہی چندرا ولی نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ دو ٹکے کی چھوکری اور رُباب ہم پر کرتی ہے۔ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ مکان، زمین، موٹر قرق نہ کرالی تو نام دھن پت نہیں، عمر گذری ہے کچہری میں اور سالی نے جو ہمارے ساتھ کنٹریکٹ کیا ہے اُس کو شاید پڑھا نہیں، اس میں ایک (C l a u s e) صاف لکھی ہے۔ اگر مقررہ وقت پر روپیہ واپس نہ کیا گیا تو ڈائن (As a Person) میرے پاس گروی ہے۔ یعنی میں اُس کی جائیداد کے علاوہ اُسے بھی (As a Person) بیچنے کا حق رکھتا ہوں اور جن فلموں پر وہ کام کر رہی ہے۔ اُن سے روپئے وصول کر سکتا ہوں، اگر پھر بھی وصولی پوری نہ ہوئی تو اُسے کوٹھے پر بٹھا سکتا ہوں۔ سمجھا کیا ہے، اس رانڈ نے ہم سے ٹکر لینی ہے" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی میلی دھوتی کو سنبھالا۔ اور بیڑی کو دوبارہ سلگایا سر پر ہاتھ پھیرا اور گدّی پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر فتح آلود نگاہ ڈالی اور چٹائی پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئے۔ سننے والوں کی نگاہیں شرم سے جھک گئیں۔ لفظ رانڈ، As a Person اور سائی کا استعمال جس چٹخارے سے بڑے سیٹھ نے کیا تھا وہ لاجواب تھا۔ جو گاہک روپئے لینے آئے تھے اُن کے دل بیٹھ گئے لیکن مسکرانے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ وہ تو اپنے سامنے ایک مکمل بھگوان کو دیکھ رہے تھے جو بیسویں صدی میں اپنے روپئے کی طاقت پر ایک عورت سے، روپئے وصول کرنے کے لئے اُسے کوٹھے پر بٹھانے کی ہمت رکھتا تھا اور یہ بانگ دُہل یہ بات کہتا تھا۔ یہ بات سیٹھ دھن پت نہ کہہ رہے تھے بلکہ چاندی کے سکوں کی کھنکھناہٹ تھی اور اس کھنکھناہٹ نے بربریت ظلم و استبداد اور کمینگی اور ریاکاری کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ سفید چاندی کے سکوں پر کوڑھ کے داغ ابھر آئے تھے، یہ الفاظ سُن کر

ساری گدی میں ایک دہشت سی طاری ہوگئی۔ منیموں کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ چہروں پر مایوسی اور اداسی جھلکنے لگی۔

بڑے سیٹھ نے اصل ملکیت پر نگاہ ڈالتے ہوئے محسوس کیا۔ اُن کی فرعونیت حد سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اتنی بے باکی ابھی نہیں۔ انھوں نے خنجر بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ بات نہیں صاحب جو لوگ شرافت سے بزنس کرتے ہیں تمام کے ساتھ دیانت داری و شرافت سے برتاؤ کرتے ہیں۔ اپنی دیانت صاف ہے۔ پائی پائی کا حساب رکھتے ہیں کسی کا روپیہ نہیں مارتے۔ ابھی کل ہی ایک صاحب کہنے لگے دو دن کی مہلت دے دیجیے سیٹھ صاحب۔ میں نے کہا کل میرا [illegible] تک روپیہ دے دینا۔ یہ تو ہوئی نا بزنس کی بات۔ لیکن یہ کوئی بات ہے کہ روپیہ [illegible] اور ڈیڑھ گھنٹہ ہم سے بات نہ کیجیے۔ غسل خانے میں نہاتی رہے اور [illegible] بیٹھی رہے۔ اور چائے پینے کے بعد ایک گھنٹہ تک میک اپ لگاتی رہے اور ہم [illegible] انتظار کرتے۔ [illegible] آئی ایکٹریس [illegible] جوانی ڈھونڈتی [illegible] وہ ہماری [illegible] ہوگی۔ [illegible] جوتی کی نوک کے برابر سمجھتی ہو وہ ہماری کیا قدر کرے گی۔ میں نے تو اس کے فائدے کی کہہ دیا۔ یہ [illegible] کہیں کا نہ رکھے گی۔ اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے [illegible] شریف [illegible] اُس کا دن بھر مارا مارا پھرنا ہے۔ ہم نے اُس کا منہ دیکھ کر روپیہ دیا تھا اور آج وہ [illegible] ہم پہ رعب جماتی ہے۔ کہتی ہے ہمارے گھر آؤ تو بات کروں گی۔ میں نے تو کہہ دیا کہ جب تک تم ہمارے گھر نہ آؤ گی معاملہ طے نہ ہوسکے گا۔ [illegible] روپیہ ہم دیں اور [illegible] جمائے ہم پہ۔ سالی کا سارا گھر برباد کردوں گا۔ جہاں جہاں کام کرتی ہے وہ روپیہ ضبط کراؤں گا۔ [illegible] ماری نہ پھرے تو اپنا نام سیٹھ دھن پت نہیں۔ یہ بال دھوپ ہی میں سفید نہیں کئے ہیں۔" یہ کہہ کر سیٹھ دھن پت اپنی میلی دھوتی اکٹھی کرنے لگے۔ اُن کی ٹانگیں ادھ ننگی تھیں اور بجھے ہوئے بیڑی کے ٹکڑے کو سلگا کر پھر کہنے لگے "آجکل نرمی سے کام نہیں چلتا۔ منیم اُس رانڈ سے کہہ دو۔ کل ہمارے گھر آئے۔ اکیلی نہیں اُس بھڑوے کو ساتھ لائے۔ جبھی معاملہ صاف ہوسکے گا۔ نہیں تو ہتکڑی لگوادوں گا۔ کوٹھے پر بٹھادوں گا۔ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو حرام جادی کتیا کہیں کی۔"

یہ کہتے کہتے سیٹھ صاحب کے ناک کے نتھنے پھول گئے اور حلق کچھ سوکھ سا گیا۔ جو گاہک روپئے لینے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے یہاں سے کھسکنا ہی مناسب سمجھا۔ اچھا موقع نہیں تھا روپئے مانگنے کا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور سیٹھ صاحب کا نوکر ڈبے میں کھانا لایا تھا اور سیٹھ صاحب کو پیٹ بھرنا تھا۔ چھوٹے سیٹھ نے اُدھار مانگنے والوں کو اشارہ کیا کہ اس وقت چلے جائیں تو اچھا ہے۔ ان حضرت کا دماغ بھنا گیا ہے، روپئے اس وقت نہ مل سکیں گے۔ گاہکوں نے اشارے کو بھانپ لیا اور گردن جھکا کر گدی سے نکل گئے۔

سیٹھ صاحب نے کھانے کے ڈبے کو کھولا۔ ایک ڈبے میں زرد زرد سی دال بند تھی دوسرے ڈبے میں کچھ خشک روٹیاں اور اچار کی ایک پھانک۔ تیسرے ڈبے میں چاول تھے اور ساتھ ہی طوطہ مار کر آم دم توڑ رہا تھا اور سیٹھ صاحب نے کسی سے نہ پوچھا کہ کھانا کھاؤ گے یا نہیں۔ خود کھانا کھانے لگے۔ چھوٹا سیٹھ شاید کھانا کھا کر آیا تھا، اور منشیوں کو دعوت دینا ان کی شان کے خلاف تھا۔

بڑے سیٹھ نے چھوٹے سیٹھ کی طرف دیکھا وہ ٹانگیں پسارے آنکھ بند کئے ہوئے دیوار کا سہارا لئے ہوئے آرام کر رہے تھے۔ تمھاری شرافت رنگ لاتی ہے سنتو۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں روپیہ کمانا آسان بات نہیں۔ روپیہ بڑی مشقت سے کمایا جاتا ہے سنتو لیکن جاتا ہے فٹافٹ۔ اب بتاؤ اتنے ہزار روپئے دے کر وہ لونڈیا ہم پر رُعب کرے تو ہم کہاں کے رہے۔ تم اس سے مسکرا مسکرا کر بات نہ کرتے تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔ بہر حال اس کے خاوند سے کہو کہ اپنی لونڈیا کے ساتھ رات کے آٹھ بجے ہمارے گھر آئے نہیں تو کل صبح تک اس کا گھر اور گھر میں تمام رکھی ہوئی چیزیں نیلام کرا دوں گا اور ہاں اس رانڈ سے کہنا اکیلی کو ٹھے مٹکاتی ہوئی نہ چلی آئے شرافت سے اپنے خاوند کے ساتھ آئے۔

یہ کہہ کر وہ پھر کھانے میں مشغول ہو گئے۔

سنت نارائن دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بڑے سیٹھ اگر گالیاں نہ بکتے تو چند ہنڈیاں اور نکل جاتیں لیکن سنت نارائن کیا کرتا غصے کو ایسا پی گیا جیسے بچہ شہد کو چاٹ جاتا ہے۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سیٹھ دھن پت رائے اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے چندراولی اور اُس کے خاوند کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم پرانی وضع قطع کی چیزوں سے آراستہ تھا صوفہ سٹ

بے حد پرانا تھا۔ اُس کے بازو میلے اور گندے، فرش پر ایک ردی اور دری پر ایک گندا سا قالین اور لوہے کی الماریاں دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ صوفہ سیٹ کے قریب ہی ایک میز تھی جس پر ایک پرانی گھڑی رکھی رہتی تھی۔ اس کمرے میں چار کرسیاں تھیں جن کی سیٹیں پھٹ گئی تھیں۔ دیواروں پر کیلنڈروں کی بھرمار تھی۔ ہنومان جی کا کیلنڈر، لکشمی جی کا کیلنڈر، سائیں بابا کیلنڈر اور اسی طرح مختلف دیوی دیوتا۔ اُسی ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کو جھانکتے ہوئے سیٹھ صاحب ایک گدے پر بیٹھے ہوتے تھے جس پر ایک سفید چادر بچھائی گئی تھی۔ وہ بیڑی پر بیڑی پھونک رہے تھے، گدے پر بیٹھے ہوئے کبھی وہ اس ران کو کھجانے لگتے کبھی اس ران کو۔ کبھی دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھتے اور بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر۔ اور اگر کچھ نہ ہوتا تو دونوں ٹانگیں اوپر کرکے سر کھجانے لگتے۔

آج تک سیٹھ صاحب کو کسی عورت سے پالا پڑا تھا۔ ایک عورت تو تھی گھر میں لیکن وہ اُسے عورت نہ سمجھتے تھے کیونکہ عورت اُن کے عقیدے کے مطابق جاہل ہوتی ہے۔ عقل کا نام و نشان نہیں رہتا اور عورت وہ جو گھر میں رہے اور اپنے خاوند کی داسی بن کر رہے۔ عمر بھر اُس کے پاؤں کی دھول چاٹتی رہے۔ ان کا مقولہ تھا۔ جب کبھی عورت مرد کے سامنے سر اٹھائے اُسے ایسا تھپڑ رسید کر دو کہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ یوں تو سیٹھ رحمن بہت کائیاں مزے کے آدمی تھے۔ باتوں ہی باتوں میں عورت کے متعلق بات کرکے ذہنی حظ حاصل کر لیتے۔ جس عورت سے شادی ہوئی تھی اُس سے چھ بچے تھے تین لڑکیاں اور تین لڑکے۔ اپنی بیوی کو ساری عمر محض نوکرانی ہی سمجھا۔ یہ بات تو نہیں کہ ان کی بیوی نوکرانی کا کام کرتی تھی، بلکہ گھر میں نوکر موجود تھا۔ ایک فلیٹ جس کے تین کمرے تھے، ایک کار جس کا ڈرائیور موت کو بلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے سب کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اگر کبھی کار کا ٹائر پنکچر ہو جاتا تو ڈرائیور کی شامت آجاتی۔ گھروالی کہیں سالن میں نمک زیادہ ڈال دیتی تو رات بھر گالیوں کی وہ بوچھار ہوتی کہ سارا گھر ایک قبرستان بن جاتا۔ بچے کونوں میں دبک جاتے اور آنکھیں بند کرکے زبردستی سونے کی کوشش کرتے۔ گھر کا ہر شخص اُن سے ڈرتا تھا کیونکہ رحمن بہت روپئے کمایا کرتے تھے۔ ایک ہزار سے دس ہزار بنانے کا طریقہ آتا تھا اور یہ طریقہ ہر شخص کو نہیں آتا۔ ہر انسان کے بس کی بات نہیں

سیٹھ دھن پت تو اپنے عہد کے ایک جادوگر تھے اور اُن کے جادو کی چاروں طرف دھوم تھی، گھر والے اُن کے دوست، رشتہ دار، جان پہچان والے اُن کی ذہانت کی داد دیتے تھے، اور اکثر کہتے تھے، جب کوئی شخص سیٹھ دھن پت کے سامنے آتا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے اور گاہک کو بڑے سیٹھ کی ہر بات ماننا پڑتی ہے۔ اس لئے جب بڑے سیٹھ نے چھوٹے سے کہہ دیا کہ چندراولی کو گھر بھیج دینا تو ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ اب معاملہ طے ہو جائے گا۔ اور وہ رانڈ راہِ راست پر آجائے گی اور سیٹھ کا جادو سر پر چڑھ کر بولے گا۔

ادھر سیٹھ اسی انتظار میں تھے کہ باہر کار کے ہارن کی آواز آئی، سیٹھ دھن پت ایک لمحہ کے لئے چونکے۔ پھر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا زندگی میں پہلی بار ایک عورت سے بزنس کے معاملہ میں پالا پڑا تھا۔

نیچے کا دروازہ کھلا۔ پھر زور سے دروازہ بند ہوا، سیڑھیوں پر ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سیٹھ نے چہرے پر کرختگی کے آثار پیدا کر لئے، تاکہ آنے والے کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ سیٹھ کا موڈ اچھا نہیں۔

اتنے میں چندراولی کمرے میں داخل ہوئی۔

"نمستے سیٹھ جی"۔ اُس نے گدے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نمستے چندراولی"۔ سیٹھ نے چندراولی کو دیکھا اور بیڑی کو بجھا دیا۔ اچانک سیٹھ کو خیال آیا کہ چندراولی اکیلی آئی ہے"۔

"ارے آپ اکیلی۔ شام چند نہیں آئے"۔

"جی وہ نہیں آئیں گے۔ دراصل معاملہ میرے ساتھ کا طے ہوا تھا نا سیٹھ جی، میری ضمانت پر آپ نے روپئے دئے تھے اس لئے انھوں نے آنا ضروری نہ سمجھا۔ میں نے سوچا میں خود آپ سے معاملہ طے کر لوں۔" یہ کہہ کر وہ ذرا سنجیدہ سی ہو گئی اور پاؤں بڑھا کر ذرا آسودہ حالت میں بیٹھ گئی اور سیٹھ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔

چندراولی نے بات ٹھیک کہی تھی اور چندراولی کو بات کے کہنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ فلموں میں۔ کام

کرتے کرتے وہ اس بزنس کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ اُسے کیا کہنا چاہئے اور کس طرح کہنا چاہئے۔ جب عقل اور جسم کو بیچنا ہی ٹھہرا تو پھر ڈر کس بات کا۔ لیکن اس کے علاوہ چندراولی زندگی کے دوسرے لوازمات سے بھی آگاہ تھی۔ وہ مردوں کی کمزوری سے بھی آشنا تھی۔ اگر سیٹھ دھن پت روپیہ کمانا جانتے تھے تو وہ بھی اس معاملے میں کسی سے کم نہ تھی۔ وہ روپے کمانے کے علاوہ مردوں کو لوٹنا بھی جانتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے وہ یہ جانتی تھی کہ مرد کب کہاں کس وقت اور کس آدمی پر اور کیوں ڈورے ڈالے۔ سیٹھ اس کے سامنے زیادہ سے زیادہ قانونی نکتوں کو استعمال کر سکتے ہے تھا۔ لیکن چندراولی سے پیشہ کا خون سے بس بھی یہ درست تھا بات ہے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور آسمان تاروں سے منور تھا۔ سڑکوں پر گہما گہمی تھی لیکن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ چندراولی نے موسم اور وقت کے مطابق اپنے آپ کو آراستہ کیا تھا۔ چندراولی یہ جانتی تھی کہ سیٹھ نے آج تک کبھی ایسی عورت سے بات کی تھی اور نہ ہی شاید سیٹھ کو اس بات کی جرأت ہوئی کہ وہ ایک حسین عورت سے ہنس کر بات کر سکے۔ وہ بہت ہلکے گلابی رنگ کا ساڑی پہنے ہوئی تھی اور ساڑی کا رنگ ذرا زیادہ گلابی تھا۔ گلے میں موتیوں کی ایک مالا جو اس کے سینے تک لٹک رہی تھی جس کے موتی شفاف تھے۔ قیمتی ہیرے ہاتھوں کی انگلیوں میں چمک رہے تھے۔ کانوں میں کالے نگ جڑے ہوئے جھمکے اور ماتھے پر ایک بندی اور کھلے ہوئے بال پیچھے سے سمٹے ہوئے اور ایک خوشبودار بھینی بھینی ایک مہک اس کے جسم سے آ رہی تھی۔ آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو یوں سنوار رکھا تھا کہ نگاہیں خود بخود اس پر گڑ جائیں۔ بات کرنے کا انداز نہایت پُر جاذب ہے اُس کی سب سے زیادہ عمدہ ادا ہی گرمجوشی تھا۔ جس نے سیٹھ دھن پت سے بات کرنی چاہی۔

یہ انداز کچھ ایسا تھا کہ سیٹھ پر اُس کا جادو چل گیا کیونکہ جس بے رخی کو لے کر سیٹھ نے حد سے دور ہونا چاہا تھا وہ بے رخی وہ غصہ آن واحد میں کافور ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں چندراولی کا نقشہ اور تھا۔ اس نے چندراولی کو ایک بازاری قسم کی عورت سمجھا تھا۔ ترچھی بھویں، ہونٹوں پر لال لال رنگ، چہرے پر غازہ ہی غازہ، منہ میں پان، کپڑے شوخ رنگ اور باتوں میں عامیانہ پن۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ اب تو ذرا سنبھل کر ذرا تمیز کے ساتھ اور ذرا صحیح کر بات کرنا ہو گی۔ کہیں سارا معاملہ ہی نہ بگڑ جائے۔ اس لئے سیٹھ نے اپنے لب و لہجہ کو بدلا۔ چہرے کی درشتی اور سختی کو نرم کیا۔ لبوں پر جو کھنچاؤ تھا اُس کے اثر کو زائل کرنے کی

کوشش کی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر گولڈ فلیک کا ایک ڈبہ سیلف سے نکالا اور چندرا دلی کو پیش کیا۔ کیونکہ سیٹھ نے سنا تھا کہ ایکٹریسیں سگریٹ پیتی ہیں۔ لیکن چندرا دلی نے بڑی انکساری سے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا۔

سیٹھ نے فوراً نوکر کو آواز دی "دو کپ چائے۔ اور وہاں بی بی جی سے کہو۔ کہ کچھ بھیج آل کر بھیج دے"

"اجی رہنے دیجئے نا۔ بس چائے پی لوں گی" اور وہ بھی آپ کے کہنے پر۔ کیونکہ آپ کے گھر پہلی بار آئی ہوں۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں بہت مغرور ہوں۔ ویسے تو یہ وقت چائے پینے کا نہیں۔" اور یہ بات کہہ کر وہ ہنس دی۔ اُس کے موتیوں ایسے دانت سیٹھ کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔

بھان متی کے دانت تو بہت میلے ہیں۔ اُس نے سوچا خیر۔ یہ سوچنا بے سود ہے۔ اور اُس کی نگاہ چندرا دلی کے دانتوں سے ہوتی ہوئی، سیاہ بالوں کو دیکھتی ہوئی، پھسلتی ہوئی۔ چندرا دلی کی ٹانگوں کی طرف چلی گئی اور اچانک پاؤں تک جا کر رک گئی۔ ہائے یہ کتنے خوبصورت پاؤں تھے۔ پیروں پر مہندی سے مینا کاری کی گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پاؤں اور ان پر لال لال لکیریں اور پھر گول گول نقطے، سُرخ سُرخ سے۔ ناخنوں پر ہلکا گلابی رنگ۔ جلد کا رنگ گورا گورا۔ صاف بے داغ پاؤں اور ایڑیاں اُجلی اُجلی سی اور اُن پر ایک نیلی رگ پھڑک رہی تھی۔ ہائے یہ کیسے پاؤں تھے۔ کسی کے سینے سے زیادہ نرم اور گداز، جس کے پاؤں ایسے تھے اُس کا حسن کیسا ہوگا۔ یہی تو چندرا دلی ہے۔ اُس نے ماچس جلا کر بیڑی کو سلگانا چاہا۔ لیکن سیٹھ جی بیڑی نکالنا بھول گئے تھے۔ جلدی سے چندرا دلی نے سیٹھ جی کو بیڑی پیش کی۔ اور اُن کے ہاتھ سے ماچس لے کر جلائی اور پھر ذرا جھک کر اُن کی بیڑی کو سلگایا۔ ایک ہلکی سی خوشبو سیٹھ کے نتھنوں سے ٹکرا گئی۔ اور پھر یہ خوشبو فضا میں تحلیل ہو گئی۔ آہستہ آہستہ ایک ہلکا سا نشہ سیٹھ کی رگ و پے میں سمانے لگا۔ یہ کیسی خوشبو تھی۔ یہ کیسی بساند تھی۔ یہ چہرہ جو قریب آیا اور پھر یکبارگی پیچھے ہٹ گیا۔ یہ آنکھیں جو آگے جھکیں اور آن واحد میں پیچھے ہٹ گئیں۔ یہ ہنستے ہوئے شہد آگیں ہونٹ۔ اُس نے شہد کبھی نہیں کھایا تھا نام ضرور سُنا تھا۔ کیا انہیں ہونٹوں کو شہد آگیں کہتے ہیں۔ کیا انہیں بالوں کو زلفیں کہتے ہیں۔ کیا انہیں آنکھوں کو شاعر کنول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کیا ایسی عورت کو جنت کی حور کہتے ہیں۔ کیا ایسی خوشبو انسان کو بن پیئے شرابی بنا دیتی ہے۔ یہ پھول کا تن سینے سے لے کر ناف تک ایک صندل سی

تھی۔ کیا اسی کو جادو کہتے ہیں۔ جادو تو میرے پاس بھی ہے۔ یہ روپئے کا جادو لیکن اس حسن کے سامنے سب ہیچ ہے۔ یہ روپیہ محض سکہ ہے، پتھر ہے، ٹھنڈا ہے۔ یخ بستہ ہے اس میں حرکت نہیں، چندرا دلی کا جادو متحرک ہے۔ اس میں ایک ہلکا ہلکا سا نشہ ہے جو اس کی شہ رگ میں اترتا جا رہا ہے۔ یہ میٹھا میٹھا سا زہر ہے جو اس نے کبھی نہیں چکھا۔ بھان متی، میں ان گنت صدیوں تک کس اندھیرے میں رہا۔ میں نے ساری عمر اندھیرے میں گزاری۔ یہ روشنی کی کرن کدھر سے آ نکلی۔ کیا یہ چھ بچے میرے ہی تھے اور تو آج تک میری استری

بیڑی پھر بجھ گئی۔ چندرا دلی نے ہاتھ بڑھایا، لیکن سیٹھ اپنے ہوش میں تھا۔ اس نے خود بیڑی کو سلگایا اور حسن کے لذت کش پہلو سے اپنے آپ کو کنارہ کش کرتے ہوئے کہا "تو آپ نے شوٹنگ میں آنے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

"میں نے شوٹنگ میں آنے سے انکار نہیں کیا۔ میں نے صرف یہی کہا تھا کہ پہلے معاملہ طے ہو جائے پھر حاضر خدمت ہو جاؤں گی۔ اپنا کام تو ایکٹنگ کرنا ہے۔ سیٹھ جی اس سے بھلا کیسے ہٹ سکتی ہوں، کام سب سے پہلے، آرٹ سے بے وفائی نہیں کر سکتی سیٹھ صاحب۔

سیٹھ دھن پت رائے اس خوبصورت آواز سے لطف اندوز ہوتے رہے اُن کے کانوں میں یہ نغمہ آہستہ آہستہ سرایت کرتا رہا۔

"اور کام تو میں کرتی ہوں نا سیٹھ جی، میرا خاوند تو میری کمائی پر زندہ ہے نا۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔ اور چندرا دلی چائے بنانے لگی۔ اور سیٹھ خاموشی سے اُن لمبی لمبی انگلیوں کو دیکھتا رہا، اُن پالش شدہ ناخنوں کی حسین رنگت سے حظ اٹھاتا رہا۔ چندرا دلی نے پہلے پیالی میں شکر ڈالی پھر چائے اور پھر سیٹھ کی طرف کن آنکھیوں سے دیکھا۔ سیٹھ حیرت سے چندرا دلی کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کتنے پیارے ہاتھ تھے سفید براق، یہ انگلیاں کتنی نرم ہوں گی، یہ جلد کتنی ملائم ہو گی۔ یہ ناخن کتنے دل پذیر تھے۔

چندرا دلی نے سیٹھ کو پیالہ دیتے ہوئے کہا "میں اپنے خاوند سے تنگ آ گئی ہوں۔" سیٹھ نے مسکراتے ہوئے چائے کی پیالی پکڑ لی۔ ایک لمحہ کے لئے نگاہیں ملیں، پھر نگاہیں شکست کھا کر پیالے کی طرف

جھک گئیں۔ بزنس میں عقل اور سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے، سیٹھ جی بس چار پانچ سال کی بات ہے، پھر مجھے کون پوچھے گا، یہ حُسن، یہ جوانی تو چند روز کی بات ہے۔ عورت جب اپنا حُسن کھو دیتی ہے تو پھر اُسے کوئی نہیں پوچھتا۔ چندراولی نے اپنی ٹانگوں کو سکیڑا اور ریشمی ساڑی کو ذرا کھینچ کر اپنے پاؤں کو ڈھک لیا، وہ پیارے پیارے پاؤں، سیٹھ دھن پت کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ چندراولی اس انداز سے بیٹھی تھی کہ ساڑی چپک کر جسم کے حسین خطوط کو اور واضح اور بے نقاب کر رہی تھی۔

ہائے سارا بنک بیلنس ان حسین کولھوں پر قربان کر دیا جائے۔ سیٹھ نے سوچا، لیکن یہ خیال ایک لمحہ کے لئے اُس کے ذہن میں آیا اور دوسرے لمحہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

چندراولی نے کہا: "میں کام کے لئے تیار ہوں۔ مجھے صرف اپنی ایکٹنگ کا معاوضہ چاہئے۔ آپ ہاں کر دیجئے گا۔ بس معاملہ صاف ہے۔ مجھے آپ پر پورا وشواس ہے۔"

سیٹھ دھن پت نے سوچا جس آدمی سے کام لینا ہے اسے دام دینے پڑیں گے۔ لڑائی جھگڑے سے کیا فائدہ۔ دونوں نے چائے پی، بیسن کے پکوڑے کھائے اور پھر ہنس ہنس کر باتیں کیں اور سیٹھ کا غصہ ایک دم کافور ہو گیا۔ اُن کی گالیاں زبان پر دھری کی دھری رہ گئیں، شاید یہ گالیاں صرف مُنشیوں اور گاہکوں کے لئے مخصوص تھیں۔ چندراولی کا اُن پر حق نہ تھا۔

چندراولی نے سیٹھ سے اجازت مانگی اور سیٹھ صرف اس بات کی خواہش کر رہے تھے کہ کچھ عرصہ اور چندراولی یہاں ٹھہر جائے۔ چندراولی اُٹھی اور سیٹھ دھن پت نے بے اختیار اس بھرے ہوئے جسم کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے تاکا۔ جیسے وہ صدیوں سے بھوکے تھے۔ چندراولی نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔ "یہ چیک تو لیتی جائیے"۔ سیٹھ نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

چندراولی چلی گئی اور سیٹھ کھانے کے لئے باورچی خانے میں تشریف لائے۔ سیٹھانی نے ایک میلی سی چٹائی آگے کر دی۔ سیٹھ چپکے سے اُس چٹائی پر بیٹھ گئے، بھان متی نے تھالی آگے کی۔ تھالی اور بھان متی کو دیکھ کر سیٹھ دھن پت کو غصہ آ گیا۔ نہ جانے کیوں؟

تھالی میں خشک چپاتیاں تھیں۔ ایک طرف چاول تھے اور ساتھ ایک پیالی میں دال اور اچار کی ایک پھانک۔ اور وہی طوطا مار کہ آم۔ سیٹھ نے ایک لقمہ کھایا لیکن آج یہ لقمہ حلق سے نیچے نہیں اتر

رہا تھا۔ اس میں نمک نہیں تھا۔ سیٹھ غصّے سے جھنجھلا گئے تھالی کو زور سے پھینکا اور باورچی خانے سے باہر نکل گئے۔ دراصل کھانا بُرا نہ تھا۔ بھان متی اتنی بیوقوف نہ تھی اُسے معلوم تھا کہ سیٹھ کسی عورت سے بات کر رہے تھے اس لئے بھان متی نے کھانا بڑے پیار و محبت سے پکایا تھا۔ آج دیسی گھی زیادہ ڈالا تھا۔ پودینے کی چٹنی بھی تھی چپاتیاں گرما گرم تھیں لیکن سیٹھ کے ذہن پر نہ جانے کس کا بھوت سوار تھا۔"

آج منتھانی کی صورت سے پہلی بار سیٹھ کو نفرت ہوئی۔ ایک میلی دھوتی پہنے ہوئے۔ بال سفید اور بکھرے ہوئے ہاتھ دُبلے اور کالے چہرے پر جھریاں ہونٹ مُڑے ہوئے کانوں میں گھنٹا بندے، دانت ٹیڑھے میڑھے پیٹ کا گوشت لٹکا ہوا اور چار پیر کا جسم ڈھلا ہوا اور پاؤں کتنے گندے تھے ایڑیاں پھٹی ہوئی اور میل سے اٹی ہوئیں۔ اور پاؤں کے ناخن آج تو سیٹھ جی کا جی متلا گیا۔

رات کیسے گذری سیٹھ نے کیا سوچا۔ چندراولی کا چہرہ بار بار اُن کے سامنے آتا رہا۔ کیا سیٹھ دھن پت کو چندراولی سے محبت ہو گئی تھی۔ جی نہیں محبت نہیں ہو سکتی۔ وہ محبت کے لفظ سے ناآشنا تھے۔ آج تک انھوں نے کسی سے محبت نہ کی تھی۔ اگر محبت کی تھی تو صرف روپے سے لیکن یہ کیسی خواہش تھی، جو اس بڑھاپے میں انھیں پریشان کر رہی تھی یہ چھنکتی ہوئی آوازیں کیوں انھیں بار بار ستاتی تھی، وہ آواز جیسے ایک عجیب قسم کی موسیقی تھی۔ کیا اسی جذبے کو محبت کہتے ہیں۔ انھوں نے سوچا کیا وہ چندراولی کے لئے مر سکتے تھے۔ یعنی اگر چندراولی اُن سے کہتی۔ آؤ دونوں اس محبت کی خاطر زہر کھالیں، کیا وہ اس محبت کی خاطر زہر کھائیں گے۔ نہیں۔ بالکل نہیں وہ چندراولی کے لئے بالکل نہیں مریں گے، وہ چندراولی کے لئے زندہ رہیں گے۔ سیٹھ دھن پت نے کسی کے لئے مرنا نہیں سیکھا تھا۔ لیکن ایسی عورت۔ یہ آتشیں جسم، یہ دلفریب قوسیں، یہ من موہنی ہنسی، یہ سب کچھ اُن کی نگاہوں سے آج تک اوجھل تھے۔ صرف بھان متی . . . .

دوسرے دن جب سیٹھ گدی میں وارد ہوئے۔ تو چھوٹے سیٹھ نے پوچھا۔ "کیا فیصلہ ہوا؟"

"بس فیصلہ ہو گیا۔ ارے بھئی۔ وہ عورت کافی سمجھدار ہے۔ وہ تو بزنس کرنا جانتی ہے۔ کہنے لگی۔ مجھے تو کام کرنا ہے اور جو کچھ میں نے کہا وہ مان گئی بس۔ اور کیا۔"

سب لوگ ایک دوسرے کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ سیٹھ کا جادو واقعی چل گیا، بات بن گئی۔ چندراولی مان گئی۔ سب سیٹھ کی ذہانت کا سکہ مان گئے۔

چندرا ولی بڑی سمجھدار عورت تھی، ذہین اور قابل تھی، وہ سمجھتی تھی کہ اُس کا حُسن چند روز کا ہے۔ اور سیٹھ دھن پت کس قماش کا انسان ہے ایک ہی ملاقات میں وہ سیٹھ دھن پت کی سیرت کو سمجھ گئی۔ اب تو وہ ہر روز کسی نہ کسی بہانے سیٹھ کے فلیٹ میں آجاتی دونوں چائے پیتے بزنس کی باتیں کرتے۔ گدّی کے منشی یہ سمجھتے کہ سیٹھ نے رانڈ کو قابو میں کر لیا ہے۔ سالی کو ایسی پنجنی دی ہے کہ ساری عمر یاد کرے گی لیکن سیٹھ کے دل کی کیفیت کون جانتا تھا۔ شاید چھوٹا بھائی بھی بڑے بھائی کی اندرونی کیفیت سے ناواقف تھا۔ بات بڑھتے بڑھتے بڑھنے لگی۔ سیٹھ گدّی پر کم آنے لگا۔ ادھر چندرا ولی موقع کی تاک میں تھی۔

ایک دن اُس نے کہہ ہی دیا۔ "سیٹھ بزنس از بزنس۔ تم روپیہ کمانا جانتے ہو۔ اور میں بھی اگر عقل اور حُسن میں ملاپ ہو جائے، تو کیا بات ہے۔"

سیٹھ بھی یہی بات کہنا چاہتا تھا، لیکن جرأت نہ ہوتی تھی۔

"معاملہ سیدھا ہے تم نے شادی کی ہوئی ہے۔ چندرا ولی نے کہا "اور میں نے بھی۔ روپیہ میں کماتی ہوں۔ عیش میرا خاوند کرتا ہے۔ میں اُسے چھوڑ دینا چاہتی ہوں"۔

سیٹھ کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ چندرا ولی بولی "تم شادی نہیں کرنا چاہتے نہ کرو۔"

سیٹھ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بس یہی بات تھی۔ اُس نے سوچا۔

"لیکن تم مجھے اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ اور ہاں۔ تمھارے بیوی بچے انھیں ضرور اپنے پاس رکھو ایک خاص رقم انھیں ہر مہینے دے دو۔ تاکہ وہ زندہ رہ سکیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ شادی میں جلدی بھی کیا ہے۔ شادی پھر کریں گے۔ بس بات پکی ہونی چاہئے۔"

سیٹھ کچھ جواب نہ دے سکا۔ وہ جواب بھی کیا دیتا۔ شاید وہ جواب دینا چاہتا تھا، لیکن چندرا ولی نے سوچنے کا موقع نہ دیا۔

"میں انتظار کر سکتی ہوں، کھنڈالا میں کوٹھی کرائے پر لے لو۔ اکٹھے رہیں گے۔ جب جی میں آئے شادی کر لینا۔" سیدھی سادی باتیں تھیں۔ کوئی ہیر پھیر نہ تھا۔ سیٹھ دھن پت کی عمر پچاس سے اوپر تھی۔ ساری زندگی پتلی دال اور طوطا مارکہ آم کھا کر گذاری تھی، اور بھاوں متی اور اُس کے کنبے سے اُسے نفرت ہو گئی تھی۔

"دونوں مل کر بزنس کریں گے۔ سیٹھ میں بزنس میں تمھارا ہاتھ بٹاؤں گی۔ جب عقل اور حسن آپس میں

نیند دادی بی کی آنکھوں سے اُڑ کر دور بھاگ گئی — اِک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں — آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ یہ بڑے ابا ہی ہیں — ! وہی تو تھے — ہری چوخانی کی تہبند — ڈھیلا ڈھالا کالی کا ململ کا کرتا پہنے اور سر پر آڑی ٹوپی رکھے بڑے جلال میں آئے، پڑھتے چلے جارہے تھے — اللہ اکبر — اللہ اکبر —

صبح دادی بی نے اُٹھ کر سب سے کہا — "ارے سنتے ہو جی — صبح مطہر میاں نماز پڑھ رہے تھے —"

"کیا بات کرتی ہو اماں — بھلا بڑے بھائی اور نماز پڑھیں — ؟" بات اتنی بعید از قیاس تھی کہ دادی بی کے لاکھ یقین دلانے پر بھی کسی کو یقین نہ آیا —

بڑے ابا بھی بس اپنی طرح کے ایک ہی تھے — ہر حرکت انوکھی اور ہر عادت نرالی — دادی بی کو کیسا کیسا غصہ آتا ان کے خلال کرنے پر — مگر یہ سنتے کہاں تھے — ؟ بڑے ابا کا معمول تھا کہ ہر کھانے کے بعد خلال کرتے — گھر بھر کے بچے پچھواڑے کے نیم نیچے سے تیلیاں جمع کر کے لاتے اور گڈیاں سی بنا بنا کر رکھ لیتے — بڑے ابا پیسے پیسے کو ایک ایک گڈی خرید لیتے اور مزے سے خلال کرتے تھے۔ روز کا معمول تھا اِدھر کھانے پر سے اُٹھے ہاتھ دھوئے کلی کی، کاندھے پر پڑے رومال سے منہ پونچھتے آنگن میں آ، تخت پر چڑھ، پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے اور آواز لگائی —

"ارے بیٹے ! ذرا خلال کی ڈبیہ تو لانا —"

ادھر ڈبیہ آئی اور خلال چلنی شروع ہوگئی — دادی بی جل کر بولیں "اے ہار بیٹے نے لکڑیاں چلا چلا کر اچھے خاصے دانت موئے کھُل کھُلے کر لیے —"

اب یہ تو دادی بی بھی جانتی تھیں کہ دانت کھُل کھُلے عمر سے ہوئے تھے یا واقعی خلال نے اپنا رنگ دکھایا تھا۔ بڑے ابا دادی بی کے بچوں میں سب سے بڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادی ہو بیاہ گئی۔ بچے چھوڑ پوتے نواسوں والے ہوگئے مگر بڑے ابا وہی کے وہی رہے۔

بڑے میاں اور چھوٹے میاں کی نسبت ساتھ ہی ساتھ بھیجی گئی تھی۔ اب تو یہ اللہ ہے جسے چاہے نواز دے، مگر بات دراصل یہ تھی کہ چھوٹے میاں دیکھنے دکھانے میں بھی اچھے تھے اور ذرا چار حرف پڑھ گئے تھے ــــــ بیٹی والوں نے چھوٹے میاں کو تو ہاں کا جواب دے دیا اور بڑے میاں کے لئے صاف کہہ دیا ــــــ

"ہماری بیٹی بھیا میں بہہ کر تھوڑی آئی ہے کہ اُٹھا ماریں ــــــ" اب صاف سیدھی طرح ــــ ملتا تو کیا بُرائی تھی ــــ؟ مگر انھوں نے تو بس منہ پھوڑ طعنہ بہیّا کا دیا ــــــ بڑے میاں کو وہ تن تنا کر غصّہ آیا کر سارے میں بیٹھ دیا ــــــ

"شادی وہ کرے جس نے سُوّر کا گوشت کھایا ہو ــــــ"

اب بھائی بند سمجھا رہے ہیں، دوست احباب سَو سَو باتیں لا رہے ہیں، بجائے اس کے کہ قسم توڑتے۔ اُلٹے برس پڑے ان ہی پر ــــــ اور بولے ــــــ

"شادی کروں تو دو باپوں کی اولاد سمجھ لینا ــــــ"

یہ گالی تو صاف دادی بی پر پڑتی تھی ــــ بھلا دادی بی نے ایسا کیا قصور کیا تھا کہ ایسی باتیں سننے کو ملیں ــــ؟

"جائے مؤا چولھے بھاڑ میں ــــ ہماری عزت لوٹے لیتا ہے ــــــ" اور دادی بی نے تو منہ بھر کے قسم کھائی کہ "شادی کرنے کا بولوں تو دو مردوں کی جورو سمجھ لینا ــــــ" لو بھئی، اب ماں ہی دخل نہ دیں تو کس کی چندیا کھجلائی تھی کہ منہ سے چُوں بھی کرتا ــــ؟؟

سیلاب کا پانی اور جوانی کا زور رُوکے نہیں رکتا ــــ بڑی پارسائی کا دعویٰ کئے بیٹھے تھے بڑے میاں ــــ آگے پیچھے سے۔ اندھیرے اُجالے میں ــــ کونے کھُدرے میں، جہاں کسی کا منہ دیکھا اور با چھوں سے رال ٹپکی ــــ یہ ضرور تھا کہ شادی نہ کرنے کا جو جتن کیا تھا سو پُورا کر دکھایا مگر یہ سارے خاندان کو معلوم تھا کہ حضرت بُری باتوں میں پڑ گئے ہیں ــــ ایسے اوچھّن دادی بی نے کاہے کو دیکھے ہوں گے؟ بیٹے سے تو ابولا بندھا تھا۔ مگر پھوپھی خالہ سے کہلوایا بھی کہ "ارے حرام زادے! چھوڑ یہ چال ــــ سیدھی طرح رہ ــــــ" مگر نہ تو اس کانوں سنے

اُس کانوں اُڑا دیتے ————

جھوٹ سچ کون اُڑائے۔ اللہ کو منہ دکھانا ہے۔ سامنے عافیت ہے سننے میں تو یہی آتا تھا کہ بڑے میاں نے لال منہ کی بندیا بھی نہ چھوڑی۔۔۔ شہر بھرے کی ہر کنگالہ کا پتہ انہی سے پوچھ لو ۔۔۔ فلانی کی آواز میں رس ہے ۔ فلانی کی آنکھوں میں زہر ہے ۔۔۔ اس کا جوبن پھٹا پڑتا ہے ۔ اس کے بدن میں مستی ہے ۔ ارے ایک بات تھی ۔۔۔ ! یہاں تو جب بڑے میاں بیٹھ گئے دفتروں کے دفتر کھل گئے ۔۔۔ بس بڑے میاں ہیں اور رنگا رنگی باتیں ————

جمیل کی ٹیک والی مسجد سے لگ کر سوانیوں کا نگر تھا ان میں روہیلے بھی تھے جو سرحد پار کرکے ہندوستان باہر سے آئے تھے ان کی عورتیں کیا تو منہ۔ کیا چوڑی چکلی ہوتیں کہ بڑے میاں ایسوں کی رال تو ٹپکتی ہی تھی۔ بڑے مسجدوں کے ملا بھی دم چھوڑ دیتے ۔۔۔ انہی میں ایک خان پٹھان بھی تھا نام ذرا م تو کس کو معلوم تھا سب خان صاب خان صاب بولتے تھے۔ اس کی ایک چھوکری تھی ۔۔ نام تھا گلابو ۔۔۔ تھی بھی کم بخت گلابی گلابی ۔۔۔ سفید چکنی مٹی میں گلاب کی پتیاں گوندھ کر جیسے اللہ میاں نے اسے انسان کے روپ میں ڈھالا تھا ۔ کرتا سدا کھلے گلے کا پہنتی ۔ یہ جھولتی جھولتی زنجیر ۔۔۔ موٹے موٹے چاندی کے بٹنوں میں اٹکی ہوئی ۔۔۔ آدھے بٹن کھلے ۔ آدھے بٹن بند ۔۔۔ اور چلتی تو ایسی تھرک تھرک کر کہ بوٹی بوٹی جگہ چھوڑ دیتی ۔۔۔ بال بال اچھل اچھل کر چلتے جوڑوں کو مخاطب کرتا ۔۔۔ کھلی رکھنے کی جگہ کو بند رکھتی اور بند رکھنے کی جگہ کو ہوا کھلاتی پھرتی ۔۔۔ بیٹی تو ایسی ہی تھی پر یہ باپ بڑا ناک والا تھا ۔۔۔ اپنے بھائے تو بیٹی کو سات پردوں میں بٹھا کر رکھتا مگر وہ حرّافہ سارے باڑے میں کد کڑے لگاتی پھرتی ۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں کون بند کرے ۔۔۔؟ سامنے آئی چیز تو سبھی دیکھتے ہیں ۔ اور یوں بھی چڑھتا چاند کس سے چھپا رہ سکتا ہے ۔۔۔ ؟؟

بڑے میاں نے بھی دیکھا ۔۔۔ دیکھا کیا بس ریجھ گئے اور ایسے ریجھے کہ رازی بی کی تجوری سے ان کے چڑھاوے کے چھ تولے کے کنگن لے جا کے بدمعاشوں کے ہاتھ سونپ آئے کہ بس کیسا بھی کرکے وہ لونڈیا اڑا لاؤ ۔۔۔ ان کا کیا جاتا تھا ، تاک میں رہے اور

ز قع ملتے ہی اسے اُٹھلائے ــــــــ انھوں نے جی بھر کے کھیل کھیلے ۔ خوب خوب باغبانی
ں ــــ باپ کو پتہ چلا اس نے تیرے میرے کو ملا کر گواہیاں ثابت کیں اور بڑے میاں دھر لئے گئے ۔
نہ تو جیسی بھی پڑی بھگت گئے مگر دادی بی کا اور سب ہی کا یہ خیال تھا کہ اب وہ کبھی تیری میری
ڑکی پہ دانت نہیں جھکائیں گے ۔ مگر بڑے میاں کی جوانی کا زور تھی وہ زور تھا کہ بارہ گھوڑے
بھی ہیچ تھے ــــــــ جانے کدھر کی مستی بھری پڑی تھی کہ کھرّے بانوں کی چارپائیاں
وٹ لوٹ کر چور کر ڈالیں ۔ نواڑ کے پلنگوں کا تو خیر ذکر ہی کیا تھا ــــ دادی بی نے آنگن سے
سارے پلنگ چارپائیاں اٹھوا کر ان کے لئے تخت ڈلوا دیا تھا۔
انھوں نے تو جب سے دو باتوں کا طعنہ دیا تھا ماں نے منہ پھیر لیا تھا مگر یہ بڑی سعادتمندی
سے اب بھی روزانہ صبح ماں کو سلام کرنے جاتے ۔ اب یہ ماں کے دل پر تھا کہ دعا دے دیں
یا بد دعا دے دیں ۔ منہ سے پہلے ہی کچھ کہیں، مگر دل ہی دل میں اب بھی ہڑکتی تھیں ۔ سارے میں
بدنامی ہو گئی تھی، اس پر کڑھتی بھی تھیں ۔
" اب جو کر لیا سو کر لیا ــــ ابھی بھی مونڈی کاٹا دھاندل گھائی مچاتا پھرتا ہے ــــ
چین سے گھر کیوں نہیں جوڑ لیتا ــــــــ " ان کے کانوں تک پہنچاتا کون ــــ اور پہنچ بھی
جاتی تو مانتا کون ــــــ ؟
بیتے حلال کی ڈبیہ لاتا اور یہ دانتوں کی خبر لینی شروع کر دیتے ــــ دانت دیکھو تو یوں
بھاگنے کو آمادہ جیسے بچے " چھپا چھائی " میں ایک دوسرے کو لوٹنے میں تلے ہوں ــــ
گوشت میں ڈھیلا پن بھی آ رہا تھا ــــ دو چٹکیوں میں پکڑنے سے مچی سی ہاتھ میں آ جاتی تھی ــــ
کہاں تو یہ عالم تھا کہ بدن کو ہاتھ لگاؤ تو ایسا کسا بندھا تھا کہ ستار جیسی دھن دھن آواز نکلتی ۔ مگر
اتنے گئے گزرے ہو کر بھی ہر گنوں پورے تھے ــــ نماز تو شبیر میاں کے جنم کے وقت ہی پڑھی
ہو اور اب شبیر میاں بھی اللہ کے فضل سے دو دو بچوں کے باپ تھے ۔ عید، بقر عید کی نماز
سے تو خدا واسطے کا بیر تھا ــــ عید بقر عید جیسے دنوں میں بھی کہ برس کا ایک دن ہوتا ہے ،
مزے سے دس گیارہ بجے اُٹھتے ۔ منہ ہاتھ دھو باہر نکل جاتے ــــ اور پھر وہی رات کے

بارہ بجے ، دو بجے اور تین تین بجے کی خبر لاتے ـــــ کبھی تو سورج نکلے اپنی صورت دکھاتے
بچے بولتے ـــــ "بڑے ابا نماز پڑھو نا ـــــ"
تو تن تنا کر بولتے ـــــ "تمھارے جنازے کی نماز پڑھیں گے ، ابھی سے کیا پڑھنا؟
نماز ، نذر ، گیارھویں ، فاتحے سے یوں دور بھاگتے جیسے پکا دین دار نمازی شراب ،
کباب سے بھاگے ـــ !! اب تو عمر بھی سٹ سے بھی ڈھلک رہی تھی ۔ اس عمر میں تو سبھی
سنبھل جاتے ہیں ۔ ان کا ڈھنگ سب سے نرالا تھا بلکہ دولہا تھا دولہے ہی تھے ۔

کمال میاں کی شادی کا وہ دھوم دھام کا تھا کہ لوگ راتوں کو سونا تک بھول گئے ـــــ
بڑے گھر کی بیٹی اٹھائی کسی بات کی کمی نہ تھی ـــ میاں بھی ہر چیز سیر کو سوا سیر ـــ رت جگے
ہوتے ـــ تین ہوتے ۔ گلگلے ، پوریاں ، چونگے تلے جاتے اور ڈھولک پر وہ وہ تھاپیں
پڑتیں کہ بڑے بڑے سڑ بھی نیند سے چونک چونک پڑتے ـــــ چڑ چڑ جاتے ـــــ
گرمیوں کے دن تھے ۔ بڑے میاں اپنے معمول کے مطابق تین بجے رات کے لگ بھگ
بازار سے لوٹے ـــــ ساتھ میں دوستوں کی ایک منڈلی بھی تھی ـــ اچھے خاصے گھر بار یوں
کو بیویوں سے تڑوا دیتے ۔ بولتے ـــــ
"ارے میاں ! بازار کی ہانڈی میں جو مزہ ہے وہ گھر کی ہانڈی میں کہاں ـــــ ؟"
ایسے ایسے چٹکلے ۔ پتے کر جانے والے بالتو کتا بن ساتھ ہو لیتے ـــــ
نوٹے تو رت جگے کی دھوم تھی آنگن بیچ منڈوا اڑا تھا ، پھولوں پتوں سے لہکتا جھکتا ۔
وہ گڑبڑ ۔ وہ شور شرابہ کہ توبہ ـــ منڈوے تلے گیت ہو رہے تھے ـــــ
ڈھولک پر تھاپ پر تھاپ پڑ رہی تھی ـــــ
جی کا جنجال موا باجرہ لائے ـــــ
میں نکو بولی باجرہ ـــــ
تم کاٹے کو لائے باجرہ ـــــ

وہ جو بیچ میں موٹی موٹی آنکھوں والی الھڑ سی چھوکری تھی۔ وہ تان اُٹھاتی اور سب ساتھ دیتیں ——— وہ اپنی پتلی سی ناک چڑھا کر "نکو" اس مزے سے بولتی کہ جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ———

جب میں وہ باجرہ جھڑنے کو بیٹھی
بھونہ اُڑ اُڑ جائے مُوا باجرہ

اور پھر بھولنے سے بچنے کے لئے اس نے آنکھوں پر اس زاوئے سے منہ بنا کر ہاتھ اُٹھایا کہ بڑے میاں وہیں ڈھیر ہو گئے ———

میں نکو بولی باجرہ
تم کائے کو لائے باجرہ

پتلی سی ناک "نکو" پر بار بار چڑھتی اُترتی ———

جب میں وہ باجرہ چُننے کو بیٹھی
آنکھیں پھوٹی جائیں مُوا باجرہ!

رات کے تین بھی تو بج رہے تھے ——— اس نے اپنی نیند بھری موٹی موٹی آنکھیں سب کے سامنے کھول کر زور سے میچ لیں ———

آنکھیں پھوٹی جائیں مُوا باجرہ

اور پھر زور کی تھاپ دی ———

میں نکو بولی باجرہ!

بڑے میاں کا جی چاہا سارا باجرہ خود ہی چن چنا کر صاف کر دیں ———

جی کا جنجال مُوا باجرہ لائے

باجرہ کی تکرار چلتی رہی اور بڑے میاں وہیں کھڑے رہے۔ صبح صبح جب اندھیرا چھٹ رہا تھا اور صبح کی ہلکی ہلکی روشنی پھر نُور اُجالے سے بدل رہی تھی، بڑے میاں وہیں دوپہر وں پر کھڑے اس کو گھورے جا رہے تھے ——— اس کو جو وہیں ڈھول کے پاس بے فکری

ٹانگیں پھیلا کر سو گئی تھی اور ان کی نیند اُڑ گئی تھی ——

جانے کیا جی میں آئی ۔ اس کی طرف سے کوئی بُرا خیال دل میں نہ آیا۔ جھٹ سوچ لیا بس اسی سے شادی کر لیں گے۔ اتنے گئے گزرے ہو کر بھی لاکھوں پر بھاری تھے بڑے میاں۔ کون تھا جو بیٹی نہ دیتا بھلا ——؟ لوگ مرد کی عمر نہیں اس کا دھن دیکھتے ہیں اور دھن کی یہاں کیا کمی تھی ——؟

بڑے میاں نے ہاتھ پاؤں چلائے تو پتہ چلا کہ بڑے گھر والوں کی پوتی ہے۔ انھوں نے ماں کے آگے جا کے ہاتھ پاؤں جوڑے —— جو تے مت کہیں —— ماں دو مردوں کی جورو ٹھہریں وہ الگ —— خود دو باپوں کی اولاد ٹھہریں ۔ مگر دل کی چوٹ تھی سہار کیسے لیں ——؟ تو پتلا کرکے قسم اٹھائی اور ماں کے قدموں میں گر کر گزرے دنوں کی معافی مانگ لی ——

دادی بی بڑے کُھٹے سے ٹمیں ۔ پوپلے منہ سے لو بھے منہ والے بیٹے کا پیار لے کر —— اور بڑے ابا کو مشرف بہ اسلام ہو گئے ۔ ایسی نیکیوں بھری بی بی تھی کہ اس کے زندگی میں آتے ہی بڑے میاں ساری بدی بھول گئے ۔ —— اور اس دن کی زمانے بعد دادی بی نے دیکھا کہ بڑے میاں لوٹا لئے کر باہر نکل گئے —— اور پھر کتنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ بڑے میاں ٹپا ٹپ سجدے کر رہے ہیں ۔ بار بار ماں کو لڑکی والوں کے پاس بھیجے کہ ——

"اماں کیسے بھی کرکے اتنا کام کر دو ——" اور خود سجدوں پہ سجدے کئے جاتے —— اللہ میاں سے دعائیں بھی یوں مانگتے جیسے یاری کے دوست احباب سے باتیں کر رہے ہوں ——

"ارے اللہ میاں آپ کیا سمجھتے ہیں میں سر کو جھکا نہیں سکتا ؟ مگر مولیٰ اب میرا دل خود نہیں چاہتا —— بھول ہے اللہ میاں بھول —— بس اب تو دل چاہتا ہے کہ شریف مردوں کی طرح گھر بیٹھ کر زندگی گزار دوں ——"

اللہ میاں کو رشوت کا لالچ بھی دیتے —— ارے پانچوں وقت کی نماز پڑھا

ہوں گا ــــ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ ہاں قرآن شریف بھی پڑھوں گا ــــ"
مزید پھسلا دے بتاتے ــــ" اگر اتنے پر بھی آپ راضی نہیں تو روزانہ یٰسین شریف
تلاوت بھی کیا کروں گا ــــ ورنہ میں زہر کھاؤں گا اور خودکشی کا سارا عذاب آپ پر
ہی پڑے گا ــــ اللہ میاں مجھے سچ مچ ہاجرہ سے عشق ہوگیا ہے ــــ"

اللہ میاں کے کان کھلے تھے شاید ــــ یا پھر بڑے میاں کی دعاؤں ہی میں اثر ہوگا۔
لے دے ہوئی بھی مگر پیسہ یہاں بھی شامیانہ بن کر سب عیبوں کو ڈھانک گیا۔ بڑی دوڑا دوڑی
کے بعد ہاں ہوگئی۔ بڑے میاں کے مانو زمین پر پاؤں نہ پڑتے تھے ــــ ہاں ہوتے ہی
سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وضو بنا قرآن شریف لے کر بیٹھ گئے اور دو پارے پڑھ کر آنحضرت
کے نام بخش دیئے ــــ اماں بھی خوش یہ خوش تھیں اور پرانی باتیں بھول بھال کر شادی
کے کام کاج میں گم تھیں ــــ

اور قاضی صاحب نے جب پوچھا ہے ــــ" ہاجرہ بیگم! اتنے اتنے مہر کے
عوض قبول ہے ــــ" تو بڑے میاں آسمانوں پر اڑے چلے جا رہے تھے ــــ کہیں
دور سے بولے ــــ

"جی ہاں ــــ جی ہاں ــــ جی ہاں ــــ"

ڈھم ڈھم ڈھم ڈھول پٹ گیا ــــ گویا اعلان ہوگیا کہ لو جی بابل بیٹی پرائی ہوگئی ــ
دسترخوان بچھے ہوئے تھے۔ صفیں کی صفیں بیٹھتیں اور کھانا کھا کر جگہ خالی کر دیتیں۔
پھر دوسری صف بیٹھتی ــ بڑے میاں پھولوں کے گجروں اور سہرے سے لدے پھندے،
سر پر زری کا صافہ باندھے، ہاتھ دھونے کے لئے رکھی سیلابچی لوٹے کی طرف بڑھے ــ
سیڑھیاں اترتے ہیں تو پاس ہی سے سسکی سی سنائی دی۔ آگے بڑھے تو کونے میں سایہ سا
کانپ رہا تھا ــــ بولے ــــ

" ادھر کون ہے ــ؟ کھانا کھا چکے ــــ؟"

ہوں نا ہاں ــــ

"ارے بھئی جواب نہیں دیتے — چوروں کی طرح کیا کھڑے ہو —" اور بڑے میاں نے ہاتھ پکڑ کر سامنے کھینچ لیا —

" ارے چنو بھائی کے بیٹے ہو — کیا نام ہے میاں تمھارا — بھول ہی گیا میں تو — ہاں ہاں یاد آیا — ظفر میاں — ہاں ظفر میاں اچھے تو ہو —؟"

بڑے میاں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا — "ہائیں! رو رہے ہو تم —"

وہ آنکھیں پھاڑ کر بولے — "ہوا کیا گھر میں تو سب اچھے ہیں نا —؟"

" جی ہاں۔ سبھی اچھے ہیں، بس میں ہی نصیبوں کا پورا ہوں —" وہ ڈوبتی آواز سے بولے —

"بات کیا ہے میاں —" بڑے میاں نے بڑے پیار سے پوچھا —

اک دم ظفر میاں عورتوں کی طرح پھپھک پڑے — " اپنی قسمت کی سیاہیوں کا شمار کروں تو میں پورے طور سے برسات کی رات بن چکا ہوں — کہیں اجالا نہیں — روشنی کی ہلکی سی رمق نہیں —"

" عورتوں کی طرح روئے جاتے ہو بات بتاتے نہیں — ہوا کیا؟ گھر تو نیلام پر نہیں اٹھ گیا —؟"

چنو میاں بے چارے اچھے دن دیکھے بیٹھے تھے۔ بڑے ناناکے زمانے میں دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا — اصطبل میں اصیل گھوڑے ایک نہ دو' پورے آٹھ تھے — ان پر جھبکتا جھول چاندی کے گہنے — ارمان بھرے دم تھے بیچارے۔ بگھی سواری کے لئے تھی — ایسی چھک چھک چھن چھن کرتی آتی کہ لوگ ایک میل پرے سے ہی بولنا شروع کر دیتے —

"ارے ہٹنا میاں — بچنا میاں — حویلی والوں کی سواری آرہی ہے —"

دل کے بھی ایسے ویسے نہ تھے — پورے گاؤں میں اپنے اونچے ہاتھ کے لئے مشہور تھے — چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ برے دن آئے اور ایسے آئے کہ گھر کی ہر اچھی بری

جہیز بک بکا کر کوئلہ بن گئی ــــ کہاں تو وہ ہاتھی گھوڑے اور بگھیاں اور کہاں یہ حال کہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے مگر کوئی پاس بٹھا کر سلام لینے کا بھی روادار نہ تھا ۔ بڑے میاں کے گھر والوں میں بس اتنی بات تو بڑی ہی اچھی تھی کہ اپنے پرائے ــــ امیر غریب ، چھوٹے بڑے سب کی خیر خبر لیتے رہتے ــــ اب نصیبوں سے ایک مکان بچ رہا تھا ۔ مکان کاہے کو تھا اچھا خاصہ ڈھنڈار تھا ، کچھ بھی تھا مگر سر چھپانے کو آسرا تو تھا ــــ ! اس کی بھی سن گن مل ہی رہی تھی بڑے میاں یہی سمجھے شاید نیلام اُٹھ رہا ہوگا ــــ

بڑے شاعرانہ انداز میں ظفر میاں بولے ــــ

" مکان کا تو نہیں ۔ میرے ارمانوں کا نیلام ضرور اُٹھ گیا ــــ چاندی کی طاقت واقعی بہت بڑی ہوتی ہے ــــ ! "

بڑے میاں بچہ تو تھے نہیں ــــ سناٹے میں آ گئے ــــ تھوڑی دیر چپ رہے پھر بڑی صلاحیت سے پوچھا ــــ

" ہاجرہ سے محبت کرتے ہو ــــ ؟ "

" جی ہاں ــــ اور وہ بھی مجھ سے کرتی ہے ــــ " ظفر میاں جیسے عدالت کے سامنے حلفیہ بیان دینے پر تل گئے ــــ

" آپ کو یاد ہوگا ، آپ کے پیام جانے کے کئی دنوں بعد تک جواب نہ ملا تھا ــــ ہاجرہ کہتی تھی میں زہر کھاؤں گی یا نہیں تو بس ظفر میاں سے شادی کروں گی ــــ اور اس کے غریب ماں باپ کہتے تھے آپ ایسا داماد بار بار نہیں ملا کرتا ــــ مگر جیت آپ ہی کی ہونی تھی اور ہوئی ــــ " وہ چھوٹے بچوں کی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑے ــــ

" اب یہاں کھڑا تھا کہ ہاجرہ ڈولی چڑھے گی تو اس پر سے یہ گوٹیاں نچھاور کر دوں گا ــــ ہماری محبت تو اسی کے تلے پروان چڑھی ــــ پانچ سال سے ہم ساتھ رہنے کا سوچتے آئے تھے مگر ....

" چھی ــــ مرد ہو کر روتے ہو ــــ آؤ میرے ساتھ ــــ آنسو پونچھ ڈالو ــــ

پونچھ لو ۔۔۔ بس پونچھ بھی ڈالو ۔۔۔۔۔۔"

دیوان خانے میں ابھی قاضی صاحب اور باراتی بیٹھے ہوئے ہی تھے۔ بڑے میاں پھولوں سے لدے پھندے، ظفر میاں کا ہاتھ پکڑے داخل ہوئے ۔۔۔ دو ایک منٹ تو دھر اُدھر دیکھتے رہے پھر بیچوں بیچ جا کر کھڑے ہوگئے اور سپاٹ لہجے میں بولے ۔۔۔۔۔۔

"میں مظہر میاں، باجرہ بیگم کو تین بار طلاق دیتا ہوں ۔۔۔۔"

"طلاق ۔۔۔ ؟" سب سناٹے میں آ گئے ۔۔۔ !

دو چار منٹ خاموشی رہی ہوگی کہ ایک دم کھسر پھسر سی ہونے لگی ۔۔۔ بڑے میاں نے ذرا سختی سے ہاجرہ کے باپ کو مخاطب کیا ۔۔۔۔۔

"میاں جی! آپ کو معلوم تھا کہ آپ کی بیٹی ظفر سے محبت کرتی ہے ۔۔۔ پھر بھی سے کر میرے پلے باندھ دی ۔۔۔ میں اپنی ناموس لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا"۔۔۔۔

ان کی آواز ڈوب رہی تھی مگر وہ سنبھل گئے ۔۔۔۔۔

"مہر میں ابھی دیے دیتا ہوں ۔۔۔۔"

دولہن والے کے گھر سے بڑے میاں کا گھر دور نہیں تھا ۔۔۔ گئے اور جھولی بھر روپئے لے کر آ گئے۔ کھن کھن کرتے تھیلے کو سامنے ڈال دیا اور گرج کر بولے ۔۔۔۔۔۔

"قاضی صاحب پڑھ دیجئے اس دلہن کا نکاح ابھی ظفر میاں کے ساتھ ۔۔۔۔"

یہ کہہ کر اپنے سر سے سہرا اتار کر ظفر میاں کے سر پر باندھ دیا ۔۔۔ اپنی جامدانی کی اچکن اتار کر ظفر میاں کو پہنا دی ۔۔۔۔۔

ان کی آنکھوں میں نمی گھل رہی تھی ۔۔۔ مدھم اور نرم آواز سے بولے ۔۔۔۔

"جاؤ میاں، خوش رہو ۔۔۔ کچھ بھی تعیش کرو ۔۔۔ میں تم دونوں معصوم فرشتوں کے لئے اپنی نیک تمنائیں اور دعائیں بھیجتا ہوں ۔۔۔۔۔!!"

دسترخوان بچھے ہوئے ہی تھے۔ بڑے میاں نے دو چار لئے سیدھے نوالے زہر مار کئے۔ کھانے پر سے اٹھے، ہاتھ دھوئے، کلی کی اور رومال سے منہ پونچھتے باہر آئے

پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور پاؤں سمیٹ کر آواز دی
" ارے بھئی خلال دینا ذرا ———"
کسی نے ہاتھ میں نیم کی تیلی تھمادی اور خلال شروع ہو گئی ——!!!

کتابیں آپ کی بہترین دوست ہیں

شاعری

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	5/=	(پ)
طلوعِ فکر	جوش ملیح آبادی	2/8/=	(ک)
کلیات اختر	اختر شیرانی	8/=	(ک)
نقش فریادی	فیض احمد فیض	1/12/=	(پ)
دست صبا	〃	2/4/=	(ک)
زنداں نامہ	〃	2/4/=	(پ)
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	3/8/=	(ک)
پرچھائیاں	〃	1/4/=	(پ)
گجر	قتیل شفائی	2/4/=	(ک)
جھومر	〃	3/=	(ک)
غمِ فردا	اختر انصاری اکبرآبادی	2/4/=	(پ)
بطِ مے	عدم	2/4/=	(ک)
گلنار	عدم	2/4/=	(ک)
خرابات	عدم	4/=	(ک)
رم آہو	عدم	4/=	(ک)

ناول

عروسہ	زبیدہ خاتون	6/=	(ک)
ہما	〃	6/=	(ک)
ڈھل گئی رات	شفیع عقیل	4/=	(پ)
عابدہ کے نام	ممتاز	2/8/=	(پ)
بازارِ حسن	پریم چند	4/8/=	(ک)
سانچ کو آنچ	شوکت تھانوی	3/8/=	(ک)
بقراط	〃	2/8/=	(ک)
ہماری زمین	نظر زیدی	2/4/=	(پ)
غمِ عشق گر نہ ہوتا	بشیر رحمانی	2/4/=	(پ)
بلندی کی طرف	ہربنس دوست	1/=	(ک)
عذرا	خلیل الرحمن	3/8/=	(ک)
عذرا کی واپسی	〃	3/8/=	(ک)
غم خانۂ دل	کلیم عرفی	2/14/=	(ک)
حسنا	ایم۔ اسلم	6/8/=	(ک)
پت جھڑ	مہندر باوا	(زیرِ طبع)	

(ان کے علاوہ اپنی ضرورت کی ہر کتاب ہم سے طلب فرمائیں)

کتاب گھر، کٹڑہ شیر سنگھ ۔ امرتسر

ڈرامے

۱۔ اصغر بٹ

۲۔ میرزا ادیب۔

اصغر بٹ

بھائی کی تلاش

(تمثیل ایک باب میں)

(وقت — دن پچھلا پہر۔ منظر ایک وسیع ڈرائنگ روم۔ دائیں دیوار میں سامنے کو بیرونی دروازہ۔ پچھلی دیوار میں اندر والے دو دروازے۔ دونوں دروازوں کے عین درمیان میں ایک مرصع آتشدان کے اوپر دیوار پر بڑے نواب صاحب کی بڑی سی تصویر جو بھاری سنہرے چوکھٹے میں جڑی ہے۔ بائیں جانب پچھلے کونے میں ایک رائٹنگ ٹیبل مع کرسی اور سامنے کونے میں ایک دیوان جس پر مخمل کے گاؤ تکیے لگے ہیں۔ دیوان کے سامنے ایک اگالدان۔ رائٹنگ ٹیبل اور دیوان کے درمیان دیوار میں بڑی کھڑکی جو اس وقت کھلی ہے اور شام کی دھوپ اس میں سے آرہی ہے۔ کھڑکی کے باہر کچھ بیلیں ہیں جن کی شاخیں جھک کر کمرے میں جھانک رہی ہیں۔

ڈرائنگ روم کے مرکز میں سامنے کی طرف ایک بڑا اور قیمتی صوفہ سیٹ قوس کی شکل میں رکھا ہے۔ بڑے صوفے کے سامنے ایک جدید وضع کا نیچا مستطیل میز ہے۔ بڑے صوفے کے دونوں کناروں پر ویسے ہی دو چھوٹے میز بھی ہیں جن پر راکھ دانیاں پڑی ہیں۔ صوفے کے علاوہ کمرے میں دو نیچی گدے دار کرسیاں بھی ہیں۔ ایک دائیں جانب سامنے کی طرف رکھی ہے اور دوسری بائیں جانب کھڑکی کے سامنے پڑی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ابھی ابھی اس پر بیٹھا کھڑکی کے باہر کا نظارہ کر رہا ہوگا۔

کمرے کے پیچھے دونوں کونوں میں خوبصورت فلورلیمپ رکھے ہیں۔ دیواروں پر جدید وضع کے بجلی کے شیڈ ہیں جو چھت کی جانب روشنی پھینکتے ہیں ـــــــ فرش پر پورے کمرے کے برابر ایک قیمتی قالین ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو دو قریباً ادھیڑ عمر کے مرد باتیں کرتے ہوئے دائیں دیوار کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ ایک ذرا موٹے ہیں۔ بشاش چہرہ جو سوچنے کا عادی نظر نہیں آتا۔ گہرے نیلے رنگ کا بڑھیا سوٹ اور چمکدار کالے جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ بات چیت سے صاحبِ خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے دبلے ہیں، چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ ہے۔ اچکن اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ مخمل کا دیسی جوتا ہے جس پر گرد جمی ہوئی ہے۔ ہیئت کذائی سے تنگ دستی یا لاپروائی کا عالم ٹپکتا ہے)

موٹے صاحب :۔ چلو بھئی چلو۔ ارے میاں تکلف کیا ہے۔ تمھارا اپنا گھر ہے۔ (دوسرے کو ہاتھ کے اشارے سے اندر لاتا ہے۔)

دبلے صاحب :۔ بھائی تکلف تو نہیں۔ تمھارے گھر میں تکلف کیسا۔ (دائیں جانب آرام کرسی پر بیٹھ کر) لیکن آخر قصہ کیا ہے ـــ؟

موٹے :۔ قصہ بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم آرام سے بیٹھو، چائے پیو۔ (پچھلی دیوار کی طرف گھوم کر آواز دیتا ہے۔) بیرا ـــ!

گھر کے اندر سے مردانہ آواز :۔ جی سرکار!

موٹے :۔ چائے۔

(موٹے صاحب ہاتھ ملتے ہوئے صوفے کے پیچھے سے گھوم کر آتے ہیں اور درمیانی صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

موٹے :۔ لیکن تم یہ بتاؤ کہ پچھلے پچیس برس تم غائب کہاں رہے۔؟

دبلے :۔ جن صاحب نے میرا پتہ آپ کو دیا۔ انھوں نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں رہا کہاں ہوں۔

موٹے :۔ یہی تو بتایا نہیں ـــــ وہ علی گڑھ میں تھے نا صادق ہمارے ساتھ ....

ڈبلے :۔ (سوچتے ہوئے) صادق ——؟ وہ جو "چونچ" صاحب کے نواسے ......

موٹے :۔ اوں ہُوں ہُوں۔ نہیں بھئی۔ وہ جو سیاحتوں میں بڑھ بڑھ کے بولتے تھے۔

ڈبلے :۔ (شگفتگی سے) ہاں تو "پٹاخہ" کہو نا!

موٹے :۔ جی ہاں، پٹاخہ۔ تو پٹاخہ صاحب سے اچانک بازار میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ بولے "تم کہاں؟" "میں نے کہا" "تم کہاں۔؟" بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے پوچھا کہ "چوُرن کہاں ہے؟ ....

ڈبلے :۔ "چوُرن"........؟

موٹے :۔ او —— ہاں ——معاف کرنا تمھیں پیٹھ پیچھے ہم "چورن" کہا کرتے تھے۔

ڈبلے :۔ یعنی ——؟

موٹے :۔ خدانخواستہ گستاخی سے نہیں۔ پیار سے —— محبت سے۔ سمجھے —— محبت سے۔ (ڈبلے بھڑک کر بولنا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں روکتے ہوئے) ہاں ہاں مجھے معلوم ہے جناب کا صحیح نام رفیع الزماں ہے۔ وہ تو بے خیالی میں میرے منہ سے چ —— چو —— یعنی وہی عرف عام نکل گیا۔ دل میں ہم سب لوگ تمھاری عزت کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ تمھاری گفتگو سن کر کھایا پیا سب ہضم ہو جایا کرتا تھا۔ اس لئے دوستوں نے تمھارا یہ نام دھر دیا

رفیع الزماں :۔ (ذرا ہنس کر) تو میری گفتگو سے آپ اپنے ہاضمے کو درست کرنے کا کام بھی لیتے رہے۔ مجھے کیا پتہ تھا آپ لوگوں کے معدے اتنے خراب رہتے ہیں۔

موٹے :۔ (تپاک سے) آگئے نا اپنی موج میں۔ واللہ۔ تم بھائی بننے کے لئے نہایت موزوں آدمی ہو ——!

رفیع :۔ بھائی ——؟

موٹے :۔ (جلدی سے) ہاں ہاں —— ہاں ہاں۔ بعد میں بتاؤں گا واقعہ کیا ہے۔ پہلے تم چائے پیو۔ (آواز دیتے ہوئے) بیرا —— چائے لاؤ ——!

باہر سے مردانہ آواز :۔ ابھی لایا سرکار۔

موٹے :۔ جلدی ——! (رفیع سے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا —— کیا کہہ رہا تھا۔؟

رفیع :۔ (سنجیدگی سے) تم یہ کہہ رہے تھے کہ جب نواب صاحب فوت ہوئے (پچھلی تصویر کی طرف اشارہ کرکے) تو انھوں نے ورثے میں بہت سی دولت اور تھوڑی سی عقل تمھارے لئے چھوڑی۔

موٹے :۔ ہاں ہاں —— تو ذکر ہو رہا تھا ابا میاں کا۔ .. (یکایک چونک کر) نہیں تو! ابا میاں کی بات کب ہوئی ہے —— !

رفیع :۔ (ہنس کر) واہ سجاد خاں صاحب! آپ بھی ذرا نہیں بدلے۔

سجاد :۔ ہاں یاد آیا۔ وہ صادق کی بات ہو رہی تھی۔

رفیع :۔ تو صادق سے آپ کو پتہ چلا کہ میں مُرادآباد چھوڑ کر پاکستان آ گیا ہوں۔ اور لاہور میں وکالت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سجاد :۔ بالکل بالکل۔

رفیع :۔ اور خوش ہوں کہ "تنگدستی ہزار نعمت ہے"

سجاد :۔ (ہنس کر) نہیں یہ تو اس نے ہمیں بتایا —— (پچھلی دیوار کے دائیں دروازے سے بیرا ٹرے میں چائے کے برتن اور پلیٹ میں مٹھائی وغیرہ لے کر داخل ہوتا ہے) یہاں سامنے رکھو —— (بیرا سجاد کے سامنے میز پر چیزیں لگا کر واپس چلا جاتا ہے۔ سجاد چائے بناتا ہے اور ساتھ گفتگو بھی جاری رکھتا ہے) تمھیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میری شادی کو کوئی بیس برس ہو چکے ہیں۔

رفیع :۔ اور ایک عدد نہایت موثر قسم کی بیگم ہیں۔

سجاد :۔ جی ہاں۔ نہایت موثر —— ! اور سات عدد موثر بچے بھی ہیں۔

رفیع :۔ مبارک ہو۔

سجاد :۔ (شرما کر) ارے میاں کیسی مبارک —— ! اس سے زیادہ بھی ہو سکتے تھے۔ بیگم کی صحت اچھی نہیں۔

رفیع :- میں سمجھتا ہوں۔

سجاد :- تمھیں تو معلوم ہی ہے ہم کالج کے زمانے میں بھی ..

رفیع :- جی ہاں جی ہاں۔

سجاد :- تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔ لیکن ۔ ۔ ۔

رفیع :- لیکن ——— ؟

سجاد :- لیکن ایک بھائی نہیں ہے

رفیع :- بھائی - ہیں تمھارے تو ایک چھوٹے بھائی تھے جو شاید جاپان چلے گئے تھے یا کہیں پڑھنے چلے گئے تھے کوئی ایسی بات ہوگئی تھی۔

سجاد :- (آہ بھر کر) خیر اس قصے کو جانے دو (چائے کی پیالی پیش کرتا ہے) تم چائے پیو، اور ہمارا غم غلط کرو۔

رفیع :- تمھارے ہاں غلط کرنے کی چیز تو کوئی نظر نہیں آرہی۔ درست کرنے کی چیزیں البتہ دو ایک ہیں۔

سجاد :- (افسوس سے) وہ میرا چھوٹا بھائی اس دیہاتی لڑکی کے چکر میں خاندان کی ناک . . . . . خیر لعنت بھیجو۔

رفیع :- سچ کہتے ہو ناک چیز ہی ایسی ہے۔

سجاد :- (چونک کر) نہیں بھائی میں واقعے کو کہہ رہا ہوں۔ لعنت بھیجو سارے واقعے پر۔ اور مجھے تو خیر بھائی کی تمنا بھی نہیں تھی۔ ہماری بیگم اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہیں

رفیع :- ہاں سنا تھا ادھر کی پوری جائداد بھی اب ادھر ہی ہے۔

سجاد :- ارے جائداد کو کون کہہ رہا ہے۔ تم سنجیدگی سے بات تو سنو۔

رفیع :- کون کافر سنجیدہ نہیں ہے۔ جب سے پاکستان آیا ہوں سوائے جائداد کے اور کسی چیز کے بارے میں سنجیدہ ہو ہی نہیں سکا۔

سجاد :- خیر ——— ! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہماری بیگم کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ جا

ہے۔ بچے ہیں۔ ماشاءاللہ اچھا خاصا ہونہار خاوند ہے ——— لیکن ہر وقت کڑھتی رہتی ہیں۔

رفیع:- بھائی نہیں ہے۔

سجاد:- قطعی ——— اب بھائی ایسی چیز ہے جو یہاں مہیا نہیں کر سکتا۔

رفیع:- (سوچتے ہوئے) ہاں جب تمھارے سسر مرحوم مہیا نہ کر پائے تو تمھارے لئے تو یقیناً ذرا مشکل ہی نظر آتا ہے۔

سجاد:- (خوش ہوکر) تم بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہو۔ بھائی مہیا کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے اور چونکہ ساس اور سسر کا انتقال ہو چکا ہے۔ بیگم کی ناامیدی قدرتی امر ہے۔

رفیع:- ان حالات میں اُمید قائم رکھنا ذرا حوصلے کا کام ہے۔

سجاد:- (فاتحانہ) لیکن اس نے اُمید نہیں چھوڑی۔ ابھی تک نہیں چھوڑی۔

رفیع:- حیرت ہے ——— !

سجاد:- جی ہاں! اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے کسی منہ بولے بھائی کو اس کا منہ بولا بھائی بنوادوں۔

رفیع:- نیک خیال ہے لیکن اس تلاش برادریں میرے ذمے کیا کام ہے ——— ؟

سجاد:- تمھیں یاد ہے کہ تمھیں میں نے ایک مرتبہ بھائی کہا تھا۔

رفیع:- ضرور کہا ہوگا لیکن بیسیوں آدمی ایسے بھی ہیں جنھیں میرے سامنے تم نے ایک سے زیادہ مرتبہ بھائی کہا تھا۔

سجاد:- میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا ہے اور تم ہی سب سے زیادہ موزوں نظر آئے ہو۔

رفیع:- کیوں میں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے ——— ؟

سجاد:- بات یہ ہے کہ بھائی بننے کے لئے جتنی شرائط ہیں وہ کوئی اور پوری نہیں کرتا۔

رفیع:- یعنی ——— ؟

سجاد:- سب سے پہلے یہ کہ بیگم اور بچے علی الترتیب اپنے بھائی اور ماموں کو اسی گھر میں

رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

رفیع:۔ اور آپ کو کیسے معلوم ہے کہ میں یہاں رہ جاؤں گا —— ؟

سجاد: صادق نے بتایا کہ تمھیں ابھی کوئی گھر الاٹ نہیں ہوا۔ میرے سب دوسرے دوستوں کے پاس اپنے اپنے گھر اب ہو چکے ہیں —۔ یہاں تمھیں ہر طرح کا آرام ہوگا اور اگر تم وکالت شروع کرنا چاہتے ہو تو کر سکتے ہو۔

رفیع:۔ تو آپ گھر والوں کی طرح گھر بار دینے کے قائل ہیں۔

سجاد:۔ دوسرے یہ ہے کہ آدمی پڑھا لکھا چاہئے ہماری بیگم مجھ سے [illegible] رکھتی ہیں تمھیں معلوم ہی ہے کہ وہ ہمارے دوستوں کے حلقے میں لطف بہت کم آیا ہے۔

رفیع:۔ میرا خیال تھا کہ ادب سے زیادہ بے ادبی میرے حصے میں آئی ہے۔

سجاد:۔ اس کے علاوہ بیگم کی شرط یہ تھی کہ ان کا ہونے والا بھائی معقول صورت ہو۔

رفیع:۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (اُٹھتے ہوئے) چھوٹے بھائی خدا حافظ چائے کا شکریہ۔

سجاد:۔ اماں بیٹھو بیٹھو۔ کہاں جا رہے ہو ؟

رفیع:۔ واپس لاہور ——!

سجاد:۔ خیریت ... ؟ آخر ہوا کیا ہے — ؟

رفیع:۔ اگر تم بھائی کے اُمیدواروں میں سے میرا نام کاٹتے ہو تو بیٹھتا ہوں۔

سجاد:۔ اچھا بھائی بیٹھو تو سہی —— بگڑ کیوں گئے — !

رفیع:۔ (بیٹھتے ہوئے) آخر مجھے کیا مشکل پڑی ہے کہ تم سے گالیاں کھاؤں۔

سجاد:۔ (حیرت سے) گالیاں ——؟

رفیع:۔ ابھی تم مجھے سالا کہنے پر مصر تھے —!

سجاد:۔ (ہنس کر) بھائی میں تمھیں سالا نہیں کہوں گا —— کہو تو لکھ کر دے دوں۔

رفیع:۔ اور ستم بالائے ستم مجھ سے چھیڑ خانی کر رہے ہو۔

سجاد:۔ چھیڑ خانی —— ؟ کیسی چھیڑ خانی —— ؟

رفیع :۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ معقول صورت ہوں اور میری طرف پیار سے دیکھا بھی تھا۔

سجاد :۔ (ہنس کر) نہیں نہیں بھائی تم معقول صورت قطعی نہیں ہو —— میرا مطلب یہ تھا کہ اگر تمھیں ہماری بیگم کا بھائی بننا منظور ہو تو مجھے دھوکہ تمھیں معقول صورت بنایا جا سکتا ہے

رفیع :۔ جی نہیں شکریہ! (چائے کی دوسری پیالی بنا کر پیتا ہے)

——(خاموشی)——

رفیع :۔ کیا سوچ رہے ہو —— ؟

سجاد :۔ سوچتا ہوں کہ تم سے کہوں یا نہ کہوں۔ ؟

رفیع :۔ اگر اظہارِ محبت کرنا چاہتے ہو تو بالکل نہیں۔

سجاد :۔ (بیزاری سے) نہیں نہیں۔

رفیع :۔ تو کہو۔

سجاد :۔ تم نے ہماری بیگم کو مؤثر کہا تھا —— بات پتے کی کہہ گئے تم۔

رفیع :۔ کچھ آگے بولو تو عقدہ کھلے —— تمھارے لئے چائے بناؤں ؟ (دوسری پیالی میں چائے انڈیلتا ہے)

سجاد :۔ ہاں بناؤ —— بات یہ ہے کہ بیگم اور بچوں کے گٹھ جوڑ میں میری ذات کچھ حرفِ غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس گھر میں میرا کوئی مقام ہی نہیں رہا۔

رفیع :۔ ہوں —! (اسے پیالی بنا کر دیتا ہے)

سجاد :۔ اپنے گھر میں میری حیثیت سوم ہے —— پہلے بیگم۔ پھر بچے —— اور پھر ہم۔ یعنی جسے عرفِ عام میں صاحبِ خانہ کہتے ہیں وہ ہم ہیں —— پیچھے۔

رفیع :۔ یہ تو شادی کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے تھا۔ ہم نہ کہتے تھے کہ شادی مت کرو۔

سجاد :۔ اس وقت کیا تھا۔ اچھی خاصی ایک ملائم مزاج، شرمیلی بھولی موتی سی لڑکی تھی۔ کیا پتہ تھا کہ اندر سے یہ سامراجی ذہنیت کی نکلیں گی۔ اور پھر بچے!

رفیع :۔ گویا اس سامراجی طاقت نے اب نوآبادیات بھی اپنے ساتھ ملا لی ہیں۔

سجاد :۔ ایمان سے ۔ واللہ۔
رفیع :۔ پھر تو سیاسی صورت حال کافی تشویش ناک ہے۔
سجاد :۔ ہزیوں سے ہے اب تو ساری بات مسئلہ کشمیر ہو گئی ہے۔ کوئی حل ہی سمجھ میں نہیں آتا۔
رفیع :۔ تو میں وہ غازی ہوں جس کے ذمے اس ناپاک اتحاد کا خاتمہ کرنا ہے۔
سجاد :۔ اس سے زیادہ ۔۔۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر تم یہاں پر رہ جاؤ تو اس گھر میں میرا بھی کوئی ہمنوا ہو۔
رفیع :۔ سوچتے ہوئے، ہوں حالت تمہاری واقعی قابل رحم ہے کہ میں مستقل طور پر یہاں رہ نہیں سکتا۔
سجاد :۔ (ناامیدی سے) تو پھر کیا کیا جائے ؟
رفیع :۔ تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے عارضی بھائی بنا لیں۔
سجاد :۔ عارضی بھائی کیا معنی ۔۔۔ ؟
رفیع :۔ یعنی عبوری دور کے لئے ۔۔۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنے بن بیرادر یا برادر ہونے کا تکلیف دہ وقفہ اس خانہ زاد حقیر شخصیت سے پُر کر لیں۔
سجاد :۔ (متفکر) معلوم نہیں کہ بیگم اس پر رضامند ہوں گی یا نہیں۔
رفیع :۔ وہ میں انھیں قائل کر لوں گا۔
سجاد :۔ (خوش ہو کر) سچ ۔ واللہ لاجواب آدمی ہو ۔۔۔ بلواؤں بیگم کو ۔۔۔ ؟
رفیع :۔ شوق سے۔
سجاد :۔ (اٹھتا ہے اور آواز دینے کے لیے منہ کھولتا ہے) بیگ ۔۔۔ ۔۔۔ (رک جاتا ہے اور تشویش سے رفیع کو دیکھتا ہے) یار ایک بات ہے تم بُرا نہ ماننا۔
رفیع :۔ نہیں نہیں کہو۔
سجاد :۔ بیگم اس حُلیے میں دیکھ کے تمھیں عارضی بھائی بھی منظور نہیں کریں گی۔
رفیع :۔ کیا کیا جائے اس وقت تو میرے پاس ایک ہی حُلیہ ہے۔ پہلے معلوم ہوتا تو دوسرا

کہیں سے مانگ لاتا۔

(سجاد تنقیدی نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے اس کے گرد گھومتا ہے)

سجاد:۔ خیر۔۔ کوئی بات نہیں ۔۔۔۔ دیکھئے اس کا بھی کوئی بندوبست کرتے ہیں۔

(آواز دیتا ہے، بیرا۔

باہر سے مردانہ آواز:۔ آیا حضور۔

سجاد:۔ (سوچتے ہوئے) اچھیں تو خیر ٹھیک ہو جائے گی لیکن جوتوں کی حالت بہت خراب ہے ۔۔۔۔ کیا نمبر ہے تمھارے پاؤں کا ۔۔۔؟

رفیع:۔ سات نمبر۔

سجاد:۔ (سوچ کر بڑبڑاتے ہوئے) سات نمبر ۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ منیر کے بھی سات ہی نمبر کا جوتا آتا ہے۔ (بیرا پچھلی دیوار کے دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے) دیکھو برتن اٹھا کر لے جاؤ ۔۔۔۔ اور منیر کا پمپ شو لے آؤ۔

بیرا:۔ بہتر! (برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھتا ہے)

سجاد:۔ اور سنو ثریا بی بی کے میز پر سرمہ دانی ہوگی وہ لیتے آنا۔

بیرا:۔ جی بہت بہتر (برتن اٹھا کر واپس اسی دروازے سے چلا جاتا ہے)

رفیع:۔ سرمہ دانی ۔۔؟ بد رکھوا ہو رہا ہے میرا ۔۔۔؟

سجاد:۔ بس جی بس۔ اب تم چپ رہو۔ او کھلی میں سر دیا ہے تو دھماکوں پر مت بولو (رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھتا ہے)

رفیع:۔ اچھا بھائی جیسے تمھاری مرضی۔

(سجاد رائٹنگ ٹیبل کا ڈھکنا اٹھا کر ایک کنگھی نکالتا ہے اور پھر رفیع کی طرف لوٹتا ہے)

سجاد:۔ اب ہلو جلو نہیں ایک دم سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔

(رفیع اٹھ کر ساکت کھڑا ہو جاتا ہے۔ سجاد بڑی محنت سے اس کی مانگ نکالتا ہے

پھر اس کی اچکن پر برش کرنا شروع کرتا ہے۔ بیرا لیمپ شو لئے پہلے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

بیرا :- لیجئے حضور، میں کرتا ہوں برش۔ (لیمپ سجاد کے قریب رکھ دیتا ہے)
(سجاد بیرے کو برش دے دیتا ہے۔ بیرا برش کرنے لگتا ہے۔ سجاد ذرا پرے ہٹ کر نظر بھر کر اسے دیکھتا ہے۔)

بیرا :- ثریا بی بی نے سرمہ دانی اٹھا لئے ہیں دی حضور۔

رفیع :- ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ کوئی حرج نہیں۔ (سجاد بیرے سے برش لے لیتا ہے)

سجاد :- اچھا جاؤ بیگم صاحب کو اطلاع کر دو کہ لاہور سے رفیع صاحب تشریف لے آئے ہیں۔

بیرا :- جی رفیع صاحب ---؟

سجاد :- ہاں۔ ان سے کہنا کہ جن کا ذکر کل میں نے ان سے کیا تھا ---؟

بیرا :- جی بہتر حضور --! (بیرا واپس اسی دروازے سے نکل جاتا ہے)

سجاد :- لو اب جلدی سے یہ پمپ پہن کر دیکھو۔

(رفیع جوتا پاؤں میں پہن کر دیکھتا ہے۔ جو ٹھیک آتا ہے۔ رفیع چل کر پاؤں کی طرف دیکھتا ہے)

رفیع :- انگوٹھے سے ذرا دباتا ہے۔ دوسرا جوڑا نکال دیجئے۔

سجاد :- تم جوتوں کی دوکان میں نہیں ہو۔ اب آرام سے بیٹھ جاؤ اور دیکھو بھائی بن کر دوست کو مت بھولنا۔

(رفیع اطمینان سے سامنے دائیں ہاتھ چھوٹے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ سجاد ڈرائنگ ٹیبل میں برش اور کنگھی واپس رکھ کر لوٹتا ہے۔ اچانک رفیع کے پرانے جوتوں پر نظر پڑتی ہے اور انھیں جلدی سے اٹھا کر بائیں جانب کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ رفیع گنگنانا شروع کرتا ہے۔ سجاد مٹھیاں بھینچے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتا ہے۔)

رفیع :- (زیر لب مسکرا کر) میں نے کہا یار۔ تم نے اور تمھارے بیرے نے بڑی بے دردی سے

برش مارا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گرد کی تہہ اچکن سے اڑکر چہرے پر جم گئی ہوگی۔

سجاد:۔ (چونک کر) واللہ۔ (گھبرا کر جیب سے رومال نکالتا ہے اور رفیع کا منہ جھاڑنا شروع کرتا ہے۔ پیچھے آہٹ ہوتی ہے۔ سجاد اُچک کر ایک دم دور کھڑا ہو جاتا ہے پچھلی دیوار میں بائیں ہاتھ کا دروازہ کھلتا ہے اور بیگم سجاد داخل ہوتی ہیں۔ عمر پینتیس چھتیس کے لگ بھگ، جسم فربہی کی طرف مائل، اونچی ناک، پتلے بھینچے ہوئے ہونٹ، آنکھوں پر چشمہ چہرہ ذرا سخت گیر سا۔ رفیع اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

سجاد:۔ (اسی اعصابی کیفیت میں) بیگم یہ ہیں میرے دوست چو ——— چو ———

(اپنے منہ پر جلدی سے ہاتھ رکھ لیتا ہے)

رفیع:۔ (آداب بجالاتے ہوئے) مجھے رفیع الزماں کہتے ہیں۔

(بیگم سجاد بغور رفیع کو دیکھتی ہیں)

بیگم سجاد:۔ تشریف رکھیئے۔ تشریف رکھیئے۔ انہوں نے کل ہی ذکر کیا تھا آپ کا۔

(بیگم سجاد دیوان پر اور رفیع اب کے صوفے کی بائیں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ سجاد بائیں دیوار والے دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر باہر دیکھنے لگتا ہے۔)

بیگم سجاد:۔ آپ کس وقت تشریف لائے ——— ؟

رفیع:۔ شام کے چار بجے بس پہنچتی ہے۔ اس میں آیا۔

بیگم سجاد:۔ آپ نے چائے تو ....

سجاد:۔ (جلدی سے بڑھ کر) ان کو پلوا دی تھی ——— (رفیع سے) میں نے کہا تھا نا کہ بیگم میرے بغیر کبھی چائے نہیں پیتیں اور میں ان کے بغیر نہیں پیتا۔ (آواز دیتا ہے) بیرا۔

بیگم:۔ یہ گھر میں نہیں ہوتے تو میں عجیب بے سہارا ہو جاتی ہوں۔ یوں تو ماشاء اللہ ——— اللہ رکھے جوان بچے ہیں لیکن ان کے دم سے گھر کا سارا انتظام چلتا ہے۔ یہ غیر حاضر ہوں تو چلتے کام رک جاتے ہیں۔

رفیع:۔ جی ہاں جب سے آیا ہوں۔ سجاد بھائی آپ ہی کا ذکر کررہے ہیں ——— میں نے

میاں بیوی میں نہیں اتنی زیادہ محبت نہیں دیکھی۔

بیگم:۔ (شرما کر) جی ہاں ۔۔۔ میں لاکھ کہتی ہوں اس عمر میں یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے۔ لیکن اپنی اپنی طبیعت ہے۔ ان کی طبیعت میں محبت ہے۔

رفیع:۔ جی ہاں، یہ کالج کے زمانے سے ہی ایسے ہیں۔

بیگم:۔ اچھا ۔۔۔ تو اس زمانے میں کس سے محبت کرتے تھے ۔۔۔؟

رفیع:۔ دوستوں سے ۔۔ کس سے ۔۔۔ ارے یہ نہایت شریف الطبع انسان تھے کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کے کبھی انھوں نے نہیں دیکھا۔

بیگم:۔ (مطمئن) ہاں مجھے معلوم ہے۔ ابھی بیرا کہہ رہا تھا کہ صاحب چائے پی چکے ہیں۔ مجھے بالکل یقین نہیں آیا جھوٹ بول رہا تھا۔ (سجاد سے) یہ ناصر بہت جھوٹ بولنے لگا ہے۔ اسے چھٹی دینی پڑے گی۔

(بیرا کھلے دروازے کے دائیں دروازے سے نمودار ہوتا ہے)

بیرا:۔ جی سرکار ۔۔۔ (سجاد پیچھے ہٹ کر وہاں سے ہاتھ ہلا رہا ہے)

بیگم:۔ (غصے سے) ناصر ۔۔۔۔

رفیع:۔ (بات کاٹ کر) قطع کلامی ہوتی ہے۔ لیکن وہ میری حماقت تھی۔ میں نے دونوں پیالیاں جو رکھی تھی کردیں۔ بیرا سمجھا سجاد بھائی نے چائے پی لی۔

بیگم:۔ ہاں تو یہ بات ہوگئی ہوگی (سجاد کی طرف دیکھ کر) میں نے کہا آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟

سجاد:۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) ذرا گرمی لگ رہی ہے۔ دروازے کے پاس بڑی عمدہ ہوا آرہی ہے۔

بیگم:۔ (بیرے سے) چائے لاؤ۔

بیرا:۔ جی بہتر سرکار ۔۔۔ (اسی دروازے سے لوٹ جاتا ہے)

بیگم:۔ (رفیع سے) بھائی کے لئے میری خواہش سن کر آپ حیران تو ضرور ہوئے ہوں گے ۔۔؟

رفیع:۔ جی نہیں ۔ قطعی نہیں ۔ یہ خواہش عین فطری ہے۔ ہر عورت کے دل میں یہ خواہش ہوتی

ہے کہ اسے ایک باپ، ایک بھائی، ایک میاں اور ایک بیٹا مل جائیں کہیں سے جنھیں وہ جی بھر کر ستائے۔

بیگم:۔ (چونک کر)۔ جی ۔۔!

رفیع:۔ میرا مطلب تھا ۔۔ "جی بھر کر پیار سے" (ہنس کر) کہہ گیا میں ۔۔؟ "ستائے" معاف فرمائیے، سچ بات منہ سے نکل جاتی ہے۔

بیگم:۔ (ذرا بگڑ کر) جی ۔۔؟

رفیع:۔ میرا مطلب تھا جھوٹ بات۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

بیگم:۔ (نرمی سے) آپ کی کوئی بہن بھی ہیں ۔۔؟

رفیع:۔ جی نہیں۔

بیگم:۔ (خوش ہو کر) یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی۔

رفیع:۔ جی ہاں اللہ میاں کی مہربانی ہی رہی ہے ابھی تک۔

بیگم:۔ (تیور بدل کر) تو کیا آپ کو کبھی بہن کی خواہش نہیں ہوئی۔

سجاد:۔ (ایک دم بیچ میں بول کر) بہت! تمھارے آنے سے پہلے مجھے یہی کہہ رہے تھے کہ اگر دنیا میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے تو بہن کی ۔۔ اور بہن کی خاطر کشاں کشاں یہاں چلے آئے۔ وگرنہ وکیلوں کو آج کل فرصت کہاں ۔۔؟ (دائیں جانب آرام کرسی پر یوں بیٹھتا ہے گویا بہت تھک گیا ہے)

بیگم:۔ (رفیع سے) میں نے سنا ہے کہ آپ کو ادب کا بہت شوق ہے۔

رفیع:۔ ہے جی۔ اوڑھنا بچھونا سمجھ لیجیے۔

بیگم:۔ (خوش ہو کر) آپ نے ادبِ لطیف کے تازہ پرچے میں جلال نفیسی کا افسانہ دیکھا؟

رفیع:۔ جی کونسا ۔۔؟ اچھا وہ ۔۔۔ جی ہاں بہت عمدہ تھا۔

بیگم:۔ (ناک چڑھا کر) اچھا۔ میرے خیال میں تو بے حد لغو تھا۔

رفیع:۔ (مسکرا کر) جی میں نے طنزیہ "عمدہ" کہا تھا۔ وگرنہ جلال نفیسی کیا افسانہ لکھے گا۔

بیگم :۔ نہیں صاحب اُس نے ابھی تک سب افسانے اچھے لکھے ہیں۔ اسی ہی میں گڑبڑ کر گیا ہے کچھ۔

رفیع :۔ ہم تو دیگ میں سے ایک دانہ دیکھتے ہیں۔ یہی ایک افسانہ دیکھا اور رائے قائم کرلی۔

بیگم :۔ لیکن بطور ایک نقاد آپ کو چاہیئے کہ اس کی مکمل تحریریں پڑھیں۔ جلال نفیسی صاحب اس وقت اردو کے بہترین ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات سے لاعلمی....

رفیع :۔ بات یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کے ہر رجحان کا ساتھ دینا ایک نقاد کے لئے بڑا مشکل ہے۔ خصوصی مطالعے کے لئے کسی ایک صنف کو انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ مگر آج کل اُردو زبان کو چینی حروف میں لکھنے کے لئے جو تجربات کئے جا رہے ہیں میں ان کا مطالعہ بڑے غور سے کر رہا ہوں۔

بیگم :۔ (حیرت سے) جی ——؟ اُردو کو چینی حروف میں ——؟ یہ تجربہ کب سے شروع کیا گیا ہے؟

رفیع :۔ اخاہ! تو گویا آپ کو علم ہی نہیں ہے۔ ارے صاحب یہی تو ہماری مستقبل کی زبان ہے۔

بیگم :۔ لیکن میں نے کہیں اس کا ذکر نہیں پڑھا۔

رفیع :۔ جی ہاں اکثر تجربے پہلے صیغۂ راز میں رہتے ہیں۔

بیگم :۔ تو آپ کو کیسے پتہ چلا؟

رفیع :۔ میں تو وکیل ہوں صاحب۔ میرا کام تو ہمیشہ ہی سراغ لگانا ٹھہرا۔ ہی ہی۔ ہاں —— اور دینیات اور ناول کے امتزاج سے جو نئی مخلوق آرہی ہے وہ تو آپ نے دیکھی ہوگی۔

بیگم :۔ جی دینیات اور ناول ——؟

رفیع :۔ جی ہاں وہ تو کافی مقبول ہیں آج کل —— "پدم سلطان" —— "پاکدامن جرنیل" وغیرہ

(بیرا چائے لے کر داخل ہوتا ہے اور صوفے کے سامنے چھوٹی میز پر لگا کر چلا جاتا ہے)

بیگم :۔ جی ہاں بڑی کامیاب چیزیں ہیں —— اور آپ تو نہیں پیچھے رہا جائے ——؟

رفیع :۔ جی نہیں شکریہ —— بہت پی ہے۔

بیگم: ۔ (دیوان سے اُٹھ کر صوفے پر آ کر بیٹھ جاتی ہے ــــ سجاد سے) آپ کے لئے بناؤں؟

سجاد: ۔ جی نہیں ـــ (پھر جلدی سے) جی ہاں ضرور ـــ ضرور ـــ!

بیگم: ۔ (گھور کر سجاد کو دیکھتی ہے) آپ ذہنی طور پر غیر حاضر کیوں ہیں ؟

سجاد: ۔ (چونک کر) کیا مجھ سے کہہ رہی ہیں ـــ؟

بیگم: ۔ (طنزیہ) جی ہاں۔ کیوں کالج کے زمانے یاد آ گئے۔ بہت کھوئے کھوئے سے ہیں۔

سجاد: ۔ (ذرا خفیف ہو کر) بیگم سچ پوچھو تو میں کالج ہی کے زمانے کا سوچ رہا تھا۔ کیا دن تھے ـــ! کیا آزادی تھی ـــ!

بیگم: ۔ (تیور بدل کر) تو یہاں قید بھگت رہے ہیں کیا ـــ؟

سجاد: ۔ (جلدی سے) نہیں نہیں۔ (بوکھلاہٹ میں اٹھ کر چائے کی خالی پیالی اٹھا لیتا ہے اُسے خالی دیکھتا ہے تو ہاتھ سے پھسل کر گر جاتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے)

بیگم: ۔ (چیخ کر) کیا کر رہے ہیں! دیکھتے نہیں ابھی چائے نہیں بنی۔ (سجاد جلدی سے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

(خاموشی)

رفیع: ۔ مولانا حالی رحمۃ اللہ علیہ خدا انھیں جنت نصیب کرے۔ بیوی کے بارے میں نہایت عمدہ شعر کہہ گئے ہیں۔ ایک شعر اس وقت یاد آ رہا ہے عرض کرتا ہوں۔

؎ وہ چائے کو شیر و شکر کرنے والی
خطا کار کو درگزر کرنے والی

بیگم: ۔ (مسکرا کر) تصرف تو کوئی آپ سے سیکھے۔!
(چائے بناتی ہے اور اپنی چائے اُٹھا کر پیتی ہے)

رفیع: ۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

بیگم: ۔ میرا خیال ہے کہ ہم بطور بھائی بہن کے نہایت موزوں رہیں گے۔

رفیع: ۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

سجاد:۔ (کرسی سے اُٹھ کر) مبارک باد، مبارک باد۔

(بیگم گھور کر سجاد کو دیکھتی ہے، سجاد واپس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

رفیع:۔ ا: یہ تو خیر کہنا ہی ہے کہ میری حیثیت بڑے بھائی کی ہوگی اور آپ چھوٹی بہن ہوں گی۔

بیگم:۔ جی ہاں ہم تو دُنیا کے دھندوں میں ایسے پھنس گئے ورنہ ہماری عمر کیا ہے۔ ہم چھوٹے چھوٹے کھیلا کرتے تھے جب یہ (سجاد کی طرف اشارہ) کالج میں پڑھتے تھے۔

رفیع:۔ کالج میں ہوتے تھے۔ یوں کہئے۔ پڑھتے تو خیر کیا تھے۔

بیگم:۔ (ہنس کر اٹھتی ہے) میرا خیال ہے۔ میں جاکر بچوں کو بُلا لاؤں۔ اپنے ماموں سے ملاقات کریں۔

سجاد:۔ بیگم رفیع بھائی کچھ تھکے ہوئے ہیں۔ بچے اُودھم مچائیں گے۔ کل پر اُٹھا رکھئے یہ ملاقاتیں۔

بیگم:۔ کیوں بچے ماموں سے کیوں نہ ملیں؟

رفیع:۔ (بیچ بچاؤ کی صورت میں) آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن بات سجاد بھائی کی بھی ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ بڑے دو بچوں سے آج ملاقات کرلیں باقی بھانجے بھانجیوں سے کل ملاقات ہو جائے گی۔ کیوں بہن؟

بیگم:۔ میں تو منیر اور ثریا کو لاتی ہوں (سجاد کی طرف غصے سے دیکھ کر) آپ چائے کیوں نہیں پی رہے۔ برف ہوگئی ہے بالکل۔

(پچھلی دیوار کے بائیں دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

سجاد:۔ (غم زدہ) دیکھا بھائی یہ حالت ہے ہماری۔

رفیع:۔ (سوچتے ہوئے) اچھا یہ بتاؤ کہ جب سے تمھاری شادی ہوئی ہے تم کبھی بیوی سے جُدا ہوئے ہو۔؟

سجاد:۔ وہ گھر سے نکلنے کہاں دیتی ہیں۔

رفیع :۔ (اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے) تو تمھارے زوال کی یہ پہلی وجہ ہے کہ بیوی تم سے بے حد بور ہو چکی ہے لیکن چونکہ تمھیں اس چار دیواری میں دیکھنے کی عادی ہے اس لئے کہیں جانے نہیں دیتی۔ چنانچہ میرے بھائی سب سے پہلے بیوی سے کم از کم دو مہینے کی رخصت لے کر کسی صحت افزا مقام کی طرف ہجرت کرو۔ وہاں پہنچ کے بعد اگر تو تم ہو ہی چکے ہو گے کچھ جائداد اپنے نام الاٹ کراؤ اور عشق فرماؤ۔

سجاد :۔ ایمان سے یہ عشق لڑانے کو تو بے حد جی چاہتا ہے۔ کالج کے زمانے میں تو تم جانتے ہی ہو.........

رفیع :۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں ——— اچھا وہ مخترمہ گئی کہاں ؟

سجاد :۔ (آہ بھر کر) کم بخت نے شادی کرلی۔

رفیع :۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ عورت کو خصوصاً خوبصورت عورت کو شادی کبھی نہیں کرنی چاہیئے خوبصورت عورت تو ایک فن پارہ ہے جسے عجائب گھر میں رکھنا چاہیئے تا کہ کسی کی ذاتی ملکیت نہ بن سکے۔

سجاد :۔ اللہ ——! (پھر بجھے انداز میں) لیکن عورتیں پتہ نہیں کیوں شادی کرنا چاہتی ہیں۔

رفیع :۔ ناعاقبت اندیشی —— بدذوقی۔

سجاد :۔ ساری دنیا کی محبت چھوڑ کر ایک آدمی کی ہو رہتی ہیں۔ اب میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر میری بیوی نے مجھ سے شادی نہ کی ہوتی تو میں اس سے بے حد محبت کرتا

رفیع :۔ تم کیا سبھی اس سے محبت کرتے۔

سجاد :۔ (چونک کر) کس سے —— ؟ میری بیوی سے ؟

رفیع :۔ ارے بھائی تمھاری بیوی تو نہ ہوتی۔ اس وقت تو وہ محض ایک حسینہ ہوتی۔

سجاد :۔ لیکن یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

رفیع :۔ یہ ہے نامعیبت ——— تم جیسوں نے مل ملا کر ہم مردوں کی دنیا ڈبو رکھی ہے "—— برداشت نہیں کر سکتا —— مار ڈالوں گا" وغیرہ۔ آخر عورت کو کہنا پڑتا ہے کہ "نا

کرلو ــــ اور نتیجہ ـ ـ ؟ چلا آرہا ہے بچّے پہ بچّہ ـ کھٹا کھٹ ـ اب خوشی ہو ــــ ؟

سجّاد :۔ سچ کہتے ہو ۔ ان بچوں نے تو رہی سہی بات بھی نہیں رہنے دی ۔

(پیچھے سے آہٹ ہوتی ہے ۔ سجاد جلدی سے چائے کی پیالی اٹھا کر منہ میں انڈیل لیتا ہے اور فوراً رومال سے منہ صاف کرتا ہے)

(بیگم معہ ثریا کے اسی پچھلے دروازے سے داخل ہوتی ہے ۔ ثریا کی عمر تیرہ چودہ برس ہے چنچل اور شوخ سی معقول صورت لڑکی ہے)

بیگم :۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟

رفیع :۔ (جلدی سے) سجاد بھائی کہہ رہے تھے کہ ان کے کردار میں پہلے جو ذمّہ داری کی کمی تھی وہ پہلے بیوی اور پھر بچوں نے دور کردی ۔

بیگم :۔ (خوش ہوکر) یہ تو خواہ مخواہ تعریف کرتے رہتے ہیں (ثریا کی طرف) یہ ہے میری بیٹی ثریا ۔ آپ کی بھانجی ۔

ثریا :۔ (ہنسی روکتے ہوئے) آداب عرض ماموں جان !

رفیع :۔ جیتی رہو بیٹی (بیگم سے) کونسی کلاس میں پڑھتی ہیں ؟

بیگم :۔ اب دسویں جماعت میں ہے ۔

رفیع :۔ ماشاء اللہ ! ماشاء اللہ ۔ بیٹھیے نا (خود دیوان پر بیٹھ جاتا ہے)

بیگم :۔ (سجاد سے) میں نے کہا جاکر ذرا منیر کو تو دیکھیں ۔ کہیں نظر نہیں آیا ۔ جانے کہاں غائب ہے اتنی دیر سے ۔

سجّاد :۔ یہیں کہیں ہوگا ــ (اٹھکر پچھلی دیوار کے بائیں دروازے سے چلا جاتا ہے ۔ بیگم اور ثریا درمیانی صوفے پر بیٹھ جاتی ہیں)

بیگم :۔ رفیع بھائی آپ اس لڑکی کو سمجھائیے ۔ پڑھائی کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتی اور آگے یونیورسٹی کا امتحان ہے ۔

رفیع :۔ تو کرتی کیا ہیں ؟

بیگم :۔ چھوٹے بہن بھائیوں سے کھیلتی رہتی ہے

رفیع :۔ بہن یہی عمر تو ان کے کھیلنے کودنے کی ہے۔ بچوں کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیئے۔

بیگم :۔ یہی اس کے ابا کہتے رہتے ہیں۔ اب آپ بھی اسے شہ دیں گے تو یہ بالکل پاس نہیں ہو گی !

رفیع :۔ پاس کیسے نہیں ہو گی دیکھئے میں ابھی ان کا امتحان لیتا ہوں۔ اچھا بیٹی بتاؤ تمھارا نانا ماں کتنی روٹیاں کھاتا ہے ؟

ثریا :۔ کبھی کبھی۔ ایک وقت میں پانچ۔ چھوڑا بھی ہے۔

رفیع :۔ ٹھیک۔ اور یہ بتاؤ کہ تمھاری امی اپنی صحت کیسے ٹھیک رکھتی ہیں ؟

ثریا :۔ (ماں کی طرف دیکھ کر ہنستی ہے) بتاؤں امی ۔؟

بیگم :۔ ہائیں سنیں اس لڑکی کی باتیں۔ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو ۔۔۔ ؟

ثریا :۔ تو ماموں جان یہ خوب سرخی پوڈر لگاتی ہیں تاکہ اچھی لگیں۔

بیگم :۔ چپ نالائق۔

رفیع :۔ (ہنس کر) بچی ذہین ہے۔ اچھا بتاؤ کہ سرخی پوڈر لگا کر بھی صحت ٹھیک نہ ہو تو کیا کرتی ہیں ۔۔۔ ؟

ثریا :۔ کچھ بھی نہیں ابا جان کو ڈانتی رہتی ہیں ۔۔۔ ! (رفیع ہنستا ہے)

بیگم :۔ چل ہٹ۔ لیا ئن۔ آپ اس کی باتوں پر نہ جایئے جی۔

رفیع :۔ بہر صورت یہ لڑکی اور کسی امتحان میں پاس ہو یا فیل۔ اصل امتحانوں میں یہ پاس ہی ہو گی۔

بیگم :۔ (ثریا سے) چل اٹھ بھاگ جا یہاں سے ۔۔۔ !

(ثریا کھلکھلاتی ہوئی رائیں جانب کے بیرونی دروازے سے نکل جاتی ہے)

بیگم :۔ دیکھیئے رفیع بھائی اس طرح تو بچوں کی تربیت بالکل ستیاناس ہو جائے گی

رفیع :۔ کس طرح ـــــ ؟

بیگم :۔ جس طرح آپ اُن سے باتیں کر رہے تھے ۔

رفیع :۔ بات یہ ہے کہ مجھے بچے پالنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ آپ مجھے بتلا دیجئے ۔ میں اُس پر پُورا پُورا عمل کروں گا۔

بیگم :۔ یہ ثریا بالکل کچھ بھی کسی کی سنتی ہی نہیں ۔ اس کے مقابلے میں میرا بڑا لڑکا منیر ہے ۔ ایسا باسلیقہ ۔ ایسا برخوردار ۔ آپ کو کیا بتاؤں ۔

رفیع :۔ ظاہر ہے کہ آپ نے خود توجہ سے اس کی تربیت کی ہو گی ۔

بیگم :۔ جی ہاں بچپن سے ۔ دیسے تو ماں باپ کو سب اولاد عزیز ہوتی ہے لیکن وہ مجھے ذرا زیادہ عزیز ہے (جلدی سے) اور محض اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ۔ اچھی عادتوں کی وجہ سے ۔

رفیع :۔ تو پھر سجاد بھائی کو بھی عزیز ہوگا ۔

بیگم :۔ جی نہیں چڑتے ہیں ۔ بہت چڑتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ میں نے اُسے بگاڑ رکھا ہے لیکن آپ اس سے ملیں گے تو خود دیکھ لیں گے ۔ بے حد پیارا بچہ ہے ۔

رفیع :۔ یقیناً ۔

بیگم :۔ لیکن ثریا کی دوسری بات ہے ۔ باپ نے لاڈ سے اسے بے حد بگاڑ رکھا ہے ۔ اس کے ساتھ جو سختی برتنی چاہئے وہ قطعی طور پر نہیں برتی جا رہی ـــــ بچوں کا کردار ناپختہ ہوتا ہے ۔ اسے سنوارنے کے لئے ذرا سختی کی ضرورت ہے ۔

رفیع :۔ جی ۔

بیگم :۔ اگر انھیں ڈھیل دے دی جائے تو یہ مہذب انسان بننے کی بجائے وحشی بن جاتے ہیں ۔

رفیع :۔ قطعی ۔

بیگم :۔ ہمارے تمام تمدن اور سیاسی تہذیب کی بنیاد صحیح تعلیم پر ہے ۔

(دائیں جانب بیرونی دروازے سے منیر ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ لئے تیزی سے داخل ہوتا ہے۔ منیر کی عمر کوئی سولہ برس کے قریب ہوگی۔ موٹا سا بدمزاج لڑکا ہے۔ کھیلنے کی نیکر اور سفید جوتے پہن رکھے ہیں۔ اُسے دیکھتے ہی ماں کی باچھیں کھل جاتی ہیں)

منیر:۔ (ریکٹ دائیں جانب پڑی آرام کرسی پر پھینکتا ہے) امی مجھے ابھی ایک دعوت پر جانا ہے۔ اور بیپ نہیں مل رہے۔ ناظم گدھے نے کہاں رکھ دیئے ہیں؟.....

(رفیع کو دیکھ کر رکتا ہے)

بیگم:۔ سُنو بیٹا! ان سے ملو۔ ان کا نام رفیع الزماں ہے۔ یہ ہے جی میرا بڑا لڑکا منیر۔

منیر:۔ (ناپسندیدگی سے رفیع کو دیکھتے ہوئے) آداب عرض۔

رفیع:۔ جیتے رہو۔

منیر:۔ (ماں سے) امی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ کسی سے کہئے نا جاکر ڈھونڈے۔

بیگم:۔ بیٹا یہاں بیٹھو نا ان کے پاس۔ ان سے ملو.......

منیر:۔ میرے پاس ملنے کا وقت نہیں ہے۔

رفیع:۔ صاحبزادے تم تو بڑے بدتمیز نظر آتے ہو۔

(بیگم اور منیر دونوں ٹھٹکتے ہیں)

منیر:۔ فی الحال تو مجھے آپ بدتمیز نظر آتے ہیں۔

رفیع:۔ (اٹھ کر گرجدار آواز میں) ٹھہر جا۔ بتاتا ہوں تجھے۔ بدتمیز کون ہے؟

(لپک کر ریکٹ اُٹھالیتا ہے اور منیر کی پیٹھ پر دو تین رسید کرتا ہے۔ بیگم چیخ مارتی ہے۔ منیر اپنے بچاؤ کے لئے اِدھر اُدھر بھاگتا ہے۔ رفیع اس کا پیچھا کرتا ہے۔ منیر پکارتا ہے ـــ "بچاؤ" ـــ "بچاؤ" ـــ دائیں جانب دیوار والے دروازے سے سجاد بھاگتا ہوا داخل ہوتا ہے)

سجّاد:۔ ہیں! رفیع پاگل ہوگئے ہو تم ـــ!

(رفیع ایک دم رک جاتا ہے اور مسکراتا ہوا سجاد کی طرف آتا ہے)

رفیع: — نہیں بھائی میں تو تہذیب اور تمدن کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہوں۔

سجاد: — تہذیب اور تمدن؟ — کیا مطلب —؟ تم منیر کو مار کیوں رہے تھے؟

منیر: — (روتے ہوئے) ابا جان! یہ غنڈہ آپ کہاں سے پکڑ لائے ہیں؟

(بیگم سجاد آہستہ آہستہ بسورتی ہے)

سجاد: — بات کیا ہوئی ہے آخر — یکایک سب لوگ پاگل ہو گئے ہیں کیا —!

منیر: — (بسورتے ہوئے) یہ چور ہے! یہ دیکھئے اس نے میرے جیب بھی ذرا اگر میں رکھے ہیں

(بیگم سجاد آنکھیں مل کر رفیع کے پاؤں کی طرف دیکھتی ہے)

رفیع: — (طنزیہ مسکراہٹ سے) اچھا بھائی سجاد اس تمیز کے لئے شکریہ — میں گھر سے واپسی ٹکٹ لے چلا تھا (بائیں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) خدا حافظ۔

سجاد: — (روکتے ہوئے) ارے بھائی ٹھہرو تو! ہوا کیا ہے —؟

بیگم: — آہستہ سے) جانے دیجئے۔

رفیع: — اچھا بہن خدا حافظ — بڑی مدت کے بعد ایک دلچسپ شام گزاری ہے۔

(ہنستا ہے)

سجاد: — (روکتے ہوئے) لیکن سنو تو ......

رفیع: — ثریا کو میری طرف سے پیار دینا۔ (دائیں دروازے سے مسکراتا ہوا نکل جاتا ہے)

سجاد: — یہ ہوا کیا ہے —؟

بیگم: — (پیچھے دروازے کی طرف بڑھتی ہے) کچھ نہیں۔ ڈالی کی تربیت جاری رکھئے

——— پردہ گرتا ہے ———

میرزا ادیب

نہ نہ نہ

(تمثیل ایک باب میں)

کردار:————

چپراسی ————

باپ ————

بیٹا ————

جونیئر کلرک ————

سینیئر کلرک ————

سپرنٹنڈنٹ ————

چھوٹا ڈاکٹر ————

بڑا ڈاکٹر ————

کسی پاگل خانے کا کمرۂ ملاقات

کمرہ ملاقات اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے مزین ہے۔ سامنے کی دیوار پر قائداعظم کی بڑی تصویر آویزاں ہے جس کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہے۔

"محبت دیانت داری اور خلوص سے لوگوں کی خدمت کرو۔"

کمرے کے وسط میں ایک نئے ڈیزائن کا صوفہ سیٹ بچھا ہے۔ صوفہ سیٹ سے کچھ ہٹ کر ایک خاص ترتیب کے ساتھ چار کرسیاں رکھی گئی ہیں۔ کرسیوں کے علاوہ ایک خوبصورت چھوٹی سی میز بھی پڑی ہے۔ آنے جانے کے لیے صرف ایک دروازہ ہے جو مغربی دیوار میں ہے اور جس پر نیلے رنگ کا پردہ لٹک رہا ہے۔ سٹیج کا پردہ اٹھنے کے بعد تین چار لمحوں تک سٹیج خالی رہتا ہے۔ پھر چپراسی اندر آتا ہے اور دروازہ

ـناس، سٹیج کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہو۔

دو تین لمحوں کے بعد باپ آتا ہے اور اس کے پیچھے بیٹا۔

باپ نیلے رنگ کے تہمد اور گاڑھے کے کرتے میں ملبوس ہے۔ سر پر پگڑی۔ جسم نحیف و نزار۔ بازو صرف ایک سلامت۔ بایاں بازو غائب۔ داڑھی چھوٹی اور کھچڑی۔ چہرے سے تو عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تاہم چالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔

بیٹا سفید پاجامہ اور سفید کرتے اور کرتے کے اوپر واسکٹ پہنے ہوئے ہے۔ عمر اندازاً پندرہ برس ہوگی۔ چہرے پر بیزاری کے اثرات نمایاں ہیں۔

چپڑاسی انہیں دیکھ کر صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ باپ کمرے کی چھت اور دیواروں پر نظر ڈالتا ہوا صوفے کی طرف جاتا ہے۔ اپنے اکلوتے ہاتھ سے صوفے کی سیٹ کو چھوتا ہے اور پھر اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ چپڑاسی اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ پھر وہ بیٹے کو دیکھتا ہے جو بیزاری اور بے زاری کے عالم میں باپ کے پاس کھڑا ہے۔ باپ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بیٹا نفی میں سر ہلاتا ہے۔

باپ شیرے پتر بیٹھ بھی جاناں۔

بیٹا۔ نہ نہ نہ۔

چپڑاسی۔ ہر نہ کیا ہوا۔

باپ۔ ہر بات پر نہ نہ ہی کہتا ہے۔ اور کوئی بات نہیں کرتا۔ یا "اماں" کہتا ہے۔

چپڑاسی۔ اچھا (بیٹے سے) بیٹھ بھی یار۔ چھوٹے چودھری۔

باپ۔ (چپڑاسی کے انداز تخاطب سے خوش ہو کر) دیکھ پترا! کہا مان لے ناں۔ کتنے پیار سے کہتے ہیں بیٹھ چھوٹے چودھری۔

چپڑاسی۔ اصلی چودھری یہ ہے ہمارے لئے۔ ہاں۔ اچھا بیماری کیا ہے اسے۔

باپ۔ (آہ بھر کر) کیا بتاؤں بھائی۔ بھلا چنگا تھا جیسے دوسرے لڑکے ہوتے ہیں۔ کھاتا تھا۔ کھیلتا تھا۔ ہنستا بولتا تھا۔ میں لڑائی میں چلا گیا تو یہ اداس رہنے لگا۔

چپڑاسی۔ تمہاری جدائی میں۔

باپ ۔ اللہ نے صرف یہی اولاد دی ہے ۔ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے ۔ میں باہر چلا جاؤں تو اداس ہو جاتا ہے ۔

چپڑاسی ۔ تو ایسی حالت کیسے ہو گئی ؟

باپ ۔ میں لڑائی میں تھا اور گھر آنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا کہ گولی (بائیں بازو کی طرف اشارہ کر کے) یہاں لگی ۔ ہسپتال پہنچا دیا گیا ۔ ڈاکٹر نے بازو کاٹ دیا ۔ اور مجھے فوج سے جواب مل گیا ۔ گھر پہنچا تو شیرا بڑا خوش ہوا پر میرے بازو کے کٹ جانے کا اسے بڑا دکھ ہوا اور پھر گھر میں ایک اور مصیبت آ گئی ۔

چپڑاسی ۔ ہوں ۔

باپ ۔ میں بیکار تھا ۔ تنگی رہنے لگی ۔ ساری پونجی لگا کر دوکان کھولی تو اس میں گھاٹا پڑنے لگا ۔ اس کی ماں مجھ سے لڑتی رہتی تھی اور شیرا ہماری لڑائی سے بڑا گھبراتا تھا ۔ ہمیں لڑتا دیکھ کر رو پڑتا تھا اور گھر سے نکل جاتا تھا ۔ اسی زمانے سے اس کی حالت خراب ہونے لگی ۔ پہلے پہل زیادہ چپ نہیں رہتا تھا ۔ پھر اسکے بعد حالت خراب ہوتی گئی ۔

چپڑاسی ۔ تو پیسے ویسے کہاں سے آتے ہیں چودھری ؟

باپ ۔ گذارہ ہو جاتا ہے ۔ روکھی سوکھی کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں ۔

چپڑاسی ۔ دوکان ہے نا ؟

باپ ۔ ہے ۔ میاں یہی تو روٹی دیتی ہے ۔ بارہ چودہ آنے روز بن جاتے ہیں ۔

چپڑاسی ۔ پھر کیا ہوا ؟

باپ ۔ پہلے پہلے تو ہم سے چھپ کر رویا کرتا تھا اور بہت کم بولتا تھا ۔ پھر یہ حالت ہو گئی کہ نہ کھانے کی رہی ، نہ پینے کا دھیان ۔ میں نے یا اس کی ماں نے زبردستی روٹی کھلا دی تو کھا لی ۔ نہیں کھلائی بھوکا ہی پڑا رہا ۔ نہ کسی سے بولنا چالنا ہے نہ کوئی کام کاج کرتا ہے ۔ ہماری تو زندگی برباد کر دی ہے اس نے ۔ اللہ جانے دماغ میں کیا خرابی ہو گئی ہے ۔

چپڑاسی ۔ آلاج کروایا ہے ؟

باپ ۔ بڑا جی ۔ کئی حکیموں نے دیکھا ہے ۔ تو یتاگے تو ہوتے ہی رہتے ہیں ۔

چپڑاسی ۔ فکر کیوں کرتے ہو چودھری ۔ ٹھیک ہو جائے گا ۔

باپ۔ (آدھی کر) ہو جائے تو پھر کیا چاہیئے؟

چپڑاسی۔ تو ــــ دیکھو چودھری [illegible] رہتے ہیں، کچھ دینا دلانا پڑے گا۔

باپ۔ میں کنگال کیا دوں گا؟

چپڑاسی۔ کچھ بات ہو ساتھ لے؟

باپ۔ اس کی ماں نے بڑی مشکلوں سے ڈیڑھ سو روپیہ بچایا ہے۔ ایک ایک پیسہ جوڑ کر میں نے کہا بچی
یہ روپیہ نہیں ہے ہمارے بیٹے کا خرچ ہوگا ہمارا نیر ٹھیک ہو گیا تو ہزاروں روپئے کمالے گا۔
گھر میں بجلی مل ہو جائے گی اس نے بڑے دکھ دیکھے۔

چپڑاسی چودھری مجھے لگتا ہے تمہارا بیٹا بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا یہاں سے تو ایسے لوگ ٹھیک
ہو کر گئے ہیں ان کے شہروں [illegible] میں بارہ جماعت تھے تمہارا لڑکا لڑکے کے سر پر محبت
[illegible] تو ان کے [illegible] کچھ بھی نہیں۔ یہاں بجلی سے علاج ہوگا تو بھلا چنگا
ہو جائے گا۔

باپ اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔

چپڑاسی یہاں پاگلوں کو بڑی ہی مشکل سے داخل کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی سفارشیں ہوتی ہیں۔
اور لوگ بڑا خرچ کرتے ہیں پھر کہیں جا کر کسی کو داخل کیا جاتا ہے۔

باپ۔ اچھا جی۔

چپڑاسی۔ ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں ہزاروں۔

باپ۔ پر میں تو ــــ

چپڑاسی۔ او چودھری گھبرا کیوں گیا ہے؟ ہم مر گئے ہیں جو تیرے بیٹے کا داخلہ نہیں ملے گا۔ دیکھنا ذرا
منشی جی کی مٹھی گرم کر دیں گے تو سارا کام ہو جائے گا

باپ۔ منشی کون ہے؟

چپڑاسی ــ جو یہ داخلہ کرتا ہے۔

باپ۔ کتنے روپے لے گا۔ یار میں بڑا ہی غریب آدمی ہوں۔

چپڑاسی۔ کام تو پچاس ساٹھ کا ہے۔ پر تو پندرہ بیس دے دے۔ منت کر لوں گا تمہاری خاطر۔

(باپ ڈب کھولتا ہے۔ پانچ پانچ کے دو نوٹ نکالتا ہے)

باپ۔ میری طرف سے ہاتھ جوڑ دینا۔ کہہ دینا بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔

چپڑاسی۔ اچھا۔

(چپڑاسی نوٹ لے کر جانے لگتا ہے)

باپ۔ میں نے کہا جی کتنے دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا شیرا؟

چپڑاسی۔ ابھی یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بات ڈاکٹر بتائے گا۔ تمہارا بیٹا ٹھیک بالکل ہو جائے گا اور کیا چاہئے۔

(چپڑاسی کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ باپ ڈب بند کر کے بیٹے کی طرف آتا ہے)

باپ۔ (بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) کیوں شیرے پتر کیا حال ہے؟

بیٹا۔ نہ نہ نہ۔

باپ۔ (بیٹے کی نقل اتارتے ہوئے) نہ نہ نہ — پگلا۔

(جونیئر کلرک آتا ہے دونوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ قمیص اور پتلون پہنے ہوئے ہے تیس سال کی عمر ہوگی)

جونیئر کلرک۔ کیا ہو رہا ہے چودھری؟

باپ۔ سلام صاب جی! — جی اپنے پتر سے کہہ رہا ہوں اب تو ٹھیک ہو جائے گا۔

جونیئر کلرک۔ نہ نہ نہ تو تم بھی کر رہے تھے۔

باپ۔ وہ تو — جی — ہی ہی ہی۔

جونیئر کلرک۔ نام کیا ہے اس کا؟ (بیٹے کے قریب جا کر ذرا اسے غور سے دیکھ کر) یہ تو بالکل بھلا چنگا دکھائی دیتا ہے چودھری۔

باپ۔ ویسے بھلا چنگا ہے پر دماغ میں کچھ ہو گیا ہے۔ چیخ چیخ کر مرجاؤ نہ نہ نہ تریا، اماں کے سوا کچھ نہیں کہتا (آہ بھر کر) ہمارا اس کے سوا اور ہے کون؟ اچھا ہو جائے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے۔

جونیئر کلرک۔ بیڑا ضرور پار ہوگا۔

باپ۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔

جونئر کلرک۔ اگر یہاں پاگل ٹھیک نہ ہوں تو پھر اس ہسپتال کا کیا کام ہے چودھری!

باپ۔ وہاں بڑا علاج کرایا۔ پر کچھ نہ ہوا آخر ایک سیانے نے کہا اسے ———

جونئر کلرک۔ (فقرہ مکمل کرتے ہوئے) پاگل خانے میں لے جاؤ۔

باپ۔ جی ہاں ——— صاب جی! اس کی ماں اور ہم نے بڑا دکھ اٹھایا ہے۔ اللہ کرم کر دے گا تو ہم ساری عمر ہسپتال والوں کو دعائیں دیتے رہیں گے۔

جونئر کلرک۔ انشاء اللہ۔

باپ۔ تو داخل ہو گیا ہے شہزا صاب جی!

جونئر کلرک۔ نہیں بھئی۔ ابھی کہاں۔ یہاں پر تو ایک ایک مہینہ چکر لگتے ہیں جب کہیں جا کے ان کا کوئی عزیز داخل ہوتا ہے۔ تو تم تو ابھی ابھی آئے ہوئے۔

باپ۔ میں تو دور سے آیا ہوں اور پھر بڑا ہی غریب ہوں۔

جونئر کلرک گھبراتے کیوں ہو کوشش کریں گے کہ آج ہی داخل کر لیا جائے۔ عام پاگلوں میں رکھنا چاہتے ہو یا الگ ایک کمرے میں۔

باپ۔ جی۔

جونئر کلرک۔ عام پاگلوں کو تو ایک بڑے کمرے میں رکھا جاتا ہے اگر یہاں داخل کرانا چاہتے ہو تو ابھی کرا دیتا ہوں۔ چپڑاسی نے تمھاری بڑی سفارش کی ہے۔

باپ۔ صاب جی۔

جونئر کلرک۔ کہو میاں۔

باپ۔ الگ ایک کمرے میں رکھ لیں تو آپ کی اولاد کو ساری عمر دعائیں دیتا رہوں گا۔

جونئر کلرک۔ الگ کمرے میں ——— یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔

باپ۔ کھیر؟ ——— جی کیسی کھیر؟

جونئر کلرک۔ ایک صورت ہو سکتی ہے کہ میں صاحب سے کہہ دوں۔

باپ۔ تو کہہ دیں۔ (جونئر کلرک کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) جی۔

جونئر کلرک ذرا دھیرج (باپ کا ہاتھ الگ کرتے ہوئے) اس کی ضرورت نہیں۔ کہہ دوں گا اور کرا بھی دوں گا۔ پر دیکھو وہاں جو نوکر ہوتے ہیں انھیں تنخواہ پاگل کے عزیزوں سے لیکر دی جاتی ہے۔

باپ ۔ کیا دوں ؟

جونئر کلرک ۔ دے دو ۔۔ ہاں ۔۔ دس دس بیس تو ایک نوکر کی تنخواہ ہوئی ۔ دس جمعدار کے اور کچھ انعام۔ بس پینتیس ۳۵ میں کام بن جائے گا۔

باپ ۔ اچھا جناب ۔

(ڈبہ کھول کر پانچ پانچ کے چھ نوٹ ۔ اور پھر ایک اور نوٹ نکالتا ہے اور جونئر کلرک کو دیتا ہے)

ٹھیک ہے جی ؟

جونئر کلرک ۔ ٹھیک ہے، ابھی دیتا ہوں جاکر۔ اور دیکھو میاں! کسی کو بتانا نہیں اور لوگ بھی یہی کر چاہتے ہیں ۔۔ کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔

باپ ۔ اچھا جی !

(جونئر کلرک آگے بڑھ کر بیٹے کی ٹھوڑی انگلی سے چھوتا ہے) ٹھہر جا بیٹا ! اب تجھ سے باتیں ہوں گی

باپ ہنستا ہے ۔ جونئر کلرک دروازے کا پردہ ہٹا کر کمرے سے نکل جاتا ہے ۔ باپ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے ۔۔ بیٹا اٹھ بیٹھتا ہے ۔۔ باپ اس کی طرف تیزی سے جاتا ہے ۔

باپ ۔ پترا ۔۔ میرا بیٹا پترا ! ۔

بیٹا ۔ نہ نہ نہ

باپ ۔ اب تو تیرا علاج ہو رہا ہے ۔ شیرے ۔

بیٹا ۔ اماں ۔۔

باپ : اماں کے پاس چلیں گے ۔ ذرا ٹھہر جا ناں ۔ ضرور چلیں گے ۔ گھر نہیں جائیں گے تو اور کہاں جائینگے

(سینئر کلرک آتا ہے ۔ پتلون اور نیلے رنگ کی بوشرٹ پہنے ہوئے ہے ۔۔ باپ کو غور سے دیکھتا ہے)

سینئر کلرک ۔ اسے دیکھو ۔ بڑے میاں کہاں گئے ؟

باپ بڑے میاں ! کون جی ؟

سینئر کلرک ۔ ایک مولوی کا وقت تھا یاد ہے ہوئے، یہاں جو صاحب بیٹھے تھے سفید داڑھی والے ۔
ان کے ایک لڑکا بھی تھا ۔

باپ ۔ میں نے انہیں دیکھا ہے ۔

سینئر کلرک ۔ حد ہو گئی ہے جبھی پاگل ہیں کئی لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو کہتے ہیں پاگل خانے والے
ٹھیک ہو کر نہیں گئے جا بلکہ صورت کا اب ہو گیا ہے ۔

باپ ۔ ضرور ہوا ہے

سینئر کلرک ۔ سب ہی دیکھو ۔ بڑے میاں دین دار سے یہاں کا چکر لگا رہے تھے ۔ بیٹے کا دماغ ذرا خراب
ہو گیا تھا آدمی نیک ہیں چاہتے ہیں ان کے بیٹے کو اعلیٰ درجے کا کمرہ ملے ۔ آج وہ کمرہ خالی ہوا ہے
وہ ختم ہو گئے ہیں کیا بتایا جا سکتا ہے ۔ کمرہ رک جائے گا اور کیا ہوگا ایسے کمرے ایک
مدت ہی خالی نہیں رہتے ۔

باپ ۔ بہت ... بیٹے کے کمرے بھی ہیں ... ۔

سینئر کلرک ۔ یہ جو کمرہ خالی ہوا ہے بہت ہی اچھا ہے ایک میں دو کمرے ہیں ۔ ایک میں تو مریض رہتا
ہے اور دوسرے میں اس کا کوئی عزیز وغیرہ ۔

باپ ۔ پاگل کا باپ بھی رہ سکتا ہے ۔

سینئر کلرک ۔ یہی بات میں کہہ رہا ہوں مولوی صاحب ۔

باپ ۔ اب ان میں کون جائے گا؟

سینئر کلرک ۔ کون جائے گا، یہ کیوں پوچھتے ہو جو بھی اس کا حق دار ہوگا چلا جائے گا ۔

باپ ۔ میرا مطلب ہے صاحب جی رئیس آدمیوں کے بیٹے ہی ان کمروں میں رہتے ہیں؟

سینئر کلرک ۔ بالکل نہیں ۔ یہ سرکاری ہسپتال ہے ۔ یہاں غریبوں اور امیروں سے ایک جیسا سلوک
ہوتا ہے ۔ کہو کیا بات ہے؟

باپ ۔ میں نے بھی اپنے شیرے کو داخل کرا دیا ہے ۔

سینئر کلرک ۔ داخل ہوا تو نہیں ۔ ہو ضرور جائے گا ۔ مگر معمولی کمرے میں ۔

باپ۔ صاب جی! یہ جو شیرا ہے ناں میرا۔ میرے بغیر کہیں رہ نہیں سکتا۔

سینئر کلرک۔ تو کہنا کیا چاہتے ہو؟

باپ۔ ۔ کرے —

سینئر کلرک۔ "سمجھا — مگر دیکھو۔ مہربانی تو ہوجائے گی پر یہاں جو مریض رکھے جاتے ہیں انھیں بہت قیمتی دوائیں دی جاتی ہیں۔ جو جرمنی، فرانس اور انگلینڈ سے منگوائی جاتی ہیں تاکہ مریض بڑی جلدی ٹھیک ہوجائے۔ دواؤں کی قیمت تو دینی پڑے گی ہاں ٹیکے مفت میں لگیں گے۔

باپ۔ دواؤں پر کتنے پیسے لگیں گے؟

(سینئر کلرک گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہے)

سینئر کلرک۔ کم از کم دو سو۔

باپ۔ اتنی ہمت نہیں۔

سینئر کلرک۔ تم سے بڑی رعایت کردی جائے گی۔ سو دے دو! یہ روپیہ سرکاری خزانے میں جمع ہوگا — ہماری جیب میں ایک دمڑی بھی نہیں جاسکتی۔ سمجھ لیا۔

باپ۔ مجھ سے آدھے پیسے لے لیں — پتہ نہیں اور کہاں کہاں خرچ کرنا پڑے گا؟

سینئر کلرک۔ یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔ سرکاری رقم میں زیادہ کمی نہیں ہوسکتی۔

(سپرنٹنڈنٹ آملے۔ شلوار قمیص اور اچکن پہنے ہوئے ہے۔ معمر آدمی)

سپرنٹنڈنٹ۔ (سینئر کلرک سے) کیا بات ہے نور احمد؟

سینئر کلرک۔ آج وہ دو کمرے خالی ہوئے ہیں نا شاہ جی!

سپرنٹنڈنٹ۔ ہوئے تو ہیں۔

سینئر کلرک۔ ان کے لئے کہہ رہا ہے یہ۔

سپرنٹنڈنٹ۔ (بڑی حیرت سے) "مگر ان کا کرایہ تو ڈھائی سو سے کم ہو ہی نہیں سکتا۔"

سینئر کلرک۔ مجھے رحم آگیا ہے اس بڈھے پر۔ ڈاکٹر کی منت سماجت کرکے سو روپیہ تک کرادوں گا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ کیسے کرادو گے؟ آدھی رقم کیسے معاف کردیں گے؟

سینئر کلرک۔ کیا کیا ملے شاہ جی! اس بیچارے کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ بڑا غریب آدمی ہے۔

باپ۔ جی میں بڑا ہی مسکین بندہ ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ۔ یہ تو سہی۔ اتنی رقم معاف نہیں ہو سکتی۔ لوگ تو پانچ پانچ سو دینے پر تیار ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ کمرے نہیں دئے جاتے۔

باپ۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ ایک غریب کا گھر آباد ہو جائے گا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ ہاں دیکھو تم گھر سے لائے کیا تھے؟

باپ۔ ڈیڑھ سو جی۔

سپرنٹنڈنٹ۔ دیکھو نور محمد اس سے یہی رقم لے لو۔

باپ۔ اب ڈیڑھ سو نہیں رہ — جی — اب تو ایک سو اور پانچ ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ۔ تم یہ روپیہ کس لئے لائے تھے؟

باپ۔ ایک سیانے نے بتایا تھا کہ سرکاری ہسپتال میں روٹی کا خرچ دینا ہی پڑتا ہے — میں چاہتا ہوں میرے بیٹے کو بڑی اچھی خوراک ملے۔

سپرنٹنڈنٹ۔ انڈے۔ مکھن۔ پنیر۔ گھی۔ دودھ۔ پھل۔ پراٹھے۔ یہی چاہتے ہو نا۔

باپ۔ (حیرت سے) ہاں جی!

سپرنٹنڈنٹ۔ یہ چیزیں تمہارے بیٹے کو بالکل مفت ملا کریں گی۔

سینئر کلرک۔ صرف تمہارے بیٹے ہی کو نہیں تمہیں بھی — اور پھر خدمت کرنے کے لئے دو نرسیں اور دو نوکر بھی ہوں گے۔ اور اب کیا چاہتے ہو؟

باپ۔ جی یہ چیزیں سچ مچ ملا کریں گی؟ جی سچ؟ میرا مطلب ہے ان کے پیسے تو نہیں دینے پڑیں گے جی۔

سینئر کلرک۔ تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟

باپ۔ صاحب جی! ایک سو پانچ یہ ہیں (ڈبہ کھولتا ہے) اور یہ پیسے میں اپنے لئے لایا تھا۔ اور تو میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں بچی۔"

سینئر کلرک۔ (سپرنٹنڈنٹ سے) "شاہ جی بڑے ڈاکٹر کی زیادہ منتیں کریں گے۔

سپرنٹنڈنٹ۔ بات مشکل نظر آتی ہے۔ اچھا۔

باپ۔ (سارے روپے سپرنٹنڈنٹ کو دیتے ہوئے) اللہ آپ کو ہسپتال کا مالک بنا دے۔

(سینئر کلرک اور سپرنٹنڈنٹ دونوں مسکراتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نوٹ جیب میں رکھ لیتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ۔ ہم دونوں بڑے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں تمہیں لے جائیں گے۔

(دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ باپ دونوں کے ساتھ دروازے تک جاتا ہے۔ پھر واپس آتا ہے۔ بڑا خوش نظر آ رہا ہے۔ آتے ہی بیٹے سے لپٹ جاتا ہے)

باپ۔ اب تو بیڑا پار ہو گیا ہے شیرے! دو کمرے ملیں گے اور کھانے کو انڈے۔ دودھ۔ پھل۔ میرا شیرا پہلوان ہو کر نکلے گا۔ کیوں شیرے ـــــــــ تمہیں کمرے میں چھوڑ کر اپنے چودھری فضلے کے پاس جاؤں گا۔ اس سے کرایہ لے کر تیری ماں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اور اسے خبر سنا کر تمھارے پاس آ جاؤں گا۔

بیٹا۔ نہ نہ نہ۔

باپ۔ اللہ نے بڑا ہی فضل کیا ہے۔ تیری پگلی ماں تو یوں ہی گھبرا رہی تھی۔ اب اسے جا کے بتاؤں گا کہ تیرا بیٹا عیش کر رہا ہے تو وہ حیران رہ جائے گی۔

بیٹا۔ اماں۔

باپ۔ اب تو اپنی اماں کے پاس جائے گا تو دوسرے لڑکوں کی طرح ہو گا۔ سمجھدار اور چنگا بھلا تیری ماں تو تجھے دیکھ کر خوشی سے پھول ہی جائے گی۔

(ایک ڈاکٹر آتا ہے اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس)

ڈاکٹر۔ (بیٹے کو دیکھتے ہوئے) تو یہ لڑکا ہے؟

باپ۔ جی ڈاکٹر صاحب جی۔

ڈاکٹر۔ بولتا چالتا نہیں ہے؟

ڈاکٹر۔ مار سکتا تو نہیں تھا۔

باپ۔ جی نہیں۔

ڈاکٹر۔ (بیٹے سے) کیوں علی کیا بات ہے؟

باپ۔ اس کا نام شیر ہے جی۔

ڈاکٹر۔ شیر! شیخ صاحب نے تو اپنے خط میں اسکا نام علی بتایا ہے ۔۔۔ (جیب سے خط نکال کر [illegible]) ہاں علی ہی تو تھا اس کا نام۔

باپ۔ ہیں جی شیر ہے۔ اس کی ماں کہتی تھی بیٹا شیر دل ہوگا شیر کی طرح اسی نے نام رکھا تھا۔

ڈاکٹر۔ مجھے شیخ سعد علی نے بھیجا ہے۔

باپ۔ ہم تو بہت دور سے آئے ہیں۔ ہمیں بابو نے کہا تھا اسے پاگل خانے لے جاؤ۔

ڈاکٹر۔ یہاں پوری ۔۔۔ دیکھ بھال ہوگی۔

باپ۔ ڈاکٹر صاحب جی! ہم کمروں میں کب جائیں گے؟

ڈاکٹر۔ ہسپتال میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

(ڈاکٹر تیزی سے چلا جاتا ہے۔ باپ حیرت سے وہیں کھڑا رہ جاتا ہے)

باپ۔ پتہ نہیں کون تھا؟

(بیٹا دروازے کی طرف جانے **لگتا ہے**)

تمہارے شیر کہاں چلے؟

(بیٹا چلا جاتا ہے باپ بھاگ کر اسکا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

کیوں شیر کیا ہوا۔ ابھی ہم اپنے کمروں میں چلے جائیں گے (بیٹے کو صوفے کی طرف لیجاتا ہے)

بیٹا۔ اماں

باپ۔ بس ابھی جاتے ہیں۔

(چپراسی آتا ہے)

لو آگیا (چپراسی سے) **چلو یار بڑا تنگ کر رہا ہے۔**

(باپ بیٹے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ اور دروازے کی طرف جاتا ہے۔ چپڑاسی وہیں کھڑا رہتا ہے)

چپڑاسی۔ کدھر چلے چودھری؟

باپ۔ اپنے کمروں میں جائیں گے ناں ــــ میں اسے چھوڑ کر اس کی ماں کو خبر سنانے جاؤں گا۔ ذرا اس کا خیال رکھنا ــــ تمھاری خدمت کر دیں گے یار!

چپڑاسی۔ چودھری! معاملہ کچھ خراب ہو گیا ہے۔

باپ۔ کیا؟

چپڑاسی۔ معمولی بات ہے۔ ہوا یہ کہ جب ہمارے صاب تمھاری درخواست لیکر بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں گئے تو ڈاکٹر باہر جا رہے تھے۔ تمھاری درخواست پر ان کے دستخط نہیں ہوئے۔

باپ۔ تو پھر کیا ہو جائیں گے۔

چپڑاسی۔ قانون یہ ہے کہ جب تک بڑے ڈاکٹر کے درخواست پر دستخط نہ ہوں کسی بیمار کو یہاں داخل نہیں کیا جا سکتا ــــ یہ آرڈر ہے گورنمنٹ کا۔

باپ۔ ڈاکٹر صاحب کب تک آجائیں گے؟

چپڑاسی۔ کوئی پتہ نہیں! کبھی ایک ہفتہ باہر رہتے ہیں اور کبھی پندرہ دن۔

باپ۔ پندرہ دن؟

چپڑاسی۔ جلدی بھی آجاتے ہیں۔ گھبرا کیوں گئے ہو۔ یہاں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

باپ۔ ہونا رہے مجھے کیا۔ مجھے تو وہ کہہ کر گئے ہیں کہ تم دونوں کو ابھی کمرے مل جائیں گے۔

چپڑاسی۔ کون کہہ کر گئے ہیں؟

باپ۔ کالے کوٹ والے۔

چپڑاسی۔ وہ ہمارے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

باپ۔ وہ ابھی آئیں گے اور ہمیں کمروں میں چھوڑ آئیں گے۔

چپڑاسی۔ ابھی شاہ صاحب نے کہا ہے کہ تم واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔ بڑے ڈاکٹر آئیں گے تو تمہیں خط لکھ کر بلا لیا جائے گا۔

باپ۔ کیا؟

چپڑاسی۔ گھر چلے جاؤ۔

باپ —— دیکھ لینا ابھی ہم مردوں میں چلے جائیں گے۔

چپڑاسی مر دو جاؤ گے بہ آنی نہیں۔

باپ ہم تو اندر ہی جائیں گے۔

(جونیئر کلرک آتا ہے)

جونیئر کلرک (باپ سے) کیا بات ہے چودھری؟

باپ جی ذرا دیکھو نا یہ (اس کی طرف اشارہ کرکے) یہ کہتا ہے تم گھر چلے جاؤ۔

جونیئر کلرک۔ بات یہ ہے چودھری ہمارے بڑے ڈاکٹر صاحب ایک بے حد ضروری کام پر باہر چلے گئے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہیں آ جائیں گے تو کام ہو جائے گا۔ چند روز ہی کا تو معاملہ ہے۔

باپ میں تو بڑی مشکل سے تیس کوس سے لایا ہوں ضرور انہیں تو آج ہی داخل کرلیں۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔

جونیئر کلرک۔ یہ تو بڑا اچھا بچہ ہے تمہارے ساتھ چلا جائے گا اور پھر تمہارے ساتھ واپس بھی آجائے گا۔

باپ۔ نہ جی

جونیئر کلرک یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے چودھری جب تک بڑے ڈاکٹر صاحب کی منظوری نہ مل جائے ہم کسی کو عام کمرے میں نہیں لے جا سکتے۔ پاگل خانے کے قانون بڑے سخت ہیں۔

باپ۔ وہ داخل کریں گے۔

جونیئر کلرک۔ وہ ۔ کون وہ؟

چپڑاسی۔ شاہ صاحب کو کہتا ہے۔

جونیئر کلرک (چپڑاسی سے) تو انہیں بلالو خود آکر کہہ دیں گے۔

(چپڑاسی چلا جاتا ہے)

چودھری! یہ شاہ صاحب کی بڑی مہربانی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اتنی رعایت کر رہے ہیں یہاں تو بھائی لوگ چھ چھ ماہ چکر لگاتے ہیں۔ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں جب کہیں جاکر کسی کو داخل کیا جاتا

سے ہے۔ شاہ صاحب کا کہا مان کر چپ چاپ چلے جانا۔ ضد نہ کرنا خوامخواہ ناراض ہو جائیں گے۔

(سپرنٹنڈنٹ آتا ہے)

باپ (بھاگ کر اس کے پاس پہنچتے ہوئے) صاحب جی یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

سپرنٹنڈنٹ۔ کیا کہوں چودھری۔ وہ اپنے ڈاکٹر صاحب دستخط کرنے سے پہلے ہی چلے گئے اور اب آئیں گے کہیں دس پندرہ دن کے بعد۔ میں نے تمھاری درخواست لکھ لی ہے۔ بس دستخط کرانے کی دیر ہے۔ تم اپنا پتہ لکھوا کر چلے جاؤ۔

(باپ دو تین لمحے چپ چاپ سپرنٹنڈنٹ کو دیکھتا رہتا ہے)

باپ۔ صاب جی، میں شیرے کو ایسے ہی گھر لے گیا تو اس کی ماں کا بہت برا حال ہو جائے گا۔ سات آٹھ مہینے سے کھانسی والے بخار سے مر رہی ہے۔ اس نے روپیہ اپنی بیماری پر خرچ نہیں کیا مجھے دیدیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ۔ تم سمجھے نہیں ہو بات تمھارا بیٹا ضرور داخل کر لیا جائیگا مگر چند روز یا چپ بیٹھے ہو۔ جب بڑے ڈاکٹر صاحب واپس آجائیں گے۔

باپ۔ تو میں شیرے کو واپس کیسے لے جاؤں؟

سپرنٹنڈنٹ۔ جس طرح لے کر آئے تھے۔

جونیئر کلرک۔ اپنا پتہ لکھواؤ (ایک جیب سے فونٹین پن اور دوسری سے کاغذ نکالتا ہے) کیا پتہ ہے؟

باپ۔ اچھا یوں کر لو۔ میں داخل نہیں ہوں گا۔ گھوم پھر کر دن گزار لیا کروں گا۔ شیرے کا علاج کر دو۔

سپرنٹنڈنٹ۔ فضول وقت ضائع کر رہے ہو ایک مرتبہ کہہ دیا ہے چلے جاؤ۔ بس چلے جاؤ اسی میں تمھاری بہتری ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں تمھارا ہی بھلا ہے۔ لو اب وقت نہ گنواؤ چلے جاؤ۔

باپ۔ چلا جاؤں؟

سپرنٹنڈنٹ۔ ہاں!

باپ۔ میں نے سارا مال دے دیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ (غصے سے) کیا مال دیا ہے۔ یہاں لوگ ہزاروں خرچ کر دیتے ہیں اور پھر بھی ان کو داخل نہیں کیا جاتا۔

باپ صاحب جی! آپ تو کچھ بتا ہی نہیں رہے ـ

سپرنٹنڈنٹ۔ ایک مرتبہ بتا دیا ہے نا ـ بس چلے جاؤ ـ خط ملے تو آجانا ـ

(چھوٹا ڈاکٹر آتا ہے)

چھوٹا ڈاکٹر۔ (سپرنٹنڈنٹ سے) شاہ جی! شیخ صاحب کی سفارش آئی تھی ـ ایک لڑکے کے متعلق ـ

علی رس کا نام ہے ـ وہ کل آدمی بھیج کے کہہ رہے تھے کہ آج لے کر آئے گا تو ـ

سپرنٹنڈنٹ بہت اچھا جی ـ

باپ (چھوٹے ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر) ڈاکٹر جی مجھ پر رحم کرو ـ میرے شیرے کو داخل کر لو ـ

چھوٹا ڈاکٹر۔ (سپرنٹنڈنٹ سے) شاہ جی! ٹھیک ہے تو داخل کر لو ـ

باپ۔ ڈاکٹر جی بڑے ڈاکٹر جی تو باہر چلے گئے ہیں ـ آپ منظوری دے دیں ـ

چھوٹا ڈاکٹر۔ بڑے ڈاکٹر صاحب یہیں ہیں ـ باہر کہاں گئے ہیں ـ (سپرنٹنڈنٹ سے) تو شاہ جی! اس

کیس کا خاص خیال رکھنا ـ علی نام ہے لڑکے کا ـ

سپرنٹنڈنٹ۔ اچھا جناب ـ

(چھوٹا ڈاکٹر چلا جاتا ہے)

باپ۔ بڑا ڈاکٹر یہاں ہے ـ تم کہتے تھے بڑا ڈاکٹر باہر چلا گیا ہے ـ

سپرنٹنڈنٹ۔ (باپ کو غضبناک نظروں سے دیکھ کر) جاؤ اب تمہارا بیٹا داخل نہیں ہوگا ـ

باپ۔ کیوں ـ

سپرنٹنڈنٹ نہیں ہوگا --- ضد کرتے ہو ـ تمہاری یہی سزا ہے کہ آئندہ تمہیں یہاں آنے کی

اجازت ہی نہ دی جائے ـ

باپ ایسا نہ ہو صاحب جی ـ آپ نے میرے سارے پیسے لے لئے ہیں ـ اور اب ـــــ

سپرنٹنڈنٹ۔ بس ـ کون سے پیسے ـــــ جاؤ دفع ہو جاؤ ـ چپڑاسی دیکھو اگر یہ نہ جائے تو اسے

دھکا دے کر نکال دو ـ

چپڑاسی۔ اچھا جی ـ

باپ۔ کون سے پیسے۔ میں نے تمہیں کم از کم دو سو روپیہ نہیں دیا۔ تم سب نے میرا روپیہ لیا ہے — اب کہتے ہو کون سے پیسے۔ (باپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ رہا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ چپراسی اور جونیئر کلرک چلے جاتے ہیں۔ باپ انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے۔ بیٹا باپ کے پاس آتا ہے)

بیٹا۔ اماں۔

باپ۔ (غصے میں بیٹے کو زور سے ہاتھ مارتے ہوئے) ٹھہرا دے سو، دے پتر!

(بیٹا منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ اٹھتا ہے۔ باپ کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا پیچھے چلا جاتا ہے۔ اس کی پیشانی زخمی ہو گئی ہے۔ باپ اس طرف جانے لگتا ہے)

بیٹا۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے) نہ نہ نہ۔

(چپراسی دروازے پر آتا ہے)

چپڑاسی۔ چلو چودھری!

(باپ مڑ کر اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھتا ہے)

جاتے ہو یا دھکے مار کر نکالوں۔

(باپ تیزی سے اس کی طرف آتا ہے اور زور سے اس کا گریبان پکڑ لیتا ہے)

باپ۔ نکالو دھکے مار مار کر۔ نکالو کس طرح نکالتے ہو۔ نکالو۔

(چپڑاسی شاہ جی مار ڈالا، شاہ جی مار ڈالا۔ چلا چلا کر کہتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ اور دونوں کلرک آتے ہیں)

سپرنٹنڈنٹ۔ (باپ کا ہاتھ چپڑاسی کے گریبان سے الگ کرتے ہوئے) چھوڑ بدمعاش۔

باپ۔ میرا سارا روپیہ دو — میرا روپیہ دو —

سپرنٹنڈنٹ۔ دیں تمہیں روپیہ۔ یہ لو۔

(سپرنٹنڈنٹ باپ کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے۔ بیٹا باپ کے پاس آ کر کہتا ہے نہ نہ نہ۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا ہے۔ باپ کی نظر اس کی پیشانی پر پڑتی ہے اور اس کی گرفت اور زیادہ سخت ہو جاتی ہے)

سپرنٹنڈنٹ۔ کمینے پاجی ہٹ۔ کہہ کر اسے ہٹا رہا ہے۔ اب دونوں کلرک بھی باپ کو ہٹاتے ہیں۔

(چپراسی کا گریبان پھٹ گیا ہے۔ کلرک باپ کو ایک طرف گرا دیتے ہیں)

(بڑا ڈاکٹر آتا ہے۔ شاندار سوٹ پہنے ہوئے۔ آنکھوں پر عینک)

بڑا ڈاکٹر۔ یہ شور کیا ہے کیا بدتمیزی ہو رہی ہے۔ نان سنس۔

(سپرنٹنڈنٹ، کلرک اور چپراسی ایک طرف ہٹ جاتے ہیں)

سینئر کلرک۔ (باپ کی طرف اشارہ کرکے) پتہ نہیں سرکار اس شخص کو کیا ہو گیا ہے۔ کہتا ہے میرے بیٹے کو ابھی داخل کرو ورنہ میں نہیں جاتا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ چپراسی کا گریبان پھاڑ دیا ہے۔ ہم نہ آتے تو اس کو مار ہی ڈالتا۔

باپ۔ (روتے ہوئے) صاحب جی! اللہ واسطے میری فریاد سن لو۔ یہ کہتے تھے تم دونوں کو داخل کر لینگے۔ مجھ سے سارا روپیہ لے لیا ہے اور اب کہتے ہیں بڑا ڈاکٹر یہاں نہیں ہے۔

بڑا ڈاکٹر۔ روپیہ لیا ہے؟ کیا مطلب؟

باپ۔ میرا سارا روپیہ جی — تیس کم دو سو روپیہ

بڑا ڈاکٹر۔ (سپرنٹنڈنٹ سے) یہ کیا گڑبڑ ہے؟ کیا ہو رہا ہے

سپرنٹنڈنٹ۔ کچھ نہیں حضور، یہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔

باپ۔ میں (بیٹے کی طرف اشارہ کرکے) اپنی اولاد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ انھوں نے مجھ سے سارا روپیہ لے لیا ہے

بڑا ڈاکٹر۔ ہوں سمجھا۔ سپرنٹنڈنٹ، جاؤ تم لوگ۔

(سپرنٹنڈنٹ، دونوں کلرک اور چپراسی چلے جاتے ہیں)

باپ (آنکھوں میں امید کی چمک) ڈاکٹر جی! آپ نہ آتے تو میرا بیڑا غرق ہو جاتا۔ کہتے تھے بڑا ڈاکٹر باہر چلا گیا ہے

بڑا ڈاکٹر۔ قصہ کیا ہے؟ (شیرے کی طرف دیکھ کر) اسے داخل کرانا چاہتے ہو اور اس کے ماتھے سے تو خون بہہ رہا ہے۔ صاف کرو

(باپ کرتے سے بیٹے کا ماتھا صاف کرنے لگتا ہے)

بیٹا۔ نہ نہ نہ۔

بڑا ڈاکٹر۔ تو تم اس کا علاج کروانا چاہتے ہو؟

(باپ اثبات میں سر ہلاتا ہے)

باپ۔ ہاں جناب!

بڑا ڈاکٹر۔ علاج ہو جائے گا۔

باپ۔ ڈاکٹر جی وہ کہتے تھے۔

بڑا ڈاکٹر۔ ان کا ذکر چھوڑو۔ نپٹ لوں گا۔ ان سے کب داخل کروانا چاہتے ہو؟

باپ۔ آج ہی داخل کرلیں۔

بڑا ڈاکٹر۔ آج ہی ہو جائے گا۔

باپ۔ (ڈاکٹر کو بڑی ممنونیت سے دیکھتے ہوئے) میری سات پشتوں پر آپ کا احسان رہے گا۔ اللہ آپ کو ۔۔۔

آپ کو ۔۔۔ (جذبات کی شدت میں کچھ سوجھتا نہیں)

بڑا ڈاکٹر۔ مگر دیکھو۔!

باپ۔ جی حضور!

بڑا ڈاکٹر۔ اس کے لئے پانچ سو کا انتظام کرنا ہوگا۔

باپ۔ (ایک دم بھونچکا ہو کر) جی!

بڑا ڈاکٹر۔ روپیوں کا انتظام کرلو۔ تمہارا بیٹا بالکل تندرست کر دیں گے' ہاں دیکھو

(باپ اس طرح ساکت ہو جاتا ہے جیسے کچھ سوچنے سمجھنے کی قوت سے محروم ہو گیا ہو)

اگر اس وقت یہ رقم نہیں ہے تو انتظام کر کے لے آؤ۔ آکر صرف مجھی سے ملو!۔۔۔ سیدھے میرے کمرے میں

آجاؤ۔ ان لوگوں سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھ لیا نا! بہت خبیث لوگ ہیں۔

(ڈاکٹر جانے لگتا ہے ۔۔۔ ایک لمحہ رکتا ہے ۔۔۔ باپ کو غور سے دیکھتا ہے اور پھر اس طرح کندھے کو جنبش

دیتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ تمہاری مرضی)

باپ دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر دروازے سے نکل جاتا ہے۔

باپ، بے حس و حرکت وہیں کھڑا ہے۔

[illegible] ہے۔

بیٹا۔ اماں!

(باپ بدستور بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے)

ماں!

(بیٹا اس کے کرتے کا دامن کھینچتا ہے)

اماں!

([illegible] دروازے کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ باپ [illegible] مڑ کر دیکھنے لگتا ہے)

۔ ۔ ۔

باپ۔ ۔ ۔ ۔

بیٹا۔ ۔ ۔ ۔

باپ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

([illegible] اور اسی حالت میں پردہ [illegible])

نظمیں

اجمل اجملی

"غالب"

غالب وہ برگزیدہ اربابِ افتخار   غالب وہ نازشِ چمنستانِ روزگار
غالب سخن شناس سخن ور سخن شعار   وہ جس کے ایک شعر پہ سو جنتیں نثار
جانِ نسیمِ صبح تھا، روحِ گلاب تھا   تارے تھے ارد گرد وہ اک ماہتاب تھا

اشعار کی زبان میں انساں کے تجربات   جن کے پیچ و خم میں نہاں شورشِ حیات
لمحے میں ماہ و سال تو قطرے میں کائنات   بیگانۂ قیود تھے اس کے تخیلات
اس سمت میں معلمِ اول کا نور تھا   اس کا شعور آدمِ نو کا شعور تھا

وہ طنز، وہ خطاب، وہ اشعار، وہ سخن   سانسوں کی وہ نسیم، وہ احساس کی جلن
اف وہ نگاہِ فن سے نکلتی ہوئی کرن   اللہ رے وہ زورِ طبیعت وہ بانکپن
خوگر ہوا جو درد سے درماں بنا دیا   جو مشکلیں پڑیں انھیں آساں بنا دیا

اس جبر پاکباز پہ کیا کیا نہ ہنس پڑی   کوئی خفا ہوا کبھی روٹھا کوئی کبھی
افلاس نارسائی و آشفتہ خاطری   یہ زندگی بھی کتنے مزے میں گزار دی
کوزہ ملے تو ساغرِ جم سے غرض نہ تھی   اس کو کسی کے جاہ و حشم سے غرض نہ تھی

ہر چند کی مشاہدۂ حق کی گفتگو   لیکن نہ چھوٹا ہاتھ سے دامانِ رنگ و بو
پائے بتاں پہ سر جھکا زاہد کے روبرو   پیش جناب شیخ ہوئی بیعتِ سبو
جامِ شراب اچھال کے تارا بنا دیا   اردو کو اس نے انجمن آرا بنا دیا

احسان دربھنگوی

التجا

اُندھی اُندھی ہوئی آنکھوں کا یہ پیام احساں! کہ اس طرح تو نہ لو مجھ سے انتقام احساں!
صنم کدوں میں گذارو نہ صبح و شام احساں! کرو نہ اپنی جوانی کو غرق جام احساں!
بُجھا چکی ہوں جو شعلے اُنھیں ہوا تو نہ دو
میں صدقے، میری محبّت کو یہ سزا تو نہ دو

یہ کیا کہ خود کو تماشا بنائے جاتے ہو قدم خلاف توقع اُٹھائے جاتے ہو
خرد کے ہاتھ سے دامن چھڑائے جاتے ہو جنوں کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہو
خدا گواہ، شکن ہے وفا کے ابرو پر
وفا کو تولتے ہو شوق کی ترازو پر

میں کیا بتاؤں کہ آخر خطا ہے کیا میری یہی کہ عقل ابھی تک ہے رہنما میری
بلند اور بھی ہمّت کرے خدا میری تمھارے شوق سے ڈرتی رہے وفا میری
مروں وفا کی روایت کو زندگی دے کر
بجھوں تمھاری محبّت کو روشنی دے کر

میں کیا کہوں کہ محبّت کو ہے گلا تم سے میں کیا کہوں کہ خجل ہے مری خطا تم سے
کہے گی کچھ مری سہمی ہوئی وفا تم سے یہ سوچتی ہوں کروں ایک التجا تم سے
مگر یہ ڈر ہے کہ دوگے جواب اشکوں سے
اُبل پڑے گا تمھارا عتاب اشکوں سے

میں کیا کہوں کہ گراں دل پہ ہے امانت غم نہ یاد ہو تو سنو میری داستانِ الم
دُلہن جو بیاہ کے لائے تھے تم خوش و خرم میں گا رہی تھی مگر دل میں تھا بپا ماتم

تمہارا ساتھ اگرچہ نہ دے سکی وہ غریب
شکستہ کشتیِ ہستی نہ کھے سکی وہ غریب

مگر تمہاری وفا کا تو امتحان ہوا حریف تم ہوئے میرے کہ آسمان ہوا
[illegible] بدگمان ہوا وہ سکوت بڑھا، بڑھ کے داستان ہوا

تمہارے پاؤں کی بیڑی اتاری قسمت نے
بنا دیا مجھے قیدی اُدھر مشیّت نے

تمہیں تو دیکھ کے اب مسکرا نہیں سکتی ہمارا نازِ محبت اُٹھا نہیں سکتی
[illegible] دامن چھڑا نہیں سکتی گھری ہوں جن میں وہ دیواریں ڈھا نہیں سکتی

جسے سہاگ نے لوٹا ہے میں وہ عورت ہوں
تمہاری ہے جسے زندگی وہ میّت ہوں

اگرچہ دل کا تقاضا کچھ اور ہے لیکن مرے جنوں کا ارادہ کچھ اور ہے لیکن
[illegible] سوچا کچھ اور ہے لیکن سسک کے مرنے سے اچھا کچھ اور ہے لیکن

بس اب سسک کے مروں گی کہ زندگی یہ ہی
وفا کا قرض بھروں گی کہ زندگی یہ ہی

میں سنگدل کو تم میرا مدعا نہ کہو یہ میرا خونِ جگر ہے اسے حنا نہ کہو
یہ کیوں کہوں کہ غلط ہو مری خطا نہ کہو مگر خدا کے لئے مجھ کو بے وفا نہ کہو

جو عشق ہے تو ہوس کو نہ راہ دو احسان!
پناہ مانگ رہی ہوں، پناہ دو، احسان!

حرمت الاکرام

پیچ و خم

اتفاقات کی کار فرمائیاں ہر گھڑی اک نیا روپ بھرتی رہیں
شبنمی خوابوں کی عنبریں نکہتیں زندگی کے چمن میں بکھرتی رہیں
اور ہر گام پر گتھیاں فکر کی اک نئے مرحلے سے گزرتی رہیں

رہ گزاروں کی پہنائیوں میں کبھی ہر قدم پر کوئی پھول بکھرا گیا
گاہ انگاروں کو فرشِ رہ دیکھ کر ایک انجان اندیشہ لہرا گیا
وقت کے پیچ و خم سے گذرتے ہوئے راستہ میں ترا گاؤں بھی آ گیا

لہلہاتے مناظر کی آغوش میں اک انوکھی چبھن کسمساتی ہوئی
شوخ ذروں کی گستاخ تابندگی چاند تاروں کے گھونگھٹ اٹھاتی ہوئی
پنگھٹوں پر کھنکتی ہوئی چوڑیاں اور ہی کوئی جادو جگاتی ہوئی

خیر مقدم کو ہر موڑ آگے بڑھا ایک ایک پل میں کتنے زمانے لیے
اجنبی بام و در مسکرانے لگے نغمگیں دھڑکنوں کے فسانے لیے
چونک اٹھی وادیوں کی طلسمی فضا کتنے افسانوں کے تانے بانے لیے

حسنِ ماحول کے بیکراں سحر میں — عقل کی سرکشی ڈگمگاتی رہی
دل کی وارفتگی عزمِ بیدار پر — طنز کرتی رہی مسکراتی رہی
اک کرن، نور کی اک چمکتی کرن — ذہن کو چھیڑتی گدگداتی رہی

تھم گئی چند لمحوں کی آہِ سحر — نالۂ نیم شب کی زباں سِل گئی
سرد جھونکوں کی آغوش وا دیکھ کر — آرزوؤں کے دل کی کلی کھِل گئی
جادۂ زیست کے اس نئے موڑ پر — میری درماندگی کو اماں مِل گئی

چند دن گذرے لمحوں کی صورت مگر — بیکراں شادمانی سمیٹے ہوئے
چند راتیں کٹیں ثانیوں کی طرح — ایک لمبی کہانی سمیٹے ہوئے
پیار کی جوت ہر لمحہ بڑھتی رہی — مہر و مہ کی جوانی سمیٹے ہوئے

اور پھر دفعتہً چھا گئیں ظلمتیں — نغموں کو سرد آہوں نے آواز دی
چیخ اٹھی زلفِ گیتی کی آشفتگی — زخم کھائی نگاہوں نے آواز دی
گونج اٹھیں چند موہوم سرگوشیاں — اک مسافر کو راہوں نے آواز دی

اور مسافر لبوں پر تبسم لئے
چل پڑا دل میں تازہ تلاطم لئے

حمید الماس

بانسری کی لے

نیم شب کا سناٹا
خاموشی کی سرگوشی
برگ و شاخ خوابیدہ
رہ گذر کی بے خوابی
چاندنی کے زانو پر
سسکیاں سی بھرتی ہے

•

دور بانسری کی لے
یوں سنائی دیتی ہے
جیسے قافِ ماضی میں
اپسرائیں مل جل کر
کھلکھلا کے ہنستی ہوں

•

بانسری کی گت میں ہیں
جانے کتنے افسانے
جانے کتنی تصویریں
جانے کتنے آنسو ہیں
جو پلک تک آ کر بھی
گر سکے نہ دامن پر

•

یہ اُداس تنہائی
یہ گھنی گھنی ظلمت
چاند تھک کے پژمردہ
مغربی کناروں پر
سر جھکائے روتا ہے

کس کو ہے خبر اس کی
کون بے تاب اٹھا ہوگا
اس کے دل کے زخموں کو
راگ چھیڑتا ہوگا
آہ! سوز موسیقی
بارہا تری چوکھٹ
آنسوؤں میں ڈوبی ہے
تیرا سینۂ سوزاں
آنسوؤں کا گنجینہ
نغمگی کا کاشانہ

تیرے دم سے زندہ ہے
اس نگاہ کا جادو
جاں کی کماں کے تیر
اس کے قامت و رخسار
اس کی آنکھ کے پیماں
روٹھنے کی معصومی
گفتگو کی شیرینی
مختصر یہ ہے تجھ سے
سرخوشی عبارت ہے
زندگی عبارت ہے

رضی اختر شوق

خلش

میری راتوں کو ہے اب کونسے سورج کی تلاش
کس مسیحا کی تمنا میں ہے اب دل کی دُکھن!
روز آکاش پہ ہوتا ہے چراغاں لیکن،
اپنے خوابیدہ مقدر میں نہیں کوئی کرن!
یہ چراغِ رہِ ہستی کی بھڑکتی ہوئی — لو
کس کو معلوم ہے جل جائیں گے کتنے دامن

دیپ تھرائیں تو ہوتا ہے سحر کا دھوکہ
کوئی آہٹ ہو گماں یہ کہ وہی آتے ہیں،
روز تھم تھم کے بھڑک اٹھتے ہیں شعلے دل کے
روز آنسو لب و عارض پہ ڈھلک جاتے ہیں
چرخ پہ شب کو ہوا کرتے ہیں تارے روشن
یاں سرِ شام ہی مژگاں پہ اتر آتے ہیں

کتنے خوش رنگ گلابوں کے جگر چاک ہوئے
رنگ محلوں میں مہکتے ہوئے ایوانوں میں!

اس تمنا میں کہ لیلائے بہار آتی ہے،
کتنے دیوانے ہیں جانے میں زندانوں میں
کتنی پریوں کے دل آویز بدن کا — سونا
گرم بانہوں میں پگھل جاتا ہے ایوانوں میں
جا بجا خوشبوئے دامانِ سحر کا چرچا
مشورے ہوتے ہیں دیوانوں میں فرزانوں میں

کیسے سفاک بگولوں میں — بدن سلگا کر
ہم نے ہر حوصلۂ دل کو بنایا کندن!
دل کی ہر تاب امنگوں کا لہو پگھلایا
اور کرتے رہے آرائشِ لیلائے وطن
کتنے شبخوں ابھی باقی ہیں سحر ہونے تک
بول اے جاگتے تاروں کے دلوں کی دھڑکن

زبیر رضوی

یہ ہے میرا ہندوستان!

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
جمنا گنگا جیون اس کا دھوم مچاتے دھارے
گنگا جمنا کی لہروں میں سات سروں کا سرگم
تاج الورہ جیسے سندر تصویروں سے البم

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
بادل جھومے برکھا برسے پون جھکولے کھائے
دھرتی کے پیتے آنگن میں یوں کھیتی لہرائے
جیسے بچہ ماں کی گود میں رہ رہ کے مسکائے

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
دن ایسے راتیں اس کی مستی کی سوداگر
دھرتی جیسے پھوٹ بہی ہو دودھ کی کچی گاگر
اونچے اونچے پربت اس کے نیلے نیلے ساگر

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
آدھا سیتا چندر گائے، گاتے اندو بال
نینوں میں کاجل کے ڈورے سرخ گلابی گال
زلفوں کی وہ چھایا جیسے شملہ نینی تال

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
ڈھولک جاگی مہندی رنگی رنگ رنگیلا ساون
سکھیاں مل مل ہولی کھیلیں سانوریا کے آنگن
گھونگھٹ میں گوری شرمائے پیا ملن کے کارن
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
راجہ رانی، گڈا گڈی اور پریوں کی کہانی
بچوں کے جھرمٹ میں سنائے بیٹھ کے بوڑھی نانی
دری گائے مانجھا چوسے مستا کی دیوانی
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
البیلا پنجاب ہے میرا رومانوں کی بستی
صبح بنارس، شام اودھ اور شالامار کی مستی
بمبئی جیسے شہر ہیں اس میں دلی جیسی بستی

یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
غالب اور ٹیگور یہیں کے یہیں تلسی داس
یہیں ہوا تھا سچائی کا گوتم کو احساس
یہیں سہا تھا ساتھ رام کے سیتا نے بن باس
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو
مندر مسجد ہیں تو کہیں ہیں گرجا اور شوالے
ملا، پنڈت گیتا اور قرآن کے ہیں متوالے
ہندو مسلم سکھ عیسائی دیس کے سب رکھوالے
یہ ہے میرا ہندوستان
میرے سپنوں کا جہان
اس سے پیار مجھ کو

علی سردار جعفری

قصیدہ

ایشیا جلوۂ خورشیدِ درخشاں کا وطن
ایشیا حسنِ گل و لالہ و نسریں کا چمن

چین و ایران کے باغوں سے گلستاں بر دوش
جلوۂ وادیٔ کشمیر سے گل پیراہن

ایشیا حافظ و خیام کی مے سے سرشار
ایشیا سعدی و تلسی کے ترانوں میں مگن

ایشیا اپنی تہی قسمت میں ہے [illegible]
ایشیا ستم و سہہ اب تک دل کی دھڑکن

اس کے سینے میں ہیں دولت کے خزانے پنہاں
ایشیا مشکِ ختن دُرِّ عدن لعلِ یمن

یہی آغوش ہے گہوارۂ تہذیبِ جہاں
اسی گہوارے میں پروان چڑھے شعر و سخن

انھیں ہاتھوں سے بہی حسنِ عمل کی گنگا
اسی پیشانی سے پھوٹی ہے تمدن کی کرن

منہ میں رکھی ہوئی انجیل و اوستا کی زباں
لب اعجاز میں قرآن کا اندازِ سخن

ہم نے کس طرح سحر کی ہے شبِ تارِ حیات
وید کی سحر بیانی سے ہوا ہے روشن

ہم نے صدیوں کبھی جنگل میں منایا منگل
شہر کے شہر بسائے ہیں کبھی کاٹ کے بن

جب پہاڑوں کو بھی دعوائے خداوندی تھا
اپنے قبضے میں ہیں اس وقت سے سنگ و آہن

دستِ اعجاز سے قدرت کا مقدر بدلا
تیشے ہنر سے تو مٹی سے بنائے برتن

کوہساروں میں کبھی ہم نے تراشے ہیں مکاں
کبھی دریاؤں کے پہلو میں بنایا مسکن

یاد ہے اپنی غلامی کا زمانہ اب تک
مائلِ جور تھے یورپ کے پرانے راون

چیت پھاگن کی ہواؤں سے بھرے تھے سینے
بھیگی بھیگی ہوئی آنکھوں میں بسا تھا ساون

پھولی رہتی تھی رخِ زرد پہ غم کی سرسوں
دلِ مجروح میں مہکے ہوئے زخموں کے چمن

نہ تو بلبل کے ترانے تھے نہ کوئل کی صدا
باغ ویران تھا آباد تھے زاغ اور زغن

ایک اک موڑ پہ تھا محبس و زنداں کا عروج
ایک اک گام پہ اُگ آتے تھے سو دار و رسن

لوٹ لیتے تھے حفاظت کا بہانہ کر کے
دوست کے روپ میں پھرتے تھے ہمارے دشمن

کھیتیاں لرزہ براندام تھیں سہمے ہوئے گاؤں
ظلم ہر شہر میں، ہر ایک نگر میں تھا زمن

موت کے منہ میں چلے جاتے تھے ابکی سپوت
ایشیا جنگ کی بھٹی کے لئے تھا ایندھن

قصرِ خسرو پہ ہوا تیشۂ فرہاد بلند
ہو گیا بند جو سر پھوڑ کے مرنے کا چلن

عشق کیوں دشت و بیاباں میں پھرے آوارہ
دوشِ مجنوں پہ ہے اب گیسوئے لیلیٰ کی شکن

ہجر نے وصل کے سامان کئے ہیں پیدا
لبِ وامق سے مہک اٹھا ہے عذرا کا دہن

حسنِ یوسف سے ہے پھر حسنِ زلیخا پہ شباب
آج پھوٹی ہے ابوالہول کے ماتھے سے شکن

مصر کی خاک سے موسیٰ کی بغاوت اٹھی
نیل کی موج ہے فرعون کے لشکر کا کفن

دستِ راون سے ملی دامنِ سیتا کو نجات
پھر سے آباد ہوا رام کے گھر کا آنگن

خون آنکھوں ہی سے ٹپکے گا نہ دل سے آنسو
بن کے اس عہد میں ہیر آئے گی رانجھا کی دلہن

آج مشاطگیِ عصر ہے اس کی خاطر
ہاتھ جوڑے ہوئے حاضر ہیں روایاتِ کہن

کل تو شاہی کے تصور کو عطا کی تھی حیات
آج شاہی کے تصور کو پنہایا ہے کفن

ہاں یہی خاک ہے چنگیز و ہلاکو کا مزار
جنگ بازوں کے عزائم کا پرانا مدفن

نغمۂ وحدتِ اقوام کی ہر سمت ہے دھوم
ہند اور چین سے تا وادیٔ تاتار و ختن

امن کے پھول ہیں آزادی کی دیوی کا سہاگ
عکسِ محبوب سے روشن ہیں دیوں کے درپن

(نا تمام)

شاد تمکنت

دوسری محبت

یہ اکثر تم سے مل کر سوچتا ہوں کیا ہوا مجھ کو
نہ داغِ عشق باقی ہے نہ اب ذوقِ جنوں مجھ کو
وہی میں ہوں وہی گھر ہے وہی سنسان آنگن ہے
وہی بکھرے ہوئے پھولوں کا آسودہ نشیمن ہے
وہی بیلوں کی بیلوں کے تلے ٹھنڈک سی بہتی ہے
درختوں پر وہی معصوم فاختہ کوکتی ہے
وہی کمرے کی دیواروں پہ اب بے رونقی ہے
کتابوں اور تصویروں کا سامان جراحت ہے
دھری جاتی ہیں طاقوں پر ابھی تک ادھ جلی شمعیں
مگر میں اب کبھی سنتا ہوں پگھلتی موم کی چیخیں
ابھی پچھلے پہر آتی ہیں آوازیں سرابوں کی
ہتھیلی سے کوئی ملتا ہے آنکھیں میرے خوابوں کی

تم آئے سر بہ زانو ہو چکی ہے میری تنہائی
مرے زخموں پہ تمہارا التفاتِ چارہ فرمائی
نگاہوں میں تمہاری گوکل و متھرا کی باتیں ہیں
گھنی مہکی ہوئی زلفوں میں بندرابن کی راتیں ہیں
دہکتے عارضوں پر دوپٹے کا عکس لرزاں ہے
تشنگی بازوؤں میں جیسے آتش زار یوناں ہے
سراپا سے نکلتی ہیں سجل بانکی شعاعیں سی
کہ جیسے ہشت پہلو پارۂ نیلم کی ضو تلملالی
ہر اک خطِ بدن میں بجلیاں سی ڈوب جاتی ہیں
خمِ محرابِ لب میں پیاسی آنچیں سنسناتی ہیں
وہی لہجے کا دکھنا جیسے خوں تھم تھم کے رستا ہو
وہی آنکھیں کہ جن پر التجا کا صاف دھوکہ ہو

کفِ دستِ بلوریں پر حنا کی رنگ سامانی
جواہر کی دکاں میں جس طرح ہیروں کی نمانی
مبارک ہو گھنی زلفوں کو گھنگھور گھٹا سماں ہوتا
زمانے کی کڑی دھوپوں میں مثلِ سائباں ہوتا

مگر میں سوچ میں گم ہوں یہ ایں الطاف برنائی
مرے احساس پر اداسی گھٹا سی کیوں نہیں چھائی
نگاہوں کو رہا ہے مدتوں ذوقِ چمن بینی
رچی تھی دل میں ہلکے رنگ کی کلیوں کی شیرینی
سہانی چاندنی پگڈنڈیوں پر اب بھی کھلتی ہے
عذارِ کنج پر سنبل کی لٹ مستانہ ہلتی ہے
نہیں ہوتا مگر اب آگ پینے کا گماں خود پر
وہ عالم ہے کہ ڈرتا ہوں نہ ہو جائے عیاں خود پر

کہاں وہ دن مزاجِ غم کو زہرِ درد راس آئے
سرِ دامن لرز کر آنسوؤں کی التماس آئے
وہ بیگانہ وشی وہ بے نیازی بزمِ دنیا سے
کہ جیسے تھی مجھے اک نسبتِ دیرینہ صحرا سے
سحر کے ساتھ اب دل میں کھٹک سی کیوں نہیں ہوتی
سرِ بالش نہ تر ہوتا اگر نم آستیں ہوتی
نہیں پہلی کرن کی سینۂ پرخوں پہ وہ چھوٹیں
کہ جیسے نوکِ سوزن ٹوٹ کر رہ جائے ناخن میں
غضب ہے خاکِ در پر گریہ ہوا کیسر کا دھوکہ
پسِ عجز دعا تو پر نہیں تاثیر کا دھوکہ
زمانہ ہو گیا ہے خال و خط کو اپنی یاد آئے
نہیں ممکن کہ اب آئینہ میرا عکس لوٹائے
سراپا جرم ہوں آسودۂ لطف و کرم ہو کر
میں شاید رہ گیا پہلی محبت کی قسم ہو کر

شمیم کرہانی

سہارا

ماہ تیرہ ہی نہیں دامنِ تقدیرِ حیات
[illegible] کلیاں بھی کھلا کرتی ہیں
ان [illegible] دھوپ کی ماری ہوئی کمسن روحیں
[illegible] ملا کرتی ہیں

[illegible] خندہ [illegible]
[illegible] وحشت میں کبھی روشنی جاتی ہے
[illegible]
[illegible] غوش کبھی آتا ہے

پھر اٹھاتا ہوں جو تیشہ تو زمیں کے دل سے
[illegible] دھڑکنے کی صدا آتی ہے
دست و بازو میں مسلسل جو تھکن جاتے ہیں
تو کہیں سے [illegible] کی ہوا آتی ہے

[illegible] نظر آتے ہیں
[illegible] ہوتا ہے کہ ہے ساتھ کوئی
جستجو [illegible] جو اٹھاتی ہے قدم
[illegible] رکھ دیتا ہے شانے پہ کہ ہاتھ کوئی

خشک ہو جاتی ہے بھیگی ہوئی محنت کی جبیں
کشمکش کو کبھی دل میں جواں ہوتی ہے
دشتِ بیرنگ کو ملتا ہے گلابی پیغام
دودھ کی نہر پہاڑوں سے رواں ہوتی ہے

خواب کے موڑ پہ ملتی ہے سحر کی منزل
جگمگا اٹھتی ہیں سوئی ہوئی آنکھیں دل کی
تیرہ دوراں کے دھندلکے میں جو ملتی ہے نگاہ
مسکرا دیتی ہیں روٹھی ہوئی آنکھیں دل کی

شہد کے جام بھی ہیں، تیر کے پیالے بھی
زہر ہی زہر نہیں دہر میں پینے کے لئے
کر ہی دیتی ہے اشارہ نگہِ ساقیِ زیست
مل ہی جاتا ہے سہارا کوئی جینے کے لئے

ضیا ابن فیضی

محرابِ غزل

صبح سامانیٔ رخسارِ نگاراں ہے غزل — کون کہتا ہے کہ اک جنتِ ویراں ہے غزل
ہو کسی یار سمن بر کا سراپا جیسے — سیم پیشانی و لعلِ لبِ خنداں ہے غزل
تیری آواز کا رس، تیری اداؤں کا نشہ — تیرے لہجے کی نسیم طرب افشاں ہے غزل
تیرے روئے سحر آلود کی ہر صبح لطیف — تیرے گیسوئے شب افروز کا عنواں ہے غزل
تیرے "جور کرم آمیز" کا پندارِ جمیل — تیرے "لطفِ ستم انگیز" کا ساماں ہے غزل
مسکراتی ہوئی لفظوں میں ترے پیار کی جوت — پرتوِ شمعِ محبت کا چراغاں ہے غزل
کبھی سیرابِ محبت، کبھی واماندۂ شوق — ہے کبھی درد، کبھی درد کا درماں ہے غزل
کبھی دوری کی کشاکش کبھی قربت کا پیام — آشنائے روشِ حسنِ گریزاں ہے غزل
کبھی ہونٹوں پہ محبت کے ہے نغمہ بن کر — اور کبھی سازِ زمانہ پہ رجز خواں ہے غزل
کبھی اک محشرِ وارفتگیِ اہلِ نشاط — اور کبھی انجمنِ سینہ فگاراں ہے غزل
کبھی لپٹی ہوئی تھو میں دلِ صوفی کی خراش — کبھی رامش گریٔ بادہ گساراں ہے غزل
عصرِ حاضر کے تقاضوں میں ہے پیچیدہ کبھی — کبھی نادمِ قدامت میں پریشاں ہے غزل
کبھی اسرار و حکم اور کبھی سرمستیٔ عشق — کتنی مشکل ہے غزل، کس قدر آساں ہے غزل
اُف رے یہ فکر کا ٹھیراؤ یہ جذبات کی رو — کبھی ساحل ہے غزل اور کبھی طوفاں ہے غزل
اس کے جلوؤں میں شرابور ہے شاعر کی نگاہ — جلوۂ رنگِ رخِ شعر کا عرفاں ہے غزل
بزمِ غالب میں ہے سرمایۂ علم و حکمت — لبِ مومن پہ "خموشی اثر افغاں" ہے غزل

موجِ پیمانۂ حافظ، تپشِ سینۂ میر
مستیٔ بادۂ خیّام کا عنواں ہے غزل

کس کو اس وحشتِ رنگیں میں ہے سودائے رفو
کاوشِ سوزنِ تخئیل سے حیراں ہے غزل

گیسوئے فکر میں یہ خم ہے اسی سے پیدا
شکنِ ابروئے تخئیل گل افشاں ہے غزل

دیکھئے جلوہ گہِ فکر میں شوخیٔ ادا
شاہدِ فتنہ گر و عربدہ ساماں ہے غزل

یہ تراشی ہوئی ترکیبوں کا نکھرا ہوا حسن
سروِ آراستۂ صحنِ گلستاں ہے غزل

استعارے کی سبک شوخی کہیں تشبیہہ کا رنگ
کاروانِ سمن و سنبل و ریحاں ہے غزل

ندرتِ فکرِ سخن، طرفگیٔ طرزِ ادا
چستیٔ بندشِ ترکیب کی میزاں ہے غزل

زلفِ الفاظ کے اف رے یہ سنوارے ہوئے خم
اپنے نکھرے ہوئے اندازِ پہ نازاں ہے غزل

اللہ اللہ رے یہ سادگیٔ حرفِ بیاں
شوخیٔ فکر سے صد خلد بداماں ہے غزل

وہ روانی ہو کہ جیسے کوئی چلتی ہوئی موج
ہو بہو صورتِ فردوس خراماں ہے غزل

فکر و تخئیل و نظر، جذبۂ و احساس و شعور
فن کے اقدارِ حسیں کا صنمستاں ہے غزل

حکمت و فلسفہ و عقل و جنوں کی چلمن
سوز و مستی و تصوف کا شبستاں ہے غزل

... زجلوۂ سیمائے بہار
شاعری ہے چہ کنعاں، مہ کنعاں ہے غزل

معترف اس کی نزاکت کی ہے ہر صنفِ سخن
اپنی رعنائی کا فر سے پشیماں ہے غزل

فکرِ شاعر کو عطا کرتی ہے جذبے کا خلوص
جذبۂ و فکر کے اخلاص کا عرفاں ہے غزل

مجملِ حسنِ نظر، بتکدۂ سوزِ ادب
لذتِ عیشِ تخیل کا شبستاں ہے غزل

فیض سے اس کے ہے شہ ریز رگِ ابرِ قلم
فکر کی مستیٔ بیدار کا عنواں ہے غزل

اک چھلکتا سا نشہ، ایک چھلکتا سا خمار
رس میں ڈوبے ہوئے شعروں کا خمستاں ہے غزل

دامنِ ساغر و مینا سے نچوڑی ہوئی آگ
رشحۂ اندوزِ نمِ ابرِ بہاراں ہے غزل

جو دھڑکتا ہے ان اشعار کے سینے میں وہ دل — جو ٹپکتا ہے قلم سے وہ گلستاں ہے غزل
ذہن اک پھول ہے، ہیں پھول پہ شبنم کی طرح — گرمیٔ پرتوِ افکار سے لرزاں ہے غزل
ایک اک حرف ہے اوڑھے ہوئے خوشبو کی ردا — نکہتِ گیسوئے افکار پریشاں ہے غزل
لبِ اظہار تلک آتی ہے بڑی مشکل سے — قلبِ عشاق کی وہ حسرتِ پنہاں ہے غزل
تپشِ دل میں ہیں آلودہ حکایاتِ جنوں — شعلۂ آتشِ الفت کا نیستاں ہے غزل
قلبِ حوّا کی کسک، پہلوئے آدم کا فشار — ماجرائے خلشِ سینۂ یزداں ہے غزل
روح کونین بلا واسطہ کرتی ہے خطاب — ملہمِ خلوتِ آگاہی و عرفاں ہے غزل
ساغرِ دیر و حرم کی نہیں پابند یہ مے — بہرۂ گبر نہ میراثِ مسلماں ہے غزل
شفقِ شام کا منکر نہیں یہ نورِ سحر — کفر کی گود کا پالا ہوا ایماں ہے غزل
عقلِ زرخیز و نم آلود ہے جس سے وہ جنوں — جس سے دامن ہے عبارت وہ گریباں ہے غزل
سوزشِ تازہ کا گہوارہ ہے مسکن اس کا — پرتوِ جلوۂ صد مہرِ درخشاں ہے غزل
جو نہ ٹپکے کبھی آنکھوں سے وہ خونابۂ دل — جو نہ نکلے دلِ شاعر سے وہ ارماں ہے غزل
شاعری جس سے سبکدوش نہ ہوگی ہمہ عمر — سر پہ الفاظ و معانی کے وہ احساں ہے غزل

فاش اب تک نہ ہوا مجھ پہ مگر اس کا مقام
غمِ جاناں ہے غزل یا غمِ دوراں ہے غزل

○

کمال احمد صدیقی

مت کرو تم کمال کی باتیں

مت کرو تم کمال کی باتیں
وہ تو رجعت پرست شاعر ہے

آبشاروں کی بات کرتا ہے
لالہ زاروں کی بات کرتا ہے
جن کے دیکھے سے نیند آتی ہے
ان نظاروں کی بات کرتا ہے
گل و نرگس پہ جان دیتا ہے
اور بہاروں کی بات کرتا ہے
حسن کا احترام کرتا ہے
گلعذاروں کی بات کرتا ہے
مدح مینا و جام کرتا ہے
مے گساروں کی بات کرتا ہے
اس مشینی سماج میں بھی وہ
حسن کاروں کی بات کرتا ہے
وہ تو شیدائی ہے کنایوں کا
اور اشاروں کی بات کرتا ہے

مت کرو تم کمال کی باتیں
وہ جہالت کی بات کرتا ہے
آج اس بیسویں صدی میں بھی
وہ محبت کی بات کرتا ہے
اصطلاحیں ادب سے لاتا ہے
جب سیاست کی بات کرتا ہے
رنگ بھرتا ہے وہ فسانوں کا
جب حقیقت کی بات کرتا ہے

مت کرو تم کمال کی باتیں
وہ تو رجعت پرست شاعر ہے

غمِ دوراں کے ساتھ ساتھ اکثر — غمِ جاناں کی بات کرتا ہے
ہے پرستارِ مہ جبینوں کا — بزمِ خوباں کی بات کرتا ہے

(۲)

مت کرو تم کمال کی باتیں
وہ تو دہشت پرست شاعر ہے

محفلوں میں، شراب خانوں میں — کارخانوں کی بات کرتا ہے
جن میں ہم پلہ ہوں شریف و رذیل" — ان زمانوں کی بات کرتا ہے
اس کو مزدور سے محبت ہے — وہ کسانوں کی بات کرتا ہے
چھیڑ کر ذکر لالہ و گل کا — باغبانوں کی بات کرتا ہے

مے و مینا کے استعاروں میں — وہ سیاست کی بات کرتا ہے
وہ نہیں اس نظام کا قائل — اس سے نفرت کی بات کرتا ہے
بات کرتا تو ہے سلیقے سے — پر بغاوت کی بات کرتا ہے
مت کرو تم کمال کی باتیں

کیفی اعظمی

پہرہ

تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے بھیس بنانے والے
پاؤں آگے نہ بڑھانا فتنے جگانے والے حشر اٹھانے والے

اشک کا سیل رواں درد کی دیوار ہیں ہم
زخم کا زخم میں تلوار کی تلوار ہیں ہم
جنتِ پاک سے کچھ ایسی ہوا آئی ہے
آج کی رات سرِ شام سے بیدار ہیں ہم
ہاں سرحد سے اٹھا جال بچھانے والے خواب دکھانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے بھیس بنانے والے

جب ہی آنکھ ملی موت کا نذرانہ لئے
جب ملے ہونٹ ملے زہر کا پیمانہ لئے
کوریا سے تری تصویر منگا رکھی ہے
جنگ اس ہاتھ میں اس ہاتھ میں ویرانہ لئے
تجھ سا دیکھا نہ سنا خون بہانے والے آگ لگانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے بھیس بنانے والے

زندگی تیرے تصور سے بھی گھبراتی ہے
اتنا نزدیک نہ آ سانس گھٹی جاتی ہے
تو نے سونے کے کٹورے میں یہ کیا شئے پی لی
گرم سانسوں سے سڑے خون کی بو آتی ہے
منہ ادھر پھیر ذرا پیار جتانے والے بات بنانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے بھیس بنانے والے

تیرا احسان جو لیں اپنی بہاریں بھولیں
کھیت میں قحط اُگیں باغ میں بنکٹ پھولیں
پیاس بن جائے مقدر جو پئیں تیری شراب
آبلے ہاتھ میں پڑجائیں جو ساغر چھولیں
یہ رہا جام ترا آگ پلانے والے، ہوش اُڑانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے، بھیس بدلنے والے

قسمتیں بن کے ترے دم سے بگڑ جاتی ہیں
بستیاں دل کی طرح بس کے اُجڑ جاتی ہیں
تیل پی لیتی ہے آنسو کی طرح ڈر کے زمیں
منڈیاں تیری جھلک پا کے اُجڑ جاتی ہیں
سکہ کھوٹا ہے ترا داؤں لگانے والے، بھاگ خزانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے، بھیس بنانے والے

نرم شاخوں نے لچکنے کی سزا پائی ہے
ایک اک پھول کو ترسا کے بہار آئی ہے
تارے اُترے ہیں زمیں پر کہ کھلا ہے بیلا
ڈھاک پھولا ہے کہ شعلوں کی گھٹا چھائی ہے
ہے بہت گرم فضا شاخ جھکانے والے، پھول چرانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے، بھیس بنانے والے

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں
پاؤں کانٹوں پہ شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں
کتنے خوابوں سے نچوڑا ہے اُجالا ہم نے
رات کی قید نہ بنیادِ سحر رکھتے ہیں
او اندھیرے کے خدا شمع بجھانے والے، لوٹ مچانے والے
تجھ کو پہچان لیا دور سے آنے والے، بھیس بنانے والے

مخدوم محی الدین

چارہ گر

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خُدا
پیار اُن کی چتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی چمن کی سبک رو ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ، گرم رخسار پر

ایک پل کے لیے رُک گئی
ہم نے دیکھا انہیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انہیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر، تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبّت بھی ہے؟
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
چارہ گر!

مسعود اختر جمال

شمع کی لَو تیز کرو!

بزم افسردہ ہے کچھ شمع کی لَو تیز کرو

چھیڑتا ہوں نئے انداز سے میں دل کا رباب — آج چھا جائے گا دنیا پہ مرا عہدِ شباب
کہو پروانوں سے۔ پھر رقص کریں رقص کریں — پھر کہاں یہ مہ و انجم۔ یہ فضا یہ تب و تاب
اہلِ محفل سے کہو اب ہمہ تن گوش رہیں — نغمۂ ساز نہیں آج رہینِ مضراب
کہہ دو اربابِ نظر سے کہ نظر اب نہ اُٹھے — شعلۂ درد ہے ہر تارِ نفس پر بیتاب

آج یہ پچھلا پہر۔ مژدۂ بیداری ہے — دوستو آج نہیں وقت گرانباریٔ خواب
ایشیا جاگ اُٹھا ایک نئے عزم کے ساتھ — روئے گیتی سے اب اُٹھنے کو ہے صدیوں کا حجاب
سرزمیں ہند کی اب خلد بداماں ہوگی — آنسوؤں سے مرے ہوگا یہ گلستاں شاداب
آج میں ایک نئی صبح پہ سناؤں گا غزل — آج میں اک نئے انداز سے چھیڑوں گا رباب

اے مرے ہم نفسو۔ ہم نظرو۔ ہم خبرو
جامِ پُر شوق اُٹھاؤ۔ مئے گلرنگ بھرو
بزم افسردہ ہے۔ کچھ شمع کی لَو تیز کرو

○

ن۔م۔ راشد

حسن کوزہ گر

جہاں زاد نیچے گلی میں، ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر، حسن کوزہ گر ہوں!

تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دُکان پر میں نے دیکھا،
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی
تھی، میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!

جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!
یہ وہ دور تھا جس میں میں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا ——
وہ کوزے مرے دستِ چابک کے پتلے،
گِل و رنگ و روغن کی مخلوقِ بے جاں،
وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے:
"حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟
وہ ہم سے، خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے روئے گرداں؟"

جہاں زاد، نو سال کا دَور یوں مجھ پہ گذرا
کہ جیسے کسی شہرِ مدفون پر وقت گذرے!
تغاروں میں مٹی،
کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں،
سنگ بستہ پڑی تھی،
صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں،
مری ہیچ مایہ معیشت کے، اظہارِ فن کے سہارے
شکستہ پڑے تھے!
میں خود، میں حسن کوزہ گر پا بہ گِل خاک بر سر برہنہ
سرِ چاک، ژولیدہ مو، سر بزانو،
کسی غمزدہ دیوتا کی طرح واہمہ کے
گِل و لا سے خوابوں کے سیّال کوزے بناتا رہا تھا!

جہاں زاد، نو سال پہلے تو ناداں تھی لیکن
تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے، حسن کوزہ گر نے
تری قاف کی سی اُفق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے مرے جسم و جاں ابر و مہتاب کا
رہگذر بن گئے تھے

جہاں زاد، بغداد کی خواب گوں رات،

وہ رودِ دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملّاح کی بند آنکھیں!
کسی خستہ جاں، رنج بر، کوزہ گر کے لئے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی،
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود —
اس کی جان، اُس کا پیکر —
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے!

جہاں زاد، اُس دور میں روز، ہر روز
وہ سوختہ بخت آکر
مجھے دیکھتی چاک پر پا بہ گِل سر بزانو
تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی —
[وہی چاک جو سالہا سال جینے کا تنہا سہارا رہا تھا]
وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی:
"حسن کوزہ گر ہوش میں آ
حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر
یہ بچوں کے تنّور کیونکر بھریں گے؟
حسن اے محبت کے مارے،
محبت امیروں کی بازی
حسن اپنے دیوار و در پر نظر کر

مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے
کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے!
وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے، ہاں،
مگر میں، حسن کوزہ گر، شہر اوہام کے اُن
خرابوں کا مجذوب تھا جن
میں کوئی صدا، کوئی جنبش
کسی مُرغ پرّاں کا سایہ
کسی زندگی کا نشاں تک نہیں تھا!

جہاں زاد، میں آج تیری گلی میں،
یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں،
ترے در کے آگے کھڑا ہوں
سر و مو پریشاں۔
دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں
مجھے آج پھر جھانکتی ہیں!
زمانہ، جہاں زاد، وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو
اور فانوس و گلداں
کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں۔
میں انساں ہوں لیکن
یہ نو سال جو غم کے قالب میں گذرے!
حسن کوزہ گر آج اِک تودۂ خاک ہے جس
میں نم کا اثر تک نہیں ہے!

جہاں زاد، بازار میں صبح عطّار یوسف
کی دُکان پر تیری آنکھیں پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں،
اِن آنکھوں کی تابندہ شوخی
سے اُٹھی ہے پھر تودۂ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش،
یہی شاید اِس خاک کو گِل بنا دے!

تمنّا کی وسعت کی کس کو خبر ہے، جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے
تھے ہر کاخ و کُو اور ہر شہر و قریہ کی نازش،
تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں!

تمنّا کی وسعت کی کس کو خبر ہے، جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں اُن اپنے مہجور کوزوں کی جانب،
گِل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب،
معیشت کے، اظہارِ فن کے، سہاروں کی جانب،
کہ مَیں اُس گِل و لا سے، اُس رنگ و روغن
سے، پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن!

○

یہ غلط ہے کہ کوئی ایک دوا ہر مرض کے لئے مفید ہو سکتی ہے

لیکن یہ صحیح ہے کہ

روغن برق

بہت سے امراض کے لئے اکسیر ہے

روغن برق

جسٹرڈ نہر ک

کی ایک شیشی گھر میں رہے تو آپ ان جسمانی امراض کا علاج خود کرلیں گے اور کسی ڈاکٹر کے محتاج نہ ہوں گے۔

دردِ سر، دردِ کمر، دردِ گردہ، چوٹ، موچ، ورم، زخم، خنتنہ، فالج، لقوہ، مٹھوا، رعشہ، تشنج، گٹھیا، عرق النسا، سینہ اور پسلی کا درد، ورم جگر، ورم طحال، ورم مسوڑہ، ورم خصیہ، باسیر، طاعونی گلٹی، کان کا درد، دانت کا درد، آنکھ کا درد، سرخیٔ چشم، نزلہ و زکام، لرزہ و بخار، بچوں کی کمزوری و لاغری، پسلی کا چلنا، معمولی پھوڑا یا پھنسی اور بچھو و بھڑ کے ڈنک کے لئے روغن برق اکسیر ہے۔ اسکی روزمرہ کی مالش اعصاب کو قوت بخشتی ہے۔ بچوں بوڑھوں پہلوانوں اور کھلاڑیوں کے لئے بیحد مفید اور بے مثال ہے۔

قیمت فی شیشی ۱ تولہ ۶ آنہ، ۲½ تولہ ۱۲ آنہ، ۵ تولہ عہ، ۱۰ تولہ عکر

نیو مون کیمیکل ورکس الہ آباد ۳

مضامین

رشید احمد صدیقی

حسرت موہانی

ان کی گول چھدری داڑھی، ان کی باریک آواز، ان کے چھوٹے بال، ان کی عینک، بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی، گھسی پٹی چپل، موزوں سے کوئی سروکار نہیں، موٹے کھدر کی لنگی، پیوند لگی ہوئی ناواک سی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب، ہاتھ میں پرانے ٹاٹ کا ایک جھولا، دری، تکیہ اور سوتی چادر، مختصر بستر، ٹیڑھا میڑھا چھوٹا سا ایک ٹرنک، دو ایک لوٹے۔ یہ تھے حسرت۔

لیکن کس قیامت کا یہ آدمی تھا۔ کٹر خیال ... تھے۔ جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا اس کو بغیر کسی تامل کے، بغیر تکلف کے ... بغیر مصلحت یا موقع کا لحاظ کیے سب سے ... صاف ... بغیر لاگ لپیٹ ... سب کے سامنے کہہ ڈالنا ... ہوتی تھی۔ ... اور محبت کا گیت گانے والا ... سے آنے والا ... ہر شخص پر شفقت کرنے والا، زبان کا بادشاہ، شاعروں کا والی ... کا نام، ادب کا ... کیسی ... بات ... سیاست کو ... کا کاروبار ہے۔ جس میں ... کا ... ہوتا ہے ...

حسرت شخصی اعتبار سے نہایت انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کے ہاں تصادم کی کبھی کمی نہیں ... لیکن ان کی شاعری میں جو توازن ... سادگی ... ہے وہ کم شعراء کے نصیب میں آیا ہے۔ ... میں کثر ... شاعری ... حسرت کس درجہ شیریں نوا اور شریف النفس ... زندگی میں کیسے درویش صفت اور ... تھے۔

حسرت علی گڑھ کالج سے ... انگریز دشمنی میں نکالے گئے۔ علی گڑھ میں سودیشی کپڑے کی دکان کھولی۔ غالب پر حاشیہ لکھا۔ اردوئے معلیٰ کی ایڈیٹری کرتے رہے۔ ان مشغلوں سے جو کچھ روکھا پھیکا میسر آجاتا اسی پر اکتفا کرتے رہے اور دنیا کی تمام عیش و آرام کو ٹھکرا کر ... فریب اور فرعونیت پر گرجتے ... عشق کا راگ الاپتے رہے۔ کسی

صاحب دولت کا زہرہ نہ تھا کہ محبت اور مسکنت کے اس بوریہ نشین اور عزیمت اور صداقت کے اس نقیب و ناخدا سے آنکھ ملا سکے۔ دیسی گلدستہ مینائے کاغذ پر اُردو کے مشاہیر کم نصیب گوشہ گیر اور تقریباً بھلائے ہوئے شعراء کے کلام کا انتخاب شائع اور ان کی خدمات کو اجاگر کرتے رہے۔

وہ زمانہ علی گڈھ کالج کے بڑے دبدبے اور طنطنے کا دور تھا۔ کیسے کیسے طلباء یہاں تھے جو بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بحیثیت طالب علم حسرت یہاں جس ہیئت کذائی سے تشریف لائے اور جس طرح اُن کا مذاق اُڑایا گیا وہ آج تک زبان زد ہے۔ بازو پر امام ضامن بندھا ہوا، مشروع کا پاجامہ ایک بڑا پاندان ساتھ، لڑکوں میں خالہ اماں کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لیکن یہی حسرت اپنی ذہانت، جرأت اور صداقت میں ایسے کھرے ثابت ہوئے کہ ساتھیوں کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ علی گڈھ کالج میں بحیثیت طالب علم، بدیسی حکومت سے سب سے پہلے خالہ اماں ہی نے ٹکر لی کالج میں ہلچل مچ گئی اور حسرت نکالے گئے۔ اس زمانے میں بغاوت اور آزادی کے کھرے علمبردار جنوب میں بال گنگا دھر تلک، مشرق میں اروند گھوش اور شمال میں لالا لاجپت رائے تھے، یو۔پی۔ میں حسرت نے اس مشعل کو علی گڈھ سے روشن کیا۔

کسی کا اس زمانے میں حسرت سے تعلق رکھنا انگریزی حکومت کے قہر و غضب کا موجب ہوتا تھا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علی گڈھ کالج کے اچھے سے اچھے طالب علم حسرت کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے ضرور حاضر ہوتے، اور اس پر فخر کرتے کہ حسرت نے اُن کو اپنے بوریئے پر بٹھایا۔ شفقت اور محبت کی باتیں کیں، اپنا کلام سنایا، اساتذہ سخن کے کلام اور شعر و ادب کی باریکیوں اور نزاکتوں سے آشنا کیا۔

گزشتہ ۵۰۔۶۰ سال میں جو لوگ علی گڈھ سے فارغ التحصیل ہو کر پبلک لائف میں داخل ہوئے اور نام پیدا کیا ان میں کوئی ایسا نہیں جس کو میں نے بہت قریب سے نہ دیکھا ہو اور ان کو اچھی طرح جانتا پہچانتا نہ ہوں۔ علی گڈھ میں رہتے بستے ایک عمر ہوئی۔ یہاں کی زندگی کا کون سا پہلو ایسا ہے جو نظر سے نہ گزرا ہو اور کون سی نعمتیں ہیں جو یہاں میسر نہیں آئیں۔ یہاں کے اکثر طالب علم سیاسی عقائد کی بنا پر نکالے بھی گئے۔ ایسوں کا یہاں سے بیزار ہونا فطری تھا۔ لیکن

اس وقت دو ہستیاں ایسی یاد آتی ہیں جو یہاں سے عقیدے کی بنا پر نکالی گئیں۔ اس کی انھوں نے تمام عمر پیروی کی ہزار عقوبتیں جھیلیں لیکن اپنے راستے سے نہ ہٹے۔ ان میں سے ایک حسرت ہیں۔ خالہ جان کے عہد سے لے کر خاتمہ بالخیر ہونے تک بے غرضی، حفاظلبی، حق گوئی، خدا ترسی اور آزادی کے راستہ کو لمحہ بھر کے لئے نہیں چھوڑا۔ کیسے کیسے آلام اور آزمائش سے گذرے، دو چار سال نہیں نصف صدی سے اوپر لیکن دامن کہیں سے ملوث نہیں ہوا نہ اپنی نظر کو نیچی ہونے دیا، نہ اپنے عقیدت مندوں کی نظر کو۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اپنے قید و بند کی زندگی کا حال انھوں نے اپنے رسالہ اردوئے معلی میں بار قسط وار لکھا ہے جس میں اس عہد کے حالات و حوادث اور جیل خانے کی زندگی سے متعلق بڑے پتے کی باتیں لکھی ہیں۔ پڑھنے کی چیز ہے۔

کئی سال ہوئے حسرت نے علی گڑھ میں شعر و شاعری سے متعلق اپنا نقطہ نظر ایک مقالے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ یونین میں شائقین کا بڑا اچھا اور ستھرا مجمع تھا۔ حسرت نے بڑی تفصیل اور بڑی قابلیت سے شاعری کی اقسام بتائی تھیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو حسرت سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن حسرت نے ہر طرح کی شاعری پر جس شاعرانہ نقطہ نظر اور عالمانہ انداز فکر سے جو باتیں بیان کی تھیں اور ان کے جواز پر زور دیا تھا ان سے بعض ثقافت کی معتقدات کو جھٹکے لگے ان کو اس پر تعجب ہوا کہ حسرت جو زندگی میں اتنے خشک اور سپاٹ، مذہبی معتقدات میں اتنے کٹر اور سیاسی نقطۂ نظر میں اتنے بے لچک تھے، وہ غیر ثقہ شاعری کی حمایت کیسے کر رہے تھے یہ بات تعجب کی ضرور تھی کہ جو شخص کہیں کسی اور سے مفاہمت نہ کرتا، وہ شاعری میں اتنی ڈھیل دیتا ہو۔ شاعری میں حسرت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ شاعری کا معیار شاعری ہی ہے کچھ اور نہیں۔ ابھی ایک عزیز نے ایک دور دراز مقام سے استصواب رائے کیا تھا کہ حسرت یا مصحفی کا کلام یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس لئے کہ بعضوں کے نزدیک دونوں کے ہاں فحاشی اور برہنگی ملتی ہے۔ خط پڑھتے ہی مجھے حسرت کا ایک شعر بے اختیار یاد آ گیا۔ ؎

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ زاہد بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

مجھے یہاں اس استفسار پر کچھ کہنا نہیں ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں
ـ یونیورسٹی میں شاعری اور شاعری سے طلبا کو روشناس کیا جاتا ہے۔ متفرق اور مخصوص اشعار
وا ہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو غزل گوئی پر ایمان لائے بغیر ہم اپنے شعر و ادب
ے معیار منزلت سے آشنا نہیں ہو سکتے اور جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے حسرت شروع سے
خر تک تقریباً نصف صدی سے اوپر اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز، منفرد اور محترم رہے ہیں۔
سب سے بدنام صنفِ سخن کو سب سے پُر آشوب عہد میں حسرت نے جس طرح بچایا اور سب سے ممتاز رکھا
وہ حسرت کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ ابھی نامعلوم مدت تک غزل گوئی کے معیار
حسرت ہی رہیں گے۔ یہی بات نظم گوئی کے سلسلے میں اقبال کے بارے میں وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔
خود حسرت کی پیروی کوئی کر پائے یا نہیں، حسرت کی غزل گوئی کی پیروی کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس
یونیورسٹی کے طلباء کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ حسرت کی غزل پڑھ کر بد اطوار ہو جائیں گے میری
رائے میں اس یونیورسٹی کو بند اور اس کے اساتذہ کو کچھ اور نہیں تو تعلیم کے کام سے تو ہمیشہ کے
لئے محروم کر دینا چاہئے۔

کوئی پندرہ سولہ سال اُدھر کی بات ہے ایک دفعہ سفر میں حسرت کا ساتھ ہو گیا۔ میں دنیا کی ہر تکلیف
برداشت کر سکتا ہوں۔ تھرڈ کلاس کی بھیڑ سے جانبر نہیں ہو سکتا۔ حسرت حسبِ معمول تھرڈ کلاس میں
سفر کر رہے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جس ڈبّہ میں وہ سفر کر رہے تھے اُس کا کیا حال تھا۔ کتنی بھیڑ
تھی، کیسے لوگ تھے اور کیسا تکلیف دہ موسم تھا۔ لیکن حسرت کے بشرہ یا بات چیت سے مطلق ظاہر نہیں
ہوتا تھا کہ اِن کو شمہ برابر بھی کوئی تکلیف تھی۔ گاڑی ٹھہرتی تو میں پلیٹ فارم پر اُتر کر اُن کو دیکھ آتا۔
جب دیکھتا ہجوم میں اضافہ پاتا۔ مجھے دیکھ لیتے تو ہنس کر پکارتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس سے
دلچسپ اور آرام دہ سفر انھوں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ جا کر دیکھتا ہوں تو انکے گھٹنے پر
کسی غریب کی چھوٹی بچی چیتھڑے لپیٹے ہوئے بیٹھی ہے اور حسرت صاحب اپنی پوٹلی کھولے
ہوئے کھانا کھا رہے ہیں اور بچی کو بھی کھلا رہے ہیں۔ میں نے کہا "حسرت صاحب یہ کیا ہے؟"
کہنے لگے "کوئی بات نہیں، بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی، اندیشہ تھا کہ کہیں بچی کچل نہ جائے۔ میں نے کہا۔

"حسرت صاحب! کاش اس وقت آپ کا فوٹو لیا جاتا اور اُس کے نیچے لکھ دیا جاتا "ہندوستان میں شاعری"۔ کہنے لگے "جی نہیں اس کے نیچے لکھ دیا جاتا "ہندوستان میں بھوک"۔"

اُردو بی۔ ایچ۔ ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرت علی گڑھ تشریف لائے تھے اسی بیچ دعیج جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ سفر خرچ کا بل فارم دستخط کے لئے پیش کیا گیا تو بولے "یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا؟ میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں۔ دراصل میں دہلی جا رہا تھا۔ پروگرام ایسا رکھا تھا کہ یہاں اُتر پڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں' پھر یہ کرایہ کیسا؟ ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں؟ طعام و قیام تو آپ کے ہاں رہا۔ بڑی دیر تک ردّ و قدح ہوتی رہی۔ اور علی گڑھ سے اپنی الفت کا اظہار کرتے رہے۔ حسرت بڑے زندہ دل اور خوش گفتار تھے۔ میں نے کہا۔ مولانا' یہ روپیہ تو آپ مری خاطر لے لیں اور میرے ہی اوپر اپنے ہاتھ سے صرف کر دیں۔ بولے" ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ بتائیے کیسے؟" میں نے کہا میرے لئے ایک ویسا ہی یونیفارم بنوا دیجیے جیسا کہ آپ پہنتے ہیں بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر بولے، یونیفارم کیا کیجئے گا میرے تو دشمنوں کا خیال ہے کہ آپ اپنے بعد اپنا خلیفہ مجھ ہی کو نامزد کریں گے، اُس وقت یہ سجادہ میرے کام آئے گا۔ بولے خرقہ یا سجادہ؟ میں نے کہا خرقہ نہ سجادہ' ان کا کاروبار سب ہی کرتے ہیں۔ آپ کی یونیفارم میں تو آپ کا خلیفہ خانہ بردوش نظر آئے گا۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رہ رہ کر ہنستے رہے اور داد دیتے رہے۔

حسرت ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے لیکن ان کے اپنے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ نہ ممبروں کی آرام دہ، کشادہ اور پُر فضا قیام گاہ۔ نہ ٹیلیفون نہ موٹر۔ نہ تفریح نہ دعوت۔ نہ دید و باز دید۔ ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا۔ فرش پر آس پاس اخبارات' کاغذات اور فائلیں۔ وقت آیا تو کسی دوکان پر جا کر کھانا کھا لیا۔ کاغذات جھولے میں ڈالے پارلیمنٹ پہنچ گئے۔ راستہ اکثر پیدل ہی طے کرتے، اور موقع جان پڑتا تو پارلیمنٹ میں ایسی دو ٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ در و بام گونج اُٹھتے۔

تنم می بلرزد چو یاد آورم

دہلی میں ایک نیم سرکاری و سیاسی قسم کا اجتماع تھا۔ بعض اہم اور نازک مسائل زیر بحث تھے۔ شام کو عصرانہ تھا۔ اعیان و اکابر جمع تھے۔ حسرت بھی مدعو تھے۔ ایسے مواقع پر ایسی پارٹیاں صرف چائے پینے پلانے کے لئے نہیں ہوتیں اور باتیں بھی مدنظر ہوتی ہیں۔ آرائش و زیبائش جاہ و حشم، ساز و سامان، تکلف و تواضع، صاحب ثروت، ماہرین سیاست، اکابر علم و حکمت اپنے اپنے وزن اور وقار کے ساتھ اور خواتین مع اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں۔ فضا آراستہ۔ چمن پیراستہ۔ اتنے میں ایک طرف سے حسرت نمودار ہوئے۔ اسی سج دھج سے جو صرف انکی تھی۔ اسی وقار درویشی اور انداز قلندری سے جو ان کا مسلک تھا، اور اسی شعلہ سامانی و شبنم افشانی کے ساتھ جو ان کی زندگی تھی مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہر شخص نے بڑے لطف و احترام سے حسرت کی پذیرائی کی اور دیکھتے دیکھتے وہ سب کی توجہ اور تپاک کا مرکز بن گئے۔ شائستہ فقرے، لطف کی باتیں، عقیدت، محبت کی پیش کش۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تقریب حسرت ہی کے خیرمقدم کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ فرمائش شروع ہوگئی۔ حسرت نے شعر سنانے شروع کردیئے۔ حسرت زیادہ تر اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے۔ بالکل جیسے باتیں کرتے ہیں۔ مگر معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی ترنم بھی فرمانے لگتے جس پر مجھے ہمیشہ ہنسی آجاتی۔ اُن کا ترنم ایسا ہوتا جیسے کوئی معصوم بچہ ترنم کے ہر اصول سے بیگانہ محض ترنم کی نقل کر رہا ہو۔

حسرت اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سارے اکابر اُن کے گرد جمع ہوگئے۔ محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں یاد آتی رہیں اور اپنا اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں۔ سارا گرد و پیش جو دولت، امارت اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا۔ ایک شخص کی موجودگی سے کیا سے کیا ہوگیا اور اس مرد درویش کے جلال اور اُس کی شاعری کے جلو میں وہ سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا۔ کتنی ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کو باضابطہ اور بامعنی تحریر کا جامہ پہنانا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ یکایک اقبال کی ایک نظم کے نقوش تصور میں ابھرنے لگے۔ اور بے اختیار یاد آنے لگا ؎

اس کا مقام ہے بلند، اس کا مقام ہے عظیم — اسکا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اسکا ناز

ریاض احمد

روایت اور جدید شاعری

ادب میں روایت افہام و تفہیم کا وہ باہمی علاقہ ہے جس کے باعث شاعر اور اس کے قاری ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ ان کے درمیان جمالیاتی، معنوی اور حسیاتی انداز کے متعلق ایک قسم کا سمجھوتہ ہوجاتا ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے یہ جان کر کہتا ہے کہ اس کا سننے والا اس کے مفہوم اور اس کے انداز پیشکش کا رسیا ہے چنانچہ کسی غلط فہمی کا خدشہ موجود نہیں اور قاری یہ جانتا ہے کہ شاعر نے اسی کے لئے تو کہا ہے۔ تحسین سخن شناس کے چار لفظ ہی تو وہ صلہ ہے جس کی تمنا میں شاعر نے اپنی جگر کاوی سے کام لیا ہے۔ شاعر اور قاری ایک دوسرے کی طرف ایک گونہ اعتماد کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے روایت کے مفہوم میں قدامت یا رجعت کا مفہوم لازماً شامل نہیں۔ لیکن آپ جب بھی روایت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ماضی کا تصور بھی بیدار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ یہ نظر آتی ہے کہ ہر روایت اپنے اختصاص اور اپنی جداگانہ حیثیت کو معین اور متحجر کرنے کے لئے وقت کی محتاج ہے اور اس کے تصورات کو واضح طور پر مرتب ہونے تک اس پر کافی عرصہ گزر چکا ہوتا ہے۔ یوں تو ہو نہیں سکتا کہ روایت کہیں از خود یک بیک تشکیل پا جائے۔ اس لئے اگر ایک طرف یہ بات سچ ہے کہ روایت لازماً ماضی سے وابستہ نہیں تو دوسری طرف اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ روایت کی تشکیل، تعین اور نمو کے لئے وقت کا ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ روایت کو جب بھی پہلے سے معین تصورات کے ماتحت رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بالعموم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس قسم کی کوشش ارتقائی عمل کے بالکل برعکس کام کرتی ہے یعنی ایک خاص منزل یا ایک مقام حقیقت کو تو آپ پہلے سے جانتے پہچانتے ہیں اور اس تعین کے بعد آپ اس منزل کی

راہ کی تلاش میں چل نکلتے ہیں ظاہر ہے کہ یا تو آپ کی منزل کا تصور محض ایک خود فریبی یا خام خیالی ہے اور اگر منزل واقعی حقیقی ہے تو یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ اس منزل تک تو پہنچ جائیں لیکن راہ و رسم منزل سے کورے ہی رہ جائیں۔

بہرحال اگر روایت کو ابلاغ و تفہیم کا باہمی علاقہ مان لیا جائے تو الجھن کی دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ روایت گویا ایک ایسا مسئلہ ہے جو صرف فن کار اور قاری کے باہمی تعلق پر منحصر ہے۔ شاعر گویا شعر صرف اس لئے کہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک خاص جماعت ہوتی ہے۔ جن کے تقاضوں کی آسودگی اس کے فن کی تحریک اور اس کے فن کا مقصد ہے اور خود شاعر کی ذات اور اظہار کی خواہش کا جو اس کے ذاتی اور داخلی تقاضوں پر مشتمل ہوتی ہے، تخلیق فن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات صرف ایک ایسی فضا یا ایک ایسے معاشرے میں ممکن ہو سکتی ہے جہاں فن کار کی شخصیت محض حیاتیاتی حدوں تک محدود ہو۔ اس کے کوئی ذہنی، نفسیاتی اور سماجی تقاضے نہ ہوں اور معاشرے میں کچھ ایسا انتظام ہو کہ فرد اور سماج میں باہمی چپقلش، فرد اور فرد کے مابین تصادم کا کوئی احتمال نہ ہو۔ دوسری الجھن یہ ہے کہ اس طرح ادب اور روایت کا مسئلہ محض ابلاغ تک محدود رہ جاتا ہے۔ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مفہوم یا مافیہ کا روایت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ روایت عبارت ہے صرف ذریعہ اظہار یا زبان کے اسالیب، پیرایہ ہائے بیان اور اس کے لغوی اور مجازی استعمال کی مختلف مروجہ معروف صورتوں سے۔

دراصل یہ مسائل ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ روایت کا عام مفہوم یہ ہے کہ روایت ماضی کا وہ اجتماعی اثاثہ ہے جو ایک نسل دوسری نسل کے لئے چھوڑ جاتی ہے اور نئی نسل کے ہر فرد کو یہ بوجھ بلا ضرورت اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھرنا پڑتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اپنی آزادی اور اس کی ذات کی نشو و نما یا اس بوجھ تلے دب کر ختم ہو جاتی ہے یا وہ اس سے بغاوت کرتا ہے اور اس جوئے کو اتار پھینکتا ہے۔ روایت کے پابند کو آپ کولھو کا بیل قرار دیتے ہیں لیکن روایت کے باغی کو آپ شتر بے مہار تو نہیں کہیں گے! اس لئے روایت کی پابندی اور روایت کی آزادی کا مسئلہ مزید توجہ کا طالب ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ روایت نہ

اور شعوری اعتبار سے اس وقت تک دائرہ تعین میں نہیں آتی جب تک اس کی ہیئت تجرید اور تعمیم کے مرحلوں سے گزر کر مخصوص سانچوں میں نہ ڈھل جائے۔ اس وقت جا کر یہ محسوس ہوتے لگتا ہے کہ سانچے کی تبدیلی سے مطلوبہ چیز برآمد نہ ہو گی۔ ایک مسلسل تلازمہ سانچے اور مواد میں تمیز کو مٹا دیتا ہے۔ تلازمی کی اس قوت کا احساس اس امر سے کر لیجئے کہ حالت بیماری میں آپ جس برتن میں کوئی تلخ دوا استعمال کرتے رہے ہوں، صحت کے بعد اس برتن کی صورت ہی سے طبیعت اکراہ کرنے لگتی ہے۔ یہ ایک مشروط اضطراری عمل (CONDITIONED REFLEX) ہوتا ہے کہ ایک مخصوص ہیئت دیکھ کر آپ نے محسوس کر لیا کہ آپ کے سامنے جو چیز پیش کی جا رہی ہے وہ شربت ہے۔ یہ مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے جب ایک نامیاتی عمل کی تکمیل کے بعد زوال (DECAY) کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ایک تعمیری دور کے بعد تخریب و انتشار کا وقت آن لگتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ ایک بیج زمین میں بوتے ہیں۔ اس سے ایک پودا نکل آتا ہے۔ آپ اس پودے کی قطع و برید کرتے ہیں تو اس کی شاخیں اور بھی گھنی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آپ اس میں کوئی پیوند لگاتے ہیں تو وہ اسے قبول کر لیتا ہے۔ لیکن اس دوران میں آپ نہیں جانتے کہ اس پودے کی آخری شکل کیا ہو گی اور مختلف پیوند لگا کر اس میں جو پھل لگے گا اس کی نوعیت کیا ہو گی۔ یہی درخت ایک خاص عرصے کے بعد اپنی نشو و نما کے آخری مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اب اس کی ہیئت، اس کے پھل کا نام، اس کے فوائد اور نقصانات آہستہ آہستہ متعین ہوتے ہیں پھر ایک عرصے تک اس کا یہ دین قائم رہتا ہے۔ اور پھر اس میں انحطاط اور موت کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جسے ایلیٹ نے خزاں دیدہ پتے کی مثال سے واضح کیا ہے۔ غالب جو نئے انداز بیان کا متلاشی تھا، اس نے بھی اپنے دو دیوان کے لئے "ورق برگ" کا استعارہ استعمال کیا ہے ؎

نیست نقصان یک دو جزو است از سواد ریختہ

کاں ورق برگ از نخلستان فرہنگ من است

اب آپ ایک دوسرے پودے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ پودا

اسی مرنے والے پودے ہی کے بیج سے جنم لیتا ہے اور اس طرح روایت کا تواتر اور توارث قائم رہتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ اس پودے کے نیچے جو چھوٹے چھوٹے پودے جنم لیتے ہیں وہ اس کے سائے کے باعث پنپ نہیں سکتے اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض (PARASITES) بیلیں اس پودے پر نشو و نما پانے لگتی ہیں اور دُور سے صرف بیل ہی کے پھول پتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ روائیت کا ذکر کرتے ہیں تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ آپ اس تناور درخت کا ذکر کرتے ہیں جو نمو کی منزلیں طے کر چکا ہوتا ہے یا صرف گرتے ہوئے پتے کا ذکر کرتے ہیں یا ان مصنوعی آرائشی تکلفات کا ذکر کرتے ہیں جن کی نوعیت محض PARASITES کی سی ہوتی ہے جسے آپ اصل روایت کا حصہ قرار دے ڈالتے ہیں۔ روایت انفرادیت کی ضد نہیں ہے۔ انفرادیت کی ضد تقلید اور نقالی ہے اور اسے روایت سے ممیز کرنے کے لئے رسم پرستی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ روایت انفرادیت کو محض اس حد تک متاثر کرتی ہے کہ وہ ان حدوں کا تعین کرتی ہے جن کے اندر انفرادیت کو پھلنا پھولنا ہوتا ہے۔ روایت اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کرتی۔ اجتہاد سے صرف رسم پرستی خوف کھاتی ہے۔ روایت ایک مخصوص اجتماعی ارتقار کا نام ہے۔ یہ درست ہے کہ اجتماعی شعور انفرادی شعور کی اکائیوں کا مجموعہ نہیں۔ لیکن انفرادی شعور کسی خلا میں تو بروئے کار نہیں آتا۔ فرد جب تک ایک معاشرے، ایک جیتے جاگتے ماحول میں زندہ ہے، اس وقت تک وہ اپنے داخلی تقاضوں کو ماحول اور معاشرے کے تقاضوں سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ لیکن دوسری طرف اجتماعی اور معاشرتی تقاضوں کو منعکس کرنے کا ذریعہ یہی انفرادی شعور ہے۔ انفرادی شعور ہی دراصل ان کا آئینہ ہے۔ آئینے کی خصوصیت عکس کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر آئینہ رنگین ہوا تو عکس رنگین۔ آئینہ دُھندلا ہوا تو عکس دُھندلا محدب ہوا تو عکس پھیل گیا اور اگر آئینہ میں بال ہوا تو عکس ٹیڑھا بینگا ہوگیا۔ چنانچہ روایت انفرادیت کی تربیت کرتی ہے اور یہ انفرادیت جب پوری طرح تربیت حاصل کرلیتی ہے تو پھر روایت کو آگے بڑھاتی ہے۔ یہ باہمی عمل اور ردِ عمل کا ایک سلسلہ ہے جو مسلسل جاری

بنتا ہے۔ روایت یا روایت کی پابندی دراصل مردہ پرستی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کسی چیز کو اس وقت تک روایت کے باب میں شمار کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے جب تک وہ مر نہ جائے۔ اس موت سے پہلے وہ وقت آتا ہے جب ایک مسلک اپنی انفرادیت کو متعین اور مستحکم کرتا ہے۔ اس دوران میں اس کے اصول وضوابط مدون ہوتے ہیں، جن کا مقصود صرف اس داخلی اور بنیادی حقیقت یا روح کو منضبط کرنا ہوتا ہے جو اصل ہے اور زندگی کا سرچشمہ ہے لیکن بعد میں جب ہم روح کو بھلا دیتے ہیں۔ تو ایک غیر زمانی خارجی ڈھانچے سے چمٹے رہتے ہیں۔ اس موقع پر پہنچ کر تخلیقی جوہر کا مرجع و مقصود اس ڈھانچے کی آرائش رہ جاتا ہے۔ یہ ڈھانچہ نہ بڑھتا ہے نہ پھیلتا ہے۔ اس لئے ہر نئے آنے والے نقاش کے لئے دائرہ عمل محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ صرف ان کونوں کھدروں کا متلاشی رہ جاتا ہے جہاں پہلے کوئی نقش نہ بن سکا ہو۔ یا ایک بنے ہوئے [illegible] نقش کے کسی ایک حصے پر اپنی طرف سے ایک نیا رنگ چڑھا کر اپنے لئے معراج کمال تصور کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس روایت کا باغی یہ احساس دلاتا ہے کہ اس نے عمل کے لئے ایک ایسا میدان منتخب کیا ہے جو اس مخصوص عمل کے لئے موزوں ہی نہیں۔ عمل کے حسن و قبح سے بحث نہیں۔ بحث صرف اس بات سے ہے کہ عمل مروجہ آداب وضع کا پابند ہے یا نہیں۔ مثنوی کہئے تو اس کے لئے بحر تک متعین ہے۔ جو اس کی پابندی نہیں کرتا وہ طریقۂ راسخہ شعراء سے انحراف کے باعث معتوب و مقہور قرار پاتا ہے۔

مسجد کا ایک نقشہ صدیوں کی روایت نے متعین کر دیا ہے۔ پس اگر کوئی شخص قید خانے کی صورت پر ایک گنبد اور دو مینار کھڑے کر دے تو آپ اسے مسجد کہنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ مسجد نماز پڑھنے کے لئے مخصوص ہے۔ ادب کی روایت جب متحجر ہو جاتی ہے تو عجب بات ہے کہ ہم صرف اس روایت کے گنبد اور مینار دیکھتے ہیں۔ سجدے کے گداز اور ذوقِ عبودیت کے نیاز کا تقاضا نہیں کرتے۔ روایت کی مسجد کا یہ حال ہے کہ جیسے کوئی مسجد کو دیکھ کر یہ سوچے کہ چلو دو رکعت نماز ہی ادا کر لو۔ اولاً صورتِ حال یہ تھی کہ نماز مقدم تھی اور اس کے لئے مسجد کی قید لازم نہ تھی۔ اب یہ ہو گیا ہے کہ نماز ادا ہو نہ ہو۔ مسجد ضرور ہونی چاہئے۔ روایت جب مردہ

ہو جاتی ہے تو شعر کے لئے موزوں پیرایۂ اظہار بننے کی بجائے شعر گوئی کی تحریک بن کر اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ گویا دلیل کچھ اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر غزل کی ہیئت موجود نہ ہوتی تو غالب جیسا غزل گو پیدا نہ ہوتا۔ اب غالب لاکھ کہتا رہے کہ "لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں ـــ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں"۔ (خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ)

چنانچہ ادب کی روایت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ افہام و تفہیم کا ایک علاقہ ہے تو یہ علاقہ کسی سوچی سمجھی تدبیر کے ماتحت یک بیک وجود میں نہیں آجاتا۔ یہ علاقہ ایک معاشرے کی ذہنی فتوحات، علمی ورثے اور جذباتی افتاد سے ترکیب پاتا ہے اور نفسیاتی اعتبار سے کم و بیش ایک نیم شعوری کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ ادب حقائق کے براہ راست تصور کی بجائے حقائق کے مجموعی تاثر .... کے متعلق ایک جذباتی ردعمل پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ادب میں ایک قوم ایک ملک یا ایک تمدنی نظام کا مجموعی ردعمل تکرار اور اعادے کے ماتحت روایت کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے جس میں علم، فلسفہ، مذہب اور معاشرتی اقدار ملی جلی نظر آتی ہیں۔ اردو ادب کی روایت کا پیمانہ غزل، قصیدہ اور مثنوی کی ہیئت تک محدود نہیں ہے۔ اس کا دائرہ پھیل کر اس معاشرے کی جملہ ذہنی عادات پر حاوی ہو جاتا ہے جو اس معاشرے سے مخصوص تھیں جن میں اردو شاعری نے جنم لیا اور پروان چڑھی۔

اردو ادب کے متعلق یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنی روایت فارسی ادب سے لی ہے اور اس طرح یہ بحث نہایت طویل ہو جائے گی کہ آخر یہ روایت کیونکر لی گئی اور پھر ہمیں اس روایت کے سلسلہ میں عربی اور عجمی روایت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانا پڑے گا۔ لیکن مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب نے ایک ایسے معاشرے میں پرورش پائی جو مغل ہندوستانی تمدن کہلا سکتا ہے۔ لیکن اس میں ہندوستانی حصہ کچھ محدود ہی نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ یہاں کا تمدنی نظام کچھ ایسا تھا جس نے علم اور زندگی کی بلند اقدار کو ایک محدود گروہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ مغل جب اس ملک میں آئے تو وہ اپنے ساتھ وہ

عجمی مزاج لے کر آئے تھے جو مذہباً سامی تھا، نسلاً آریائی اور جمالیاتی اعتبار سے مغل بغلوں کا جمالیاتی رجحان وسعت، کشادگی اور کچھ لذت پرستی کا حامل ہے۔ ان کے مذہب کی روایت وسعت اور کشادگی کو تو برداشت کر سکتی تھی لیکن لذت پرستی کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہ تھی بحث کوشی اور زہد و ورع کے خشک تقاضوں نے بالآخر عجمی تصوف کے دامن میں پناہ ڈھونڈی جس نے یونانی فلسفہ کی اعانت سے، اور آریائی تصور پرستی کے سہارے ایک ایسا روپ دھارا کہ عمل کی بحث کوشی جذباتیت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ ہندوستان کی آب و ہوا اسے اور بھی راس آئی۔ ممکن تھا کہ ہندو عصبیت سے تصادم کے بعد کوئی نئی صورت وجود پذیر ہوتی۔ لیکن ایک طرف تو ویدانت کا فلسفہ، جو ہندو مذہب کا ایک جزو ہے عجمی تصوف سے ایک طبعی مناسبت کے تحت اس قسم کے تصادم کے لئے موزوں نہ تھا۔ دوسری طرف یہ قوم جسے اکال الامم کا لقب دیا گیا تھا۔ اپنی تمام تر قومی عصبیت کے باوجود مذہبی اور ذہنی اعتبار سے کچھ ایسی انجذابی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے کہ کسی سانچے میں ڈھلے بغیر ہر نئی چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مغل اعظم جس راستے پر چل نکلا تھا اگر حضرت مجددؒ اس کی راہ میں چٹان کی طرح حائل نہ ہو جاتے تو آج ہندوستانی مسلمان، ہندو مذہب کا محض ایک فرقہ ہوتا۔ اس قسم کا امکان بھگتی تحریک وغیرہ کے ذریعے پیدا بھی ہو گیا تھا۔

بہر حال اس سارے قضیے کا حاصل محض اتنا ہے کہ اُردو ادب کی روایت مقامی ہندوستانی روایت سے بہت زیادہ متاثر نہ ہو سکی اور مسلمانوں کے شہری تمدن ہی تک محدود رہی۔ وہ ہندو جو براہ راست مسلمان غلبے سے دو چار ہوئے۔ انھوں نے عربی فارسی کو اس طرح اپنایا کہ سنسکرت تو مٹ کر ہی رہ گئی اور مقامی بولیاں کسی عظیم ادبی روایت کی تشکیل نہ کر سکیں۔ ان کا اثر دیہاتی اداروں تک محدود ہو کر رہ گیا۔

قدیم اُردو ادب کی روایت نے دلّی میں جنم لیا جو ہندوستان کے اسلامی بادشاہوں کا دارالحکومت، زبان کی ٹکسال اور تمدن کا مرکز تھا۔ مروجہ علمی، سیاسی اور معاشی نظام کے تقاضوں کے پیش نظر اس کے لئے ایک محدود طبقے کی خوشنودی مزاج ہی وہ واحد معیار تھا جس کو فنکار

پنے پیش نظر رکھتے۔ اس وقت یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے متکلمین کے زیرِ اثر نو افلاطونی فلسفے کے سارے اجزا اپنے اندر جذب کر لئے تھے۔ اگر ہم ان سیاسی اور سماجی حالات کے تجزیئے میں اُلجھ جائیں جو اسلامی فتوحات کی توسیع کے بعد سارے برِ اعظم ایشیا و یورپ اور افریقہ کے بعض حصّوں تک پھیلے ہوئے تھے اور جو براہِ راست اس رجحان کے لئے ذمّہ دار قرار دیئے جا سکتے ہیں تو بات کو سمیٹنا دشوار ہو جائے گا۔ اس فلسفے کے اجزاء افلاطون کے عینی فلسفے اور مشرقی تصوّف کے باہمی ربط سے ترتیب پاتے ہیں۔ یہ فلسفہ ایک طرف تو مذہبی تشدد اور کٹرپن کے خلاف ایک ردِّ عمل کے طور پر وجود پذیر ہوا تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس نے مادّی اقدار کی طرف منتقل ہونے کی بجائے اعیان و تصورات کی دُنیا کا رُخ کیا۔ عقل و منطق کی بجائے اُس نے وجدان کو اپنا رہبر ٹھیرایا اور ایک اذعانی طرزِ فکر کی بنیاد رکھی جس میں نقل اور سند کو دلیل پر ترجیح دی گئی۔ عینیت پسندی اور قنوطیت اس فلسفے میں مسلسل جاری و ساری رہے۔ اسی فلسفے کے زیرِ اثر اس کلاسیکی روایت نے نمو پائی۔ جو تجرید کے ذریعے ایک قسم کے توازن پر زور دیتی ہے، جو اقدار کا احترام سکھاتی ہے، لفظ کی صداقت کی علمبردار ہے۔ تجرباتی استدراک کی بجائے ذہنی موشگافی کی طرف مائل ہے۔ چنانچہ اس ذہنی افتاد کے ماتحت جو آہستہ آہستہ پنپتی رہی، جب وہ متحجر ہوئی تو اس میں ہیئت کی تخصیص۔ ہیئت کی کڑی پابندی زبان کی مجرد صحت و صفائی، مضامین کی نزاکت اور باریکی۔ موضوعات کی تجرید، اسالیب کی تعمیم اور تجرید اور ان کے ذریعے ایک عینیت پسندی پر منتج ہوئی۔ حُسن و عشق کے لئے غزل مدح و ہجا کے لئے قصیدہ قصّے کے لئے مثنوی، ٹکسالی زبان کے محاورے اور روزمرے کا التزام، ایہام، مبالغہ، حسنِ تعلیل، جمالیاتی تجربے کے تعین کے لئے تلمیحات کا سہارا انفرادی تجربے کی بجائے طریقۂ راسخۂ شعرا کی پابندی۔ یہ چیزیں شاعر کا مرتبہ متعین کرنے لگیں جن سے ذاتی اور انفرادی ضرورتوں کے لئے دوچار ہونا پڑتا تھا اور اس محدود گروہ میں بادشاہ، امرار، علمار، فقہار اور صوفیار شامل تھے۔ شاہ و امرا کے تقاضے کچھ لذت پرستی کی طرف مائل تھے۔ علمار بدیع و بیان کی بات کرتے اور مذہب کے نمائندے یا تو اسے

خرافات سمجھ کر التفات ہی نہ کرتے تھے یا اور یا اسے مجالس سماع کے لئے کارآمد بنانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی روایت میں زندگی کے تین روپ نظر آتے ہیں اور تینوں روپ عشق کے مختلف تصورات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دراصل عشق ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے۔ اسے جنسی حسیات کے نظام یا متصوفانہ جذباتیت تک محدود کردینے سے ادب کے متعلق غلط فہمیوں کا ایک بے پناہ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ عشق دراصل زندگی کے متعلق اس ردّعمل کا نام ہے جس کی اساس جذباتی ہوتی ہے اور جو اپنے پسند و ناپسند کا انتخاب شعوری عوامل کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ زندگی کا وہ مذاق ہے جو لاشعوری اور نیم شعوری سطحوں سے پختہ ہوکر نکلا ہے۔ چنانچہ غزل میں جب شاعر عشق کی بات کرتا ہے تو بعض صورتوں کو چھوڑ کر جہاں اس کے پیش نظر جنسی حسیات کا استبداد ہوتا ہے۔ بالعموم وہ زندگی کے متعلق اپنے جذباتی ردّعمل ہی کو پیش کرتا ہے۔

اُردو ادب میں عشق کے پردے میں زندگی کا شعور جن جن صورتوں میں اُبھرا ہے اس کی عمومی صورتیں تین ہیں۔ ان میں اوّلاً وہ روایت ہے، جسے ہم تصوف سے تعبیر کرتے ہیں جس کی علمی بنیاد نیم فلسفیانہ اور نیم مذہبی ہے اور جس کی نفسیاتی اساس ایک گہری اور رقیق القلب جذباتیت ہے۔ تصوف کی بحث میں الجھنے کا یہ مقام نہیں۔ علماء کا ایک پورا گروہ امام ابن تیمیہؒ سے لے کر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور وہابی تحریک کے داعیین تک اس کی عجمی لذت پرستی اور کم کوشی اور عمل کی بجائے تخیلاتی واردات سے شغف کا شاکی ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیقات اسے جنسی گمراہی اور فرار کا آئینہ دار بتاتی ہے۔ ادب میں تصوف کا جو رُوپ ملتا ہے، اس کی ایک روایت تو مولانا رومؒ سے منسوب ہے، جس کا امتیازی نشان جوش، ولولہ اور توانائی ہے۔ دوسری روایت مسکنت، دلگیری اور نفسیاتی سپردگی کی ہے۔

دوسری طرف عشق کی وہ روایت ہے جس کا تعلق براہ راست جنسی ہیجان سے ہے جس سے ہم معاملہ بندی اور ریختی وغیرہ کے روپ میں آشنا ہوتے ہیں۔ معاملہ بندی کے ساتھ ہی خمریات کا بھی مقام ہے۔ ہماری روایت نے اسے مذموم اور پست قرار دیا ہے لیکن جدید

علمی انکشافات کے رو سے ان تصورات کو از سرِ نو جانچنے کی ضرورت ہے مثلاً یہی بات کہ معاملہ بندی در اصل جنس کے متعلق بالغ اور صحت مندرویّہ کی آئینہ دار ہے۔ جنسی گمراہی (PERVERSION) یا جنسی رجعت (REGRESSION) سے سراسر آزاد۔ اس میں اگر کوئی خرابی ہے تو یہی کہ اس کی نوعیت غیر اخلاقی ہے۔ اس کی اصل وجہ حسن و عشق کے مابین ایک قسم کی بیگانگی ہے۔ ہمارا پرانا ادب عشق کے کسی ایسے نظریے سے آشنا نہیں ہے۔ جہاں عشق حسن کو ساتھ لے کر چل سکے اور حسن سے ذوق نظر کی تہذیب اور قوت عمل کے لئے تحریک حاصل کر سکے۔ تصوف میں محبوب ازل کا تصور بھی کچھ اسی قسم کا ہے کہ ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے نظریوں کے باوجود عشق حسن سے کچھ دور دور، کچھ کھنچا کھنچا اور نالاں ہی نظر آتا ہے۔ ذہنی آسودگی اور جذباتی توازن کی کوئی صورت بن نہیں پڑتی۔ چنانچہ معاملہ بندی میں عموماً راز و نیاز کی کیفیتیں کچھ باہمی نزاع کا روپ ہی اختیار کر سکتی ہیں۔ بدگمانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں کبھی کبھی مائل بہ عریانی نوک جھونک یا مطلب برآری کے ہنگامی جذبات دخل پا لیتے ہیں لیکن باہمی یگانگت کا کوئی گہرا شعور پیدا نہیں ہوتا۔ معاشرتی حالات اسی قسم کی فضا کے لئے سازگار تھے عاشق اور معشوق دونوں کی حیثیت پیشہ ورانہ تھی۔ عاشق محض عاشق تھا۔ معاشرے میں اپنے لئے کسی اور مقام کا قائل نہ تھا۔ محبوبہ پیشہ ور طوائف تھی۔ جس سے تعلق خاطر بھی اور اسی اعتبار سے تعیش پرستانہ تھا۔ وہ چیز ہی کچھ ایسی تھی، جسے محض ہنگامی ہوس پرستی کا مقصد قرار دیا جا سکتا تھا زندگی میں اسے کوئی بلند مقام نہ دیا جا سکتا تھا۔ وہ عورت جس کی حیثیت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی ہو سکتی ہے، شاعری کے لئے اجنبی تھی مغائرت کا یہ احساس صرف عاشق ہی کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ معشوق کی طرف سے بھی اس کا اظہار ہوتا تھا ؎

عشق کا حال بیسوا جانیں
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

خمریات کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ رند کی تصویر کچھ اس طرح بنتی ہے کہ وہ ایک مردِ آگاہ ہے جو روایتی اخلاقی اقدار کے خلاف بغاوت یا اجتہاد کی جرأت اپنے اندر رکھتا ہے۔

خود آگاہی کے ساتھ سر میں کچھ غم داذات کا اثر بھی جھلکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ بلند تصور بھی محدود ہے۔ چند شخصیتوں تک ہی محدود ہے۔ عموماً اس میں کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک کم ظرف شخص بہک گیا ہو یا ایک نرمی موسیقی کے احساس سے جھنکار اٹھا ہو۔

عشق کا تصور ادب سراسر ذہنی ہے۔ حقیقت کا ادراک ملاقاتی ہو یا اقدار کے مجموعی اور مستقل تاثر پر مشتمل۔ اس سے حسن جذبات کی ایک مخصوص وقتی ترتیب پاتی ہے۔ احساس و شعور اور مزاج کی اس کیفیت کا نام عشق ہے اس کی اساس ایک وقت فکری، حسیاتی اور جذباتی ہوتی ہے۔ اس تصور کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ عشق زندگی کے جمالیاتی تاثر کا نام ہے، جسے خالص فکر سے ایک طرف تو جذباتی ہیجان اور تحصیل ہیجان کے باعث ممیز کیا جا سکتا ہے اور دوسری طرف جنسی نتائج و عواقب اور خواہش کی آسودگی کی حد سے تحریک کے داخلی ہیجان اور اس سے وابستہ لذت پرستی استدلال کی بنیاد رکھتا ہے اور تحریک سے وابستہ حسی کیفیات کو مستقل راہ پر لاتا ہے بقول ذوق ع

لیتے ہیں یہاں کام بہ ذوق نظر سے

جن چند شعرا کے ہاں عشق کا یہ تصور ملتا ہے ان کے ہاں ایک نظام فکر کے آثار جذباتی سانچے میں ڈھلتے ہوئے ملتے ہیں مثال کے طور پر غالب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اقبال بھی اس کا علمبردار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب نے اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دیا اور اقبال نے اسے ایک فکری تصور سے وابستہ کر دیا ہے۔ اس مسئلے میں یہ خرابی البتہ ضرور موجود رہی ہے کہ واقعی ذہنی واردات کے بغیر بھی محض منطقی تخیلی یا لفظی تلازمات کے سہارے اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کے باعث خیال آفرینی، رعایت لفظی، ایہام وغیرہ کے بے کیف اور بے معنی دبستان وجود میں آئے۔ شعر میں یہ بحث فضول ہے کہ لفظ کو خیال پر فوقیت حاصل ہے یا خیال کو لفظ پر۔ اصل معاملہ صرف اتنا ہے کہ خیال ذہنی واردات کا منطقی ترجمان ہے اور لفظ اس کے اظہار کا ذریعہ۔ اصل چیز ذہنی واردات ہے۔ جسے جدید اصطلاح میں تجربہ کا نام دیا جاتا ہے۔ حقیقی تجربہ موجود ہو تو لفظ کی فوقیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہا خیال تو وہ

اس ذہنی واردات کو مروجہ فکری اصطلاحات کے ذریعے متعین کرنے کا نام ہے۔

اس تجزیے کو سامنے رکھتے ہوئے جدید اُردو ادب کا جائزہ لیجئے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تصوف کی روایت سے ہم قطعی ناآشنا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ حقیقی تصوف کی روایت تو قدیم ادب میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے لیکن متصوفانہ روایت بہرحال موجود تھی۔ جدید اُردو ادب میں اس کے مماثل وہ نفسیاتی رجحان ہے جو لاشعوری جنسی عوامل اور تحریکات سے مترتب ہوتا ہے۔ ان میں ایک مماثلت تو لاشعوری عوامل کا اشتراک ہے اور دوسری مماثلت یہ ہے کہ جس طرح حقیقی تصوف کی روایت ایک متصوفانہ روایت میں ڈھل گئی تھی جو ذہنی اور جذباتی تجربے کی بجائے فکری مسائل کی توضیح پر مشتمل تھی۔ اسی طرح جنسی یا نفسیاتی مسائل کے علم نے بھی جدید نظم کے لئے خاصا مواد مہیا کیا ہے۔ میراجی کے ہاں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ وہ غیرمعمولی جنسی و نفسیاتی رجحانات کو اپنی ذات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ نفسیاتی اصول کے تحت جو مریض اپنی لاشعوری تحریکات سے آگاہ ہو جاتا ہے اس کا نفسیاتی مرض ختم ہو جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ میراجی اپنے ہاں مادہ پرستی، اذیت کوشی وغیرہ کی الجھنوں سے باقاعدہ آگاہ ہوا اور اس کے بعد بھی یہ الجھنیں اس کی نظموں کا موضوع ایک ذاتی اور حقیقی تجربے کی طرح بن سکیں۔ اس رجحان کی حقیقی ترجمان وہ نظمیں ہیں جہاں میراجی کو خود بھی محسوس نہ ہو سکا کہ اس کی تہ میں کونسا نفسیاتی رجحان کارفرما تھا۔ مثال کے طور پر "بھیل کی بٹیا" "تفاوت راہ" وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بعض دوسری نظمیں اس خامی کے باوصف بھی فنی حسن و جمال سے متصف ہیں۔ مثلاً "ڈیومالا سے سائنس تک" کہ اس کا موضوع ایک قسم کی ذہنی مسرت ہے جو اس علم سے پیدا ہوئی ہے کہ دیومالا اگر ایک طرف لاشعوری نفسیاتی رجحانات کو پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اس میں بظاہر قدرت کے متعلق انسان کے علم کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ نفسیاتی رجحان اُردو ادب میں ابھی تک حیرت و استعجاب کے اس مرحلے سے آگے نہیں نکلا جو ایک نئی چیز کے علم یا دریافت سے وابستہ ہوتا ہے اور غالباً یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ مغرب میں بھی اس کی نوعیت ایک ذہنی دلچسپی کی سی ہے۔ ٹرائلنگ (TRILLING) نے اپنے نظریات ادبی تخلیقات سے اخذ کئے تھے۔

اس لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ مسائل جو جدید ادب پیش کرتا ہے، وہ پرانے ادب میں مفقود تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پرانے ادب میں ان کی نوعیت حقیقی تجربے کی سی تھی جس طرح ایک حقیقی صوفی کا صوفیانہ تجربہ۔ جدید عہد میں ان کی نوعیت علمی اور ذہنی دلچسپی کی سی ہے جس طرح متصوفانہ ادب میں تصوف کے مسائل کو پیش کیا جاتا ہے

معاملہ بندی کی روایت جدید ادب میں جاری نہیں رہ سکی۔ اس کی دو وجہیں تھیں اول تو یہ کہ وہ رومان انگیز تحریک جسے اختر شیرانی سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس کا سلسلہ بعض لوگوں نے عربی قصائد کی تشبیب وغیرہ سے ملایا ہے، در اصل عنفوانِ شباب کی تخیلی جذبات پرستی کا نتیجہ تھی۔ اس میں بلوغت کے پختہ اور حقیقت پسند عناصر سراسر ناپید ہیں۔ اس میں حقیقی محبوبہ موجود ہی نہیں ہوتی۔ یہ عاشق محبوبہ کے تصور سے ہی مخمور ہو جاتا ہے۔ اس کی محبوبہ کوئی بھی نہیں اور ساتھ ہی دنیا کی ہر نوجوان عورت اس کی محبوبہ ہے۔ یہ عشق کچھ "از گفتار خیزد" قسم کا عشق ہوتا ہے۔ معاشرے میں جو ایک معمولی سی تبدیلی ان معنوں میں آئی تھی کہ لڑکیاں سکولوں کالجوں میں پڑھنے لگیں اور مغربی طرزِ تمدن کے دلدادہ گھرانوں میں مرد عورتیں زیادہ آزادی سے ملنے لگے تھے۔ اس کے زیرِ اثر اتنا ضرور ہوا کہ اب محبوبہ کے لئے صیغہ تانیث کا استعمال جائز نظر آنے لگا اور یہ احساس آہستہ آہستہ نمو پانے لگا کہ یہ لازم نہیں محبوبہ طوائف ہی ہو۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طوائف کو معاشرے میں وہ مقام حاصل نہ رہا تھا جو اُسے پہلے حاصل تھا۔ اس کی روایتی تہذیب اور شائستگی مٹ چلی تھی۔ ان کا وجود جنسی آسودگی کے گھناؤنے پہلو تک محدود رہ گیا تھا۔

اس تحریک کا ایک صحت مند اثر ضرور نظر آتا ہے کہ محبوبہ سے یگانگت کا احساس کچھ واضح ہوتا جا رہا ہے۔ اس یگانگت کا احساس بہرحال ابھی توانائی سے آشنا نہیں ہو سکا۔ مثلاً فیض کے ہاں اس کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ عاشق محبوبہ سے اپنی مجبوری کا نام لے کر رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ ترقی پسند تحریک میں بالعموم صنفِ لطیف کی کس مپرسی کے ماتم کے پردے میں کچھ کھیل کھیلنے کی ترغیب کا انداز جھلکتا ہے۔ گویا نچلے طبقے کی عورتوں کو جنسی طور پر (EXPLOIT) کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ راشد کے ہاں بعض جگہ بیمار مریل عاشق

کی بجائے ایک توانا شخصیت کا تصور اُبھرتا ہے جس کے لئے حُسن اور عشق دونوں جذباتی آسودگی اور اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔ فراقؔ نے بھی یہ دعوی کیا ہے کہ اس کے ہاں جنسی فرار نہیں ہے۔ لیکن فراقؔ کا جنسی رجحان کوک شاستروں کا سا ہے یا جیسے نیازؔ فتحپوری "ترغیبات جنسی" لکھ کر جنس کے متعلق صحت مند ردّ عمل کا دعوے دار ہو۔ دراصل یہ واسوخت اور سراپا ہی کی روایت ہے جسے مروجہ فنی قیود سے آزاد کر لیا گیا ہے۔

دراصل جنس کا مسئلہ اس صورت میں ہمارے معاشرے میں رو نما ہی نہیں ہوا، جس طرح مغرب میں موجود ہے۔ ہماری الجھن یہ ہے کہ جسمانی طور پر جنسی آسودگی کیونکر میسر آئے۔ مغرب میں جہاں صنف نازک کو معاشری آزادیاں حاصل ہیں وہاں جسمانی آسودگی کے تقاضے کوئی بڑی الجھنیں نہیں ہیں۔ وہاں جو مسئلہ در پیش ہے وہ یہ ہے کہ جنسی تحریکات کی فراوانی سے پیدا ہونے والے انتشار سے کس طرح نجات حاصل ہو۔ یہاں جنسی تشنگی کا سبب طبیعی ہے۔ وہاں اس کا سبب ذہنی ہے۔ اس لئے وہاں جنس سے غیر فطری رجحانات کے ساتھ ساتھ جنسی آسودگی سے حاصل ہونے والی سرشار کیفیت بھی ملتی ہے لیکن یہاں جنس ایک شجر ممنوعہ کی طرح ابتداً ایک دلچسپی کو جنم دیتی ہے۔ لیکن جب تجربہ یہ سکھاتا ہے کہ اس شجر ممنوعہ کا سایہ زہرناک ہے تو انسان ترغیب اور خوف کے مابین لٹک کر رہ جاتا ہے اس زہرناکی کی نوعیت اور کیفیت ہمیشہ ایک سی نہیں ہوتی۔ کبھی یہ رسم و رواج کی زنجیریں بن کر سامنے آتی ہے کبھی اقتصادی مشکلات کے پردے سے جھانکتی ہے۔ بہر حال ایک صورت یکساں رہتی ہے۔ وہ یہ کہ جذبات میں سرشاری اور سیر دگی پیدا نہیں ہوتی۔

جدید اُردو شاعری سے بحیثیت مجموعی جو اثر مترتب ہوتا ہے اس میں عشق کا وہ انداز غالب ہے، جسے اوپر ذہنی عشق کہا گیا ہے۔ قیومؔ نظر۔ یوسف ظفرؔ۔ مختارؔ صدیقی۔ ضیاؔ جالندھری وغیرہ کے تاریخی ارتقا کو سامنے رکھئے تو ابتدا میں ان کے ہاں ایک عورت یا ایک محبوبہ کا وجود نظر آتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ محبوبہ کہیں کھو جاتی ہے اور صرف عاشق کی ذات باقی رہ جاتی ہے۔ جدید غزل میں بھی یہی بات نظر آتی ہے۔ غزل کے روایتی اشارے

یہ سب کچھ موجود ہے لیکن ان کے معنی میں ایک انقلاب آچکا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی اس روایت کا واضح سلسلہ موجود ہے۔ "بانگِ درا" میں اس کا عشق ارضی ہے۔ لیکن یہ تصور آہستہ آہستہ عشق کے ایک مجرد یا ذہنی تصور میں بدل گیا ہے ؎

من و تو زاں غمِ شیریں نہ دانستم

کہ اصلِ او و افکارِ بلند است

جدید اردو شاعری اقبال کے بعد ہی چلی ہے اور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اقبال پر ہماری کلاسیکی روایت ختم ہو جاتی ہے لیکن اقبال نے غیر شعوری طور پر ہماری شاعری کی جدید راہوں کو معنوی اعتبار سے ضرور روشن کیا ہے۔ غزل اور نظم کا فنی ڈھانچہ اس نے بدستور قائم رکھا۔ لیکن زبان و بیان میں کچھ ایسی معنویت پیدا کی ہیں جس سے دوسرے شعراء کو لفظوں کی نئی معنوی کیفیتوں کا سراغ ملا۔ جدید غزل پر اقبال کا اثر یقیناً گہرا ہے اور جدید غزل میں آپ دیکھئے تو عشق تو موجود ہے لیکن معشوق کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ حُسن کا معروض یا مخصوص جلوہ یہاں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ حُسنِ بسیط کا ایک عمومی تصور ہے جو کسی خاص قالب میں ڈھلتا نظر نہیں آتا۔ حُسن محض ایک قدر کا نام قرار پا سکتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہم اب واسوخت اور سراپا نہیں کہتے بلکہ اس وجہ سے کہ عشق کا تجربہ ہی سرے سے ناپید ہے۔ عنفوانِ شباب کی نیم جنسی تحریک کے ماتحت کچھ رومانوی تاثرات اُبھرتے ہیں جن میں واقعیت کم اور تخیلی رنگ زیادہ ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے پیچھے غم و اندوہ کی امانت اور یاس انگیز یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے وہی شکست خوردہ جذبات اب بھی شاعری کا سرمایہ ہیں جو پہلے تھے۔ حُسن سے مغائرت کا احساس اب بھی کارفرما ہے۔ حُسن کا تصور اب بھی قوت اور توانائی بننے کی بجائے کمزوری اور فرار کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ اس روایت میں ایک اعتبار سے کچھ زوال کے آثار بھی البتہ پیدا ہوئے۔ پرانا معاشرہ اپنے انحطاط کے باوجود ایک قسم کے اعتماد سے ضرور آشنا تھا۔ مذہبی اعتقاد کا بھرم پہلے قائم تھا اور ذہن اس بھرم سے کچھ نہ کچھ اطمینان ضرور حاصل کرتا تھا لیکن موجودہ دور میں مذہب میں وہ رسمی سنعت بھی آہستہ آہستہ کچھ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اقبال نے اسے

سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ لیکن آج ہم اقبال کو مذہبی شاعر کہنے سے ڈرتے ہیں اور اسی مذہبی عنصر کی بنیاد پر اسے آفاقی شاعر کہنے سے انکار کرنے لگے ہیں۔ اس کے برعکس قوم کا تصور جدید سیاسی تصورات کے زیر اثر نمو پانے لگا ہے۔ لیکن یہاں ہم ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہیں۔ ہم قوم کا تصور تو مذہب کی اساس پر قائم کرتے ہیں لیکن اس کے لئے جو عصبیت ضروری ہے اسے ملک کے حوالے سے متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف غلبۂ افرنگ کے عہد میں جتنی سیاسی قومی یا ملی تحریکات بروئے کار آئیں۔ ان کا انداز اس اعتبار سے تخریبی تھا کہ ان کے سامنے محض ایک منفی نصب العین تھا یعنی انگریز کا ملک سے اخراج۔ اس کے لئے انھوں نے قوم اور ملک کی تعمیر کو اساس بنانے کی بجائے محکوم قوموں کے حق آزادی کا سہارا لیا۔ چنانچہ ہر تحریک بنیادی طور پر نحلا استیلا شکست و ریخت اور نعرہ بازی کی منفی قوتوں پر منحصر رہی انگریز کے ملک چھوڑ جانے پر ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ تمام مشکلات از خود حل ہو جائیں گی لیکن تعمیر کے لئے جس عزم، استقلال اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے اس کا احساس کسی نے دلایا ہی نہیں تھا۔ لے دے کے اقبال کا تعمیر خودی کا نظریہ سامنے آتا ہے جس کے فلسفے پر تو ہم تحقیق و تفتیش اور نقد و جرح کے لئے تیار ہیں لیکن اس سے کوئی عملی منصوبہ وضع نہیں کرتے۔ اس کے ساتھ ترقی پسند تحریک نے ایک غیر ملکی سیاسی فلسفے اور آدرش کو اپنانے کی کوشش کی لیکن ایمان و ایقان کی کمی اور تجدد ان مخصوص حالات کی عدم موجودگی جن میں اشتمالیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے یہ تحریک اعتقاد کی بجائے ذہنی خلفشار اور سماجی انتشار ہی تک محدود رہ گئی۔ تقسیم ملک سے پہلے جدید شاعری نے بھی اس مجموعی تاثر کا ساتھ دیا۔ ہنگامی موضوعات چھوٹی چھوٹی سی کیفیات سنسنی خیز واردات اور ان کے ساتھ ساتھ نئے نئے سانچوں کا شوق اس شاعری کا کل سرمایہ ہیں۔ ایک محدود گروہ نے البتہ عوام پسندی سے ذرا بچ کر آگے نکلنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کے دو واضح اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں ایک تو فنی پختگی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ان کے ہاں ہلکی پھلکی نظموں کی جگہ اب آہستہ آہستہ طویل نظموں کے حق میں ایک

رجحان نمو پا رہا ہے، جن میں شعوری گہرائی، خیالات کی تنظیم اور واردات کی پختگی جھلکنے لگی ہے۔ فنی اعتبار سے ابتدائی تجرباتی دور کی طفلانہ دلچسپیوں کے مقابلے میں اب ایک تعمیری روایت کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ جس کے ثبوت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس قسم کی نظموں میں تجربات کو مجتمع اور منتظم کرنے کے لئے اور ساتھ ہی فنی سانچے کے ارتقاء کو بس میں لانے کے لئے محاتی وجدان کافی ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے لئے بہتر فنی شعور کی ضرورت ہے

جدید ادب کو روایت کے ساتھ تعلق کی بنا پر جس طرح اوپر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے سن کر آپ کے ذہن میں خیال پیدا ہوا ہوگا کہ عام طور پر جدید شاعری کے متعلق کچھ اور ہی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً جدید نظم میں تسلسل ملتا ہے۔ اس میں بحر نئے طریقے سے استعمال کی جاتی ہے تو ردیف ترک کر دیا گیا ہے سانیٹ کینٹو۔ نظم معریٰ اور نظم آزاد کے تجربے کئے گئے ہیں۔ یہ سب باتیں نظم کی ہیئت کے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ تسلسل ہے۔ تسلسل تو آخر پرانے شاعروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔ غزل کے علاوہ نظم کی دوسری اصناف بھی تو موجود تھیں۔ مثلاً مثنوی ہی کو لیجئے۔ جس میں اتنی بڑی بڑی داستانیں نظم کی گئی ہیں۔ لیکن تسلسل کا جدید تصور اس تصور سے کسی قدر مختلف ہے۔ قدیم نظموں میں ان مثالوں کو چھوڑ کر جہاں واقعاتی تسلسل موجود ہو، بالعموم ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ قصیدے وغیرہ میں تسلسل کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا تھا کہ پوری نظم ایک مرکزی کیفیت کے مختلف روپ بیان کرتی چلی جاتی تھی۔ لیکن یہ تسلسل مرکزی خیال کے ارتقاء پر مبنی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ کسی شہر آشوب میں آپ ایک بند کہیں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ رکھ دیجئے تو بالعموم نظم کی معنویت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ "شکوہ اور جواب شکوہ" میں بھی یہ تجربہ کر سکتے ہیں۔ دراصل اس کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ جدید نظم کا تسلسل تجزیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ آپ ایک کیفیت یا ایک تجربے کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس کی مختلف کڑیوں کو ان کے اپنے مخصوص ارتقائی تسلسل کے حوالے سے نظم میں ایک خاص جگہ پر بٹھاتے ہیں۔ اس لئے جدید نظم میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آپ اس کے

مصرعوں یا بندوں کی ترتیب کو تو بدل دیں لیکن اس کی معنویت پر اثر انداز نہ ہوں۔ جدید نظم خواہ مختصر ہو یا طویل، ایک اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں پرانی نظم کئی چھوٹی چھوٹی اکائیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جن میں باہمی ربط ہوتا تھا لیکن یہ ربط ان کے داخلی ارتقاء کا آئینہ دار نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح نظم ہو یا غزل، ہر شعر بلکہ ہر مصرعہ اپنی جگہ مکمل ہوا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ پرانی شاعری میں ہر کیفیت کو اس کے منطقی مرادفات سے وابستہ کرنا ضروری تھا۔ لیکن جدید نظم میں ایک کیفیت کو اس کے داخلی اور خارجی متعلقات کے ساتھ ساتھ جوں کا توں پیش کر دیا جاتا ہے اور اسے نام دینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

بحر کے سلسلے میں عظمت اللہ خاں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ہم عروضی نظام کو ترک کر دیں اور اس کی بجائے ہندی پنگل کو اپنا لیں۔ اسی طرح اس نے بندوں کی ہیئت کی طرف بھی توجہ دلائی تھی۔ عروض میں تو کوئی بنیادی تبدیلی ابھی تک واقع نہیں ہو سکی۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ بحر کے مروجہ سانچوں میں ہم نے تخفیف کو جائز قرار دے لیا ہے۔ ایک مصرع کے وزن کو دو مصرعوں میں تقسیم کر لیا ہے یا مصرعوں میں وزن کو گھٹا بڑھا لیا ہے۔ قدیم نظم میں یہ بالعموم تو رائج نہیں تھے لیکن بعض صنعتیں ایسی ضرور تھیں جن میں مصرعے گھٹا بڑھا لئے جاتے تھے مثلاً نظم اس طرح لکھی جاتی تھی کہ اس کے مصرعے یوں گھٹیں بڑھیں کہ انھیں ایک دوسرے کے نیچے لکھا جائے تو صراحی کا خاکہ بن جائے۔ اسی طرح بحر طویل تھی جو ایک رکن کی غیر معین تکرار پر مبنی تھی۔ مغرب سے ہم نے جو سانچے لئے ہیں ان میں سے سانیٹ تو مقبول نہیں ہو سکی۔ البتہ نظم معریٰ اور نظم آزاد رائج ہیں نظم معریٰ میں ہم صرف اتنا کرتے ہیں کہ قافیہ کو ترک کر دیتے ہیں لیکن یہ التزام اب بھی رکھتے ہیں کہ مصرع خیال یا گرامر کی رو سے اپنی جگہ مکمل ہو۔ قافیے کے علاوہ روایت سے دوسرا انحراف یہ ہے کہ جدید نظم میں بنیادی اکائی شعر کی بجائے مصرع کو قرار دیا ہے اور عروضی اعتبار سے پورے شعر کے وزن کی بجائے بنیادی عروضی رکن کو اکائی ٹھیرالیا ہے۔

نظم آزاد کے لئے دراصل عروضی وزن کا التزام ضروری نہیں۔ یہ اپنے وزن کا ڈھانچہ معنوی اور جذباتی نشیب و فراز سے وضع کرتی ہے۔ ہمارے ہاں نظم آزاد بھی فی الحال عروضی

[illegible] ہے [illegible] میں [illegible] جگہ مضمون یا خیال کو ایک مصرع میں بند کرنے کی [illegible] سے [illegible] اور دوسرے مصرعوں تک بڑھنے کا موقع دیتے ہیں لیکن مصرعوں کی [illegible] بالعموم [illegible] اپنی مرضی [illegible] ہوتی ہے۔ اس کے لئے اگر تک کسی معنوی یا عروضی [illegible] پابندی [illegible] نہیں ہو سکے [illegible] میراجی طویل مصرعوں کو ترجیح دیتا ہے تو [illegible] [illegible] اختیار کیا ہے

[illegible] علاوہ [illegible] تبرا اور کمپو، خسرو کی طرف کبھی متوجہ [illegible] میں نظم معریٰ اور نظم آزاد کو اپنی اصول [illegible] کر [illegible] ہے۔

[illegible] توقع ضرور والبتہ ہوتی ہے کہ [illegible] کو یہاں [illegible] وسیع معنوں [illegible] ہیں۔ بلکہ ہر تجربے [illegible] اور قافیہ [illegible] [illegible] نہیں ہوتی بلکہ [illegible] کبھی مدنظر رکھتی ہے۔ [illegible] مطابق [illegible] دلالت کرتا ہے کہ اب خزاں رسیدہ پتوں کو [illegible] پتوں کی تمنا کو سینے سے لگا بیٹھ [illegible] قبلی طریق کار میں [illegible] جو جدید اسلوم کا مایہ الامتیاز ہے۔ اور انھیں بالخصوص [illegible] فلسفہ [illegible] کلاسیکی [illegible] جدید علوم سے [illegible] آگاہ تو نہیں ہوئے [illegible] کے تاثر سے [illegible] واقف ضرور ہو چکے ہیں [illegible] ادب کی [illegible] خصوص [illegible] رہبری کی ہے تخلیقی طریق کار کو اپنا کر انھوں نے جدید شاعر کا امتیازی [illegible] اس مسلک کی توضیح لسانی ارتقا کے نقطۂ نظر سے کی ہے۔ جدید نظم میں [illegible] تجریدی کا انداز آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ تجربے سے ارتقائی [illegible] سے نظم کا سانچہ اخذ کرنے کی کوشش نمایاں ہو چلی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

ناسخ کی منسوخ شاعری

اس دور میں جبکہ مذاق سخن ہمارے میرؔ، آتشؔ اور غالبؔ کی شاعری کے حق میں ہمہ گیر قبول و تسخیر عام کی فضا پیدا کر رہی ہے، ناسخؔ کی شاعری پر کچھ کہنا اور اس کے حق میں کچھ کہنا بڑی جرأت کی بات ہے۔ اور شاید میں بھی یہ جرأت نہ کرتا اگر مجھے رہ رہ کر یہ خیال نہ آتا کہ ہم کہیں ناسخؔ کے ساتھ ناانصافی تو نہیں کر رہے۔ کیونکہ ان کے سارے کلام کو کلام منسوخ سمجھ لینے کی رسم عام ہو جانے کا یہ نتیجہ غیر منصفانہ ہے کیونکہ بہرحال وہ ایک مسلم الثبوت استاد ہیں اور شعرائے اردو کا ایک اہم خاندان ان سے منسوب اور وابستہ ہے۔ اور بعض شعراء جو ان کے سلسلے کے نہیں تھے وہ بھی ان کو مانتے تھے۔ خود غالبؔ کے لئے بھی کچھ عرصے تک ان کی شاعری جاذب توجہ رہی۔ اس رتبے کے شاعر اور استاد ... آخر اس کی شاعری کے کسی پہلو کے حق میں کچھ نہ کچھ کہنا تو ممکن ہونا ہی چاہئے ——— صحیح ہے کہ وہ روایات جن سے وہ ناسخؔ پہچانے جاتے ہیں خود ہی آج بڑی حد تک منسوخ ہو چکی ہیں اور شاعری کے متعلق ہمارا ادب کا نقطۂ نظر بھی بڑی حد تک بدل چکا ہے۔ مگر ناسخؔ کا کلام تمام تر قابل منسوخ نہیں اور قدیم اساتذۂ ادب کے مطالعے کے وقت یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم ناسخؔ کے بارے میں کچھ بھی نہ کہیں یا کہہ کر آگے بڑھ جائیں کہ چھوڑیے ناسخؔ میں کیا رکھا ہے۔ ان کے یہاں تو کام کے شعر صفحوں کے صفحے الٹنے کے بعد کہیں ایک آدھ ہی نظر آتا ہے!

میری دانست میں یہ کافی نہیں۔ اس طریق مطالعہ سے ہم ناسخؔ سے ہی نہیں اپنے مطالعۂ ادب سے بھی ناانصافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ناسخؔ نے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک جگہ حاصل کی۔

ہوئی ہے۔ لہٰذا اس کے مقام کی تعیین ہونی چاہیے تاکہ یہ سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو جائے کہ ناسخ نے اُردو شاعری کو کیا کچھ دیا؟ یا کم از کم یہ کہ آج ہم ناسخ سے کیوں رُوٹھے ہوئے ہیں؟

اس خیال کی توفوری تردید کی جاسکتی ہے کہ ناسخ کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ دبستانِ لکھنؤ کے امام تھے اور یہ ایسا جرم ہے جو کسی حال میں معاف نہیں کیا جاسکتا۔ لکھنؤ کا اگر کوئی دبستان تھا تو اس کی تقصیرات کے واحد ذمے دار ناسخ ہی نہ تھے اس میں تو بیسیوں بڑے اور صدہا چھوٹے شعراء دوسرے بھی شریک تھے۔ اور جو گناہ ناسخ سے یا شعرائے لکھنؤ سے منسوب کئے جاتے ہیں ان گناہوں کا آغاز لکھنؤ سے ہی کیوں ہو؟ اس کے اوّلین قصوروار تو بعض ایسے بزرگ بھی تھے جو دہلی سے ہی متعلق تھے۔ وہیں کی تربیت پائے ہوئے تھے اور ابتداً انھوں نے اسی ماحول میں داغ دار اشعار کہنا شروع کئے تھے۔ بدمذاقی کسی ایک خطّے سے مخصوص نہیں وہ تو زہر گیاہ کی طرح ہر جگہ نمو پاسکتی ہے۔ دہلی ہو یا لکھنؤ، غزنی ہو یا صفاہان، اخلاقیات کا انحطاط کسی ایک مکان و مقام تک محدود نہیں۔ بعض بڑی نیک نام کتابوں میں بھی بدنام اشعار یا گنہگار نظمیں موجود ہیں۔ مرشد روم کے یہاں "کیر و کدو" کی حکایت۔ نظامی گنجوی کے یہاں "میم مطوق الف کرنی است" کی سی ناشنیدنی پھبتی، سنائی غزنوی (جن سے صوفیانہ شاعری کی روایت چلتی ہے) کے یہاں "کارنامۂ بلخ" کی فحش حکایت اور اسی طرح درجہ بدرجہ فارسی اُردو شاعری کے مختلف ادوار میں سوقیت و ابتذال کی مثالیں کوئی چھپی ہوئی باتیں نہیں جن کی تشریح کے لئے مثالوں کی ضرورت ہے۔

ان حالات میں بطورِ خاص لکھنؤ کو اس جرم کا گنہگار خصوصی قرار دیدینے کی ایک عادت سی ہوگئی ہے اور یہ عادت تاریخی ذمہ داریوں سے بھی بعض اوقات بے نیاز ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ فرق دہلی کے فحش کلام اور لکھنؤ کے فحش کلام میں صرف اسی قدر ہے کہ لکھنؤ میں عورتوں سے عشق بازی کی بات کھلے بندوں انداز میں منظوم ہونے لگی تھی، وہی باتیں دہلی میں مردوں کی شان میں صاف طور پر بیان ہوتی رہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورتوں کے بارے میں خاصا نازک احساس رہا ہے۔ اور آج دراصل یہی احساس ایک خاص حد تک لکھنؤ کی بدنامی کا ذمہ دار ہے ورنہ اس

معاملۂ خاص میں (نسبت اور مقدار کا فرق تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔) تقصیر تو دہلی و لکھنؤ دونوں سے ہی سرزد ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ان حالات میں غریب امام بخش ناسخ کو محض اس وجہ سے منسوخ شاعر قرار دینا صحیح نہ ہوگا کہ وہ لکھنؤ کے بعض مبتذل شعری عناصر کے نمایندہ نہ تھے۔

اُردو شاعری کی تاریخ میں ناسخ کو بہرحال ایک خاص اہمیت کا مالک قرار دینا پڑے گا خواہ اس کی بنیاد ان کی شاعری پر نہ سہی۔ ان کے تصورِ شاعری کا یہ اہم عقیدہ خصوصاً غور کے قابل ہے کہ ان کے نزدیک شاعری کے لئے ایک خاص قسم کی ادبی زبان کا ہونا لازمی ہے۔ ان کے تصور کی شاعری کوئی ایسی شے نہیں جو صرف جذبے کے مواد سے تعمیر کی جا سکتی ہو گویا شاعری کے لئے خاص زبان کی ضرورت ان کے نزدیک بنیادی ضرورت ہے۔

یہ سوال کہ شاعری کی کوئی خاص زبان ہوتی بھی ہے، ایک متنازعہ فیہ سوال ہے۔ شاعری کا وہ نظریہ جو تجربے ہی کو شاعری کا اوڑھنا بچھونا قرار دیتا ہے۔ تجربے کی ماہیت سے جُدا کسی خاص زبان شعری کا قائل نہیں۔ مگر اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب میں زبان کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا ایک ایسا اصول ہے جس کے بغیر تجربہ کامل اظہار و ابلاغ سے قاصر و ناکام رہ جاتا ہے کیونکہ جب تک زبان کے ایسے سانچے مہیا نہ ہوں جو مقتضائے حال کے مطابق اظہار میں کامل سمجھے جائیں۔ اس وقت تک تجربے کا بے زبان رہنا یقینی ہے۔ ان وجوہ سے ایک خاص حد تک ادب اور شاعری کے لئے ایک خاص قسم کی زبان کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ناسخ کا اصل کارنامۂ ادبی یہی ہے کہ انھوں نے ادبی زبان کی تصحیح و توسیع کے لئے خاص کوشش کی اور شستہ مذاق کی تشفی کے لئے الفاظ ثقل اور گرانی اور حروف کی صوتی خوبیوں اور خرابیوں کے توسیقی اُصولوں پر خاص زور دیا۔ اس بارے میں قدیم بلاغت کا فن ان کے سامنے تھا۔ اسی کی بنیاد پر انھوں نے الفاظ کی فصاحت اور کلام کی بلاغت کے قاعدے وضع کئے اور ان کو لکھنؤ کی زبان پر استعمال کرتے ہوئے ذوقِ سامعہ کی تربیت کے سامان پیدا کئے۔ یوں انھوں نے ایک طرف شاعری کو صحت لفظی سے پیوند دیا اور دوسری طرف شاعرانہ ذوق کو ناگوار آوازوں کے

بجائے صوت خوش اور لفظ درست کا ربط قائم کیا۔

یہ تسلیم ہے کہ کسی نابغہ کا تخلیقی جوش لفظ اور صوت کی ان پابندیوں کا بطور خاص روادار نہیں۔ بسا اوقات بڑے شاعر اور ادیب ایسے الفاظ اور ایسے اصوات کو کام میں لاتے ہیں جن کی موسیقی سے عام کان پہلے سے مانوس نہیں ہوتے۔ بڑے شاعر اپنے لئے نئے الفاظ و اصوات کے ساتھ ساتھ اپنے لئے کان بھی پیدا کر لیا کرتے ہیں۔ مگر دنیا میں سب شاعر بڑے شاعر نہیں ہوتے اور سب بڑے شاعر ایسے بھی نہیں ہوتے جو اپنے لئے اپنی خاص زبان کے بھی خالق ہوں۔ شاعری اور ادب میں [illegible] کے لئے ایسے سانچے پہلے سے [illegible] موجود ہوتے ہیں جن کو تشکیلی تحقیق خیال کیا جا سکتا ہے اور جن [illegible] عام قسم کے شاعر بلا تکلف استعمال میں لا سکتے [illegible]۔

[illegible] اصلاح زبان کا سلسلہ [illegible] کے دور کے اختتام کے بعد شمالی ہندوستان میں شاہ حاتم [illegible] سے شروع ہو کر [illegible] میر [illegible] کے زمانے [illegible] پایۂ [illegible] مرحلہ آتش و ناسخ کے دور [illegible] اس میں [illegible] دو اصول خاص طور پر مدار عمل نظر آتے ہیں۔ اوّل زبان کے [illegible] کی صحت، دوم [illegible] کی فصاحت کیونکہ فارسی [illegible] کی ترکیب بے علمی کی علامت تو ہے ہی بعض اوقات۔ گو ارصوت کی ذمہ دار بھی ہوتی ہے [illegible] القاظ [illegible] اوقات ان لطافتوں [illegible] رہتے قاصر رہتے ہیں جو کسی [illegible] کے لئے لازمی ہوتے ہیں۔ ناسخ کے اصول بھی یہی تھے اور انھوں نے ان اصولوں [illegible] خوش آواز [illegible] اور علمی ثقاہت [illegible] پایہ تکمیل [illegible] کی [illegible]۔

ناسخ کی [illegible] دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شاعری کے [illegible] لفظ کی فصاحت کو بنیادی اہمیت دی۔ انھوں نے شعر کے ڈھانچے کو زیادہ مکمل [illegible] تاکہ اس میں کوئی جھول نہ پڑے اور اس کی موسیقی با اصول اور مرتب ہو [illegible] متفرق [illegible] مانوس [illegible] جائے۔ اس میں کوئی پیچیدگی، کوئی ابہام [illegible] پیدا نہ ہو۔ ناسخ کا طرز زبان [illegible] کسی طرح کی

زبان خاص نہیں بلکہ اپنے زمانے کے شستہ مذاق لوگوں کی مشترک زبان ہوتی ہے۔ ناسخ ہی کے ذریعہ اُردو شاعری اور اردو ادب کی زبان نے اپنا آپ پہچانا اور اس نے فارسی قواعد کے بیشتر مستعار انداز اور ہندی سنسکرت کے نہ جذب ہونے والے اصوات و تراکیب کو یکسر مسترد کرتے ہوئے شاعری میں خالص اُردوئیت کا حق جتلانا شروع کیا۔

یہ ہے تو ناسخ کا ایک خاص ادبی کارنامہ لیکن اگر کوئی تنقیص پر آجائے تو کہہ سکتا ہے کہ ناسخ کا یہ احسان شاعری پر احسان نہیں بلکہ صرف شاعروں پر احسان ہے اس لئے کہ ان کی ان لسانی اصطلاحات سے اردو شاعروں نے جتنا فائدہ اٹھایا اس سے کہیں زیادہ نقصان اس اصول بندی اور زبان دانی ضابطہ بندی سے ان کی اپنی شاعری کو پہنچ گیا۔ ناسخ گویا ساری عمر زبان کو سنوارتے اور اپنی شاعری کو بگاڑتے رہے اور یہ رائے شاید کچھ زیادہ غلط بھی نہیں۔ ناسخ جو خصوصاً مذاقِ جدید کے معیار سے آتش سے بہت پیچھے رہ گئے تو اس کا باعث بھی یہی تھا کہ ان کی شاعری ان کے قواعدِ لسانی کے تابع سی ہو گئی تھی۔ اس پر ان کی زندگی کے مشاغل بھی کچھ کم ذمے دار نہ تھے۔ وہ عمر بھر سیاست کے بکھیڑوں میں رہے۔ ان حالات میں ان کی شاعری "جزویست از پیغمبری" کا مصداق بنتی بھی تو کیسے؟ وہ اس خلوصِ دل سے محروم رہے جس کے مراقبوں میں الہامِ شعری پرورش پاتا ہے۔ وہ ریاضت کے اس گداز سے بھی محروم رہے جس سے انسان محرومیوں اور ناکامیوں کو اپنے لئے سرمایۂ ادراک و بصیرت بناتا ہے۔ وہ بے دلی کے اس فیض سے بھی تہی دامن رہے جس میں نومیدی جاوید تک بھی آسان بن جاتی ہے۔ جہاں اُمید و ناامیدی کی درمیانی سطح بہت ہی باریک رہ جاتی ہے۔

میری حقیر رائے میں ناسخ کا المیہ یہ نہیں کہ وہ عمر بھر زبان کی تہذیب و تنقیح میں منہمک رہ کر محض علمی مشغلے کے آدمی بن کر رہ گئے بلکہ ان کا حادثہ ان کی وہ سیاسی زندگی بھی ہے جس میں ان کے کردار کو خلوصِ ضمیر کی قربانی بھی دینی پڑی اور وہ شاعری سے شاطری کرتے رہے۔ جہاں تک فطری قابلیتوں کا تعلق ہے۔ اگر زمانہ مختلف ہوتا تو وہ لکھنؤ کے دوسرے سودا بن سکتے تھے مگر لکھنؤ کی معاشرت میں دہلی کا احساساتی پیوند لگنا قدرے مشکل تھا۔ وہ ناسخ تھے اور ناسخ ہی رہے۔

اور یوں رفتہ رفتہ منسوخ ہو گئے۔

ناسخ کے مزاج کی یہ خصوصیت بڑی نمایاں ہے کہ وہ دماغی عمل کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ جذباتی ردِ عمل اور جذباتی فکر سے ان کی طبیعت بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے تخیل کی راہیں بھی دماغی ریاضت کے خیابانوں میں کھلتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون آفرینی اُن کا میدان خاص ہے۔ وہ عام جذبے کی بات بھی دماغی تخیلات کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔ جذبے کا پیغام جذبے کی زبان سے جذبے تک کم ہی پہنچایا گیا ہے۔ وہ وہم و خیال کے عجائب خیز پیوندکاری کے تجربے کرتے رہے۔ جن کی غایت یہ تھی کہ آیا ہم حقیقت سے کتنے دور رہے۔ ہم فطرت سے کتنے اونچے اڑے۔ انھوں نے موہومات کی فضا میں لفظی پتنگ بازی خوب کی۔ خوب کی۔

دنیا کے اکثر ادبوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کسی دور میں بعض اسباب سے صحیح شاعرانہ تحریک انحطاط پذیر ہو جاتی ہے اور شاعروں کے دل تجربہ و درد سے خالی ہو جاتے ہیں تو اس وقت ایسی جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو اوّل معانی و تجربات سے زیادہ ادائے معانی کی صورتوں پر خاص زور دیتی ہے۔ دوم وہ حقیقی مضامین کی بجائے ایسے مرعوب کن خیالی اختراعات پر متوجہ ہو جاتی ہے جن تک پہنچنے کے لئے جذباتی ادراک و احساس سے دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔ یہی چیز اُردو فارسی شاعری میں مضمون آفرینی اور معنی یابی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس طرز شاعری میں لفاظی، کھوکھلاپن اور معروضات و موہومات پر انحصار ضروری ہو جاتا ہے۔ حقائق سے بُعد اس کی سب سے بڑی سرحد کمال سمجھی جاتی۔

ناسخ کی طبیعت نے بھی اس میدان کو پسند کیا۔ ان کا مقصد قاری کے جذباتِ درد اور جذباتِ جمال کو ابھارنا نہیں تھا۔ نہ کوئی تصویر دکھانا بلکہ وہ قاری کے استعجاب، اس کی قوتِ وہم اور ملکۂ حیرت کو ابھار کر اس کو ششدر کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کے مضامین دور "کو سن کر واہ واہ کر اٹھے اور حیرت زدہ ہو کر اعلان کر دے" کتنی دور پہنچا ہے شاعر کا تخیل!"

زیادہ مثالیں تو اس مضمون میں سما نہ سکیں گی۔ صرف چند اشعار ہی وضاحت کے لئے

کانی ہوں گے۔ کہنا یہ ہے کہ اے محبوب جب تو گلشن میں آکر نقاب کو الٹتا ہے تو پھول کا رنگ تیرے رعب حسن کے باعث متغیر ہو جاتا ہے۔ بات سادہ تھی کئی اور شاعروں نے بھی اس مضمون کو ادا کیا ہے مگر مانوس اور موثر انداز میں۔ مگر ناسخ کو سادہ اظہار کی ادا کبھی نہیں بھائی وہ اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

تو جو خورشید ہے الٹے جو گلستاں میں نقاب

چہرۂ گل میں تلون ہو وہی حربا کا!

واضعین قواعد کی قسمت میں یہ محرومی ازل سے لکھی تھی کہ وہ جس فن کی اصلاح و تہذیب کے لئے قوانین وضع کرتے ہیں ان پر خود عمل کرنے کی ہمت ان میں باقی نہیں رہتی۔ خلیل بن احمد عروضی کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔ تمام عمر شاعری کو درست کرتے رہے مگر کام کا ایک شعر بھی کبھی نہ لکھ سکے۔۔ مندرجہ بالا شعر میں تلون اور حربا کے الفاظ غریب و وحشی نہ سہی، غزل کی لطافت کے نقطۂ نظر سے بڑے ہی ناگوار الفاظ ہیں۔ مگر شاعر بیچارہ شاعری سے زیادہ مرعوب کن الفاظ کی جستجو میں تھا۔ چہرے کے تغیر کے لئے حربا سے کم تر شکار ان کی نظر میں شاید صید زبوں ہی ہوتا۔ مضمون کتنا لطیف و جمیل ہو سکتا تھا مگر چہرۂ گل کو حربا صفت بنانے کے شوق میں سارا جمال ضائع ہو گیا، اور تشبیہہ بھی کیسے بد رنگ، کریہہ المنظر جانور سے دی ہے! اسی وجہ سے یہ شعر ناکام رہا۔ اب حسنِ محبوب کی توصیف کے متعلق ایک اور شعر بھی ملاحظہ ہو۔

ہر اک انگلی ہے اس کی شمع کافور

ہتھیلی اک بلوریں شمع داں ہے

تشبیہیں خوب ہیں مگر مبالغہ یہاں بھی کیفیت پیدا کرنے میں مانع ہوا ہے۔ تاہم یہ شعر غنیمت ہے۔ مگر یہ شعر دیکھیے۔

دیکھ اپنے روئے آتش ناک کی تاثیر کو

تیرے نقشے نے جلایا کاغذ تصویر کو

روئے آتش ناک کی ترکیب سے لے کر کاغذِ تصویر تک کسی شے سے جمالِ رخ کی اصلی کیفیت

نمایاں نہیں ہو سکی۔ صرف ہمارے فکرِ استعجاب کی قدرے تسلی ہوتی۔

نہ لائے عالمِ بالا سے کیوں طوبیٰ کے مضموں کو
خیالِ قامتِ موزوں ہے میری طبعِ موزوں کو

غضب ہے سرو نے دیکھا اس پری کے قدِ گلگوں کو
یہ لیں تے غرنے ناموزوں کی مصراعِ موزوں کو

ذرا دیکھے کوئی ابرو تو سمجھے قدرتِ شاعر کی
لکھا ہے مصحفِ رُخ پہ خدا نے بیتِ موزوں کو

یقیں ہو آپ جن کو مثال اس کا قد میں لکھا
کروں کیوں کر بیاں میں یہ تیری زلفوں کے مضموں کو

بڑھ گیا مجھ کو تصور جو قدِ موزوں کا آج
جو کھُولا ہے میری سطروں میں اک شمشاد ہے

یہ سب اشعار وصفِ حُسن کے ہیں اور غنیمت ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ان سے توصیفِ حسن کا حق ادا نہیں ہوا۔ جس طرح مصوری کے بعض دبستان اظہاری نہیں، اخفائی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ناسخ اظہار سے زیادہ اخفا میں اعتقاد رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے ——— صاف نقوش اور خط و خال ان کے بس کی چیز نہیں۔ وہ طلسم کی دنیا کے معمار ہیں۔ حقیقت کی مانوس دنیا سے کوہ قاف کے دیوؤں اور پریوں کے قلعے تعمیر کرتے ہیں!

یہ مانا کہ یہ طلسم انگیزی اور عجوبہ زائی انھیں کی مخصوص ملکیت نہیں۔ فارسی اور اُردو کے

بعض اُردو شاعروں نے بھی اس کو اپنایا ہے۔ طلسم انگیزی میں بیدل اور غالب بھی کسی سے کم نہیں۔ مگر ایک بڑا فرق جو مثلاً غالب اور ناسخ میں ہے وہ یہ ہے کہ مرزا غالب کا بیان جیسا بھی ہو وہ حقیقی تجربات واحساسات کا ہم عنان رہتا ہے جو اُن کے ہر قسم کے اشعار میں ظاہر ہو کر رہتے ہیں!

انھوں نے دُنیا کو احساس کی عینک سے دیکھا ہے اور قلب و نظر کے سچے مشاہدات کو بیان کیا ہے۔ (خواہ طلسمی طرزِ بیان میں یا حقائق کے انداز میں) ان کے پیچیدہ سے پیچیدہ اشعار سے کوئی نہ کوئی جذباتی یا جمالیاتی حقیقت ضرور نکلتی ہے مگر کیا ناسخ کے اشعار سے جذبے کا کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے؟ شاید نہیں ---!

فارسی کے جن شاعروں نے مثالیہ لکھا ہے ان میں صائب اور غنی (اور کلیم وغیرہ) بہت مانے جاتے ہیں۔ مثالیہ میں ہزار خرابیاں سہی مگر ایک خوبی ان میں ضرور ہے کہ اس سے زندگی کی بعض حقیقتوں کا اظہار ہو جاتا ہے اور اشعار بہرحال کچھ سچائیوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

فروتنی است نشانِ رسیدگانِ کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

پہلے مصرعے میں ایک اخلاقی نقطہ اور زندگی کا ایک اعلیٰ سبق ہے۔ دوسرے مصرعے میں زندگی کی ایک عادت اور رسم ہے جو واقعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اکثر اچھے مثالیہ اشعار میں یہی خوبی نظر آتی ہے کہ اس میں غیر حقیقی رشتوں سے شعر کا تانا بانا تیار نہیں ہوا بلکہ حقیقت اور واقعہ بہرحال موجود ہے۔

ناسخ کی شاعری میں مثالیہ کے اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں مگر ذہن کو عجوبہ آفرینی کا شوق ہے۔ اس لئے مثالیہ میں بھی یہ عادت ترک نہیں ہوئی۔ اس شعر میں مثال کی منفیانہ شان ملاحظہ ہو

سخت دل جو ہیں انھیں محروم رکھتا ہے فلک
بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا

مثال غلط نہ سہی اندازِ بیان وہی اخفائی ہے جس کا ناسخ کو خاص شوق ہے۔ خیر ——— مثالیہ کے اشعار میں پھر بھی براہِ راست اظہار کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ مگر ان کی باقی شاعری میں اخفا کا

شوق اس درجہ بڑھ ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ناسخ کا بس چلتا تو وہ اپنے اشعار کے لئے کوئی طلسمی رسم الخط ایجاد کرتے۔ مگر کیا کرتے لکھنؤ کے شاعروں میں غزلیں بھی پیش کرنی تھیں اس لئے رسم الخط ایجاد نہیں کیا نئے یعنی انوکھے معانی ہی ایجاد کرتے رہے اور ہر روز مبالغوں کے قلعے ، معانی کے کوہ قاف اور مضامین کے بحرِ ظلمات ابھارتے رہے۔ انھوں نے ان نقاط پر خاص کے لئے رنگوں کی بے ہنگم ریزش اور کیفیتوں کی بے ربط آمیزش سے طلسمات کی دنیا بسائی ہے۔ صرف کبھی کبھی اس ہوائی جہاز کی طرح انسانی بستی کے دھندلے سے نشان بھی دور سے دکھائی دیتے ہیں جو ذرا بہت دور آسمان کی دھندلی بلندیوں میں اڑ رہا ہو اور کبھی کبھی زمین پر بھی نظر ڈال لے کر دیکھی ہے۔ اب ان کے بعض ہجر کے شعر دیکھئے۔

وہ شوقِ فتنہ انگیز اپنے خاطر میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ سے نکلے ہے قیامت حسن کے ارماں کا

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم وائے بیدردی!
فلک کو گر بگوڑ جا لگا خاکِ شہیداں کا!

بس یہی حقائق کو منقلب کرنے کی عادت تھی۔ جہاں ناسخ کی ان کمزوریوں یا سینہ زوریوں میں سے ہے جن کو ان کے دور کا ایک خاص طبقہ کمالِ ہنروری کے نام سے یاد کرتا تھا اور کہتا تھا حُسنِ تعلیل نے کیا شان دکھائی ہے مگر جب حُسنِ تعلیل منطقی صداقتوں کے دشمن کی حیثیت سے صف آرا ہونے لگے تو شاعری اور کذبِ صریح میں کچھ فرق نہیں رہ جاتا۔ شاعری مصوری نہیں رہتی، مسخ تصویر بن جاتی ہے۔

"گل رعنا" کے مصنف نے بالکل برمحل لکھا ہے کہ "طبیعت قصیدوں سے مناسب

تھی مگر خدا جانے اس کا شوق کیوں نہ تھا ————————"

ناسخ کی غزل میں بھی قصیدے کی سج دھج ہے۔ ان کو "قصیدہ نگار غزل گو" کہہ دینے کو جی چاہتا ہے۔تغزل کے درد و لطافت سے ان کی غزل خالی ہے۔ انھیں تو زمانے کے رواج نے غزل گو بنا دیا تھا ورنہ کسی اور زمانے میں ہوتے تو پارعب قصیدہ نگار ہوتے۔ غزل میں اُنھوں نے قصیدے کے انداز کے جو اسالیب تیار کئے ہیں وہ انھی سے خاص ہیں۔

اس سے ان کی غزل کو جو ذرا سا فائدہ ہوا ہے وہ یہ کہ ان کی غزل کا لب و لہجہ مردانہ اور قوی ہو گیا ہے۔ اگرچہ یہ بطور خاص کوئی خوبی نہیں تاہم ایک انفرادی بات ضرور ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ آتش کی آواز میں ایک ستم زدہ آدمی کی گفتگو کی طرح رقت اور ترحم طلبی ہے ہماری اکثر شاعری پہ یتیمی، انفعال اور بے کسی کے لہجے غالب ہیں۔ ناسخ کی غزل کو پڑھ کر یتیمی اور ستم زدگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی تواناہی فراوان ہے اس سے یہ احساس تو ہوتا ہے کہ ہمارے شاعروں میں کوئی تو ایسا تھا جو زندگی کے سامنے تن کر کھڑا ہو سکا۔ پھر ناسخ کے کلام میں وہ زیرکی اور دانش مندی بھی ہے جو صرف "بزرگانِ قبیلہ" کے حصے میں آتی ہے۔ یعنی عام اخلاقی باتیں جو حُسنِ معاشرت کے لئے مفید ہوتی ہیں اور خاندان کے بزرگ اکثر اپنے طویل تجربات زندگی کے نام سے خوردوں کے سامنے پیش کیا کرتے ہیں۔ میں ناسخ کی اس زیرکی کو غنیمت خیال کرتا ہوں۔ اس وجہ سے کہ ان کی شاعری سے انسان عملی زندگی کے لئے کچھ حاصل تو کرتا ہے۔ مگر ناسخ کے اخلاقیات میں بھی کاوش یا ریاضت کے آثار کچھ زیادہ نہیں ملتے۔ یہ خیال کہ نیکی نیکی ہے اور برائی برائی۔ کوئی اتنی بڑی دریافت نہیں اور اگر ہو بھی تو کسی شاعر کا فرض ان دریافتوں تک ہی محدود نہیں، شاعر کی حیثیت سے اس کا فرض یہ ہے کہ ان دریافتوں کو اس طریق سے پیش کرے کہ وہ اس کی ذہنی ریاضت کے نتائج اس کے احساس سے گزرے ہوئے افکار نظر آئیں اور ان میں تجربۂ انسانی کی توسیع کے نشانات موجود ہوں۔ ناسخ اس تصویر کشی کے لئے حُسنِ تعلیل کا سہارا ڈھونڈتے ہیں جو اکثر ایک کمزور سہارا ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ حُسنِ تعلیل میں سچی مشابہتیں بہت کم بلکہ مفقود ہوتی ہیں۔ اس میں تو فریب مشابہت ہوتا ہے مثلاً

بدخصلتوں کو کرتا ہے پالا نشیں فلک　　　اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

مشابہتوں کے اس فریب میں کتنی گمراہی پائی جاتی ہے۔ دیکھیے اس کے برعکس صائب کے اس شعر میں اس گمراہی سے بچنے کی کوشش کس طرح کی گئی ہے:

افسردگاں بعالم بالا نمی رسند
این آب ہائے مردہ بدریا نمی رسند

تمثیل کے دونوں حصوں میں ایک تجربہ ایک مشاہدہ یا ایک حقیقت بیان ہوئی ہے اور دونوں میں مشابہت ہے مگر یہی۔ فریب اور گمراہی کسی جگہ نہیں۔ غالب کا یہ اُردو شعر بھی ذہن کو حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں!

یا مثلاً اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر:

سختیِ طبع پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

اس میں شعر کی دونوں اطراف حقیقت سے لبریز ہیں۔ بخلاف ناسخ کے شعر کے جس کی حسن تعلیل میں حقیقت کا رشتہ نہیں پایا جاتا: بدخصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک: اونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ۔ یہ درست ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام عظمت اور اونچائی بدخصلتوں کے حصے ہی میں آتی ہے یا بدخصلت ہمیشہ سرفراز ہی ہوتے ہیں۔ اس میں حقیقت سے بھی توجہ ہوی۔ ناسخ کے علاوہ اور بھی جن شاعروں نے حُسنِ تعلیل سے زیادہ کام لیا اچھا نہیں کیا۔ شاعری کے حق میں بُرا ہی کیا ہے۔

ناسخ کی شاعری کی سب سے بڑی کمزوری اگر ہے تو یہی کہ ان کا ذہن حقائق اور فطرت سے اس قدر منحرف ہے کہ وہ سیدھی سادی فطری باتوں کو بھی مسخ کرکے ان کو حقیقت سے اتنا دور لے جاتے ہیں کہ ان کی تصدیق عقل تو کیا کرے گی وہم بھی بعض اوقات ششدر و حیران رہ جاتا ہے کہ یا الٰہی یہ کس دنیا کی باتیں ہیں کہ میری بھی ان تک رسائی نہیں۔ مضمون کو حقیقت کا

پکا دشمن بنا دینا یہ ناسخ کا کمال ہے۔ کہتے ہیں کہ ناسخ کی شاعری سے غالب بھی چندے متاثر رہے اور اس کا اقرار غالب نے خطوں میں کیا بھی ہے۔ اگرچہ اس اقرار میں یہ بھی کیا ہے کہ نشتر زیادہ تر آتش ہی کی شاعری میں ثابت کئے ہیں۔ ناسخ کے یہاں بھی غالب کو نشتر نظر ضرور آئے ہیں مگر وہ کس قدر ہیں اور کہاں پڑے ہیں، اس کے متعلق بڑی کاوش کی ضرورت ہے۔

جہاں تک نشتر کے معنی ہم جانتے ہیں نشتر سے مراد وہ اشعار ہیں جن کی تاثیر میں صحت بخش درد کی ایسی کیفیت موجود ہو جو دردانگیز ہونے کے باوجود ذوق انسانی کے لئے حظ اور صحت کا پیغام بھی لاتی ہے۔ ایسے دردانگیز اور مسرت بخش اشعار ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے بھی جائیں تو سوچنا پڑے گا کہ ان میں کتنے واقعی نشتر ہیں اور کتنے کند نشتر۔ یہ اپنے اپنے ذائقۂ درد پر موقوف ہے۔

ناسخ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ جلاوطنی کے زمانے میں انھوں نے جو غزلیات لکھی ہیں ان میں یہ نشتر چھپے ہوئے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کیونکہ ایسے ہی دور میں انسان زندگی کے تضادوں اور ذاتی حوادث کے مصائب کو زیادہ محسوس کیا کرتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے بعض اشعار میں درد کی خفیف سی ٹیس محسوس بھی ہوتی ہے مثلاً :-

سنسان شکل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ — شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

لے چلی ہے وطن سے وحشت دور — اب سے نزدیک موت آئی ہے

ہم میکدے میں آئے تو خالی نظر پڑے — رہتے تھے خم شراب کے اوّل بھرے ہوئے

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

مگر اس قسم کے اشعار میں بھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل سے کچھ روٹھے ہوئے ہیں یا دل ان سے روٹھا ہوا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا جدا جا رہے ہیں، ان کو اپنے دل کی کچھ زیادہ

سے واسطہ ہے: اس کی ادائیں ان کو بھاتی ہیں ——— کیوں؟ اس لئے کہ ان کی نظر اکثر گل گشت چمن میں الجھی رہتی ہے۔ وہ دل کی ان طفلانہ حرکتوں کو محض بے ادبی خیال فرماتے ہیں۔ اس کے رونے بلکنے کا انھیں احساس کم ہی ہوتا ہے۔ دیکھئے ذیل کی غزل میں کچھ رحم بھی آیا ہے تو دل کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟

اس ابر میں یار سے جدا ہوں — بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں
گل ہوں اگر تو ہوں میں بے برگ — بلبل ہوں اگر تو بے نوا ہوں
دن رات تصور پری ہے — دیوانہ میں ان دنوں بنا ہوں
گو بیٹھ رہا ہوں ایک جا ایک — پامال بسان نقش پا ہوں
افسردہ خاک ہوں ولیکن — میں سایۂ شہپر ہما ہوں

اہل ذوق ساری غزل ملاحظہ فرمائیں۔ ساری غزل پڑھ کر یہ گمان نہیں گزرتا کہ واقعی شاعر کا اولین شعر اس کے دل کی سچی کیفیت کا اظہار کر رہا ہے۔

اس ابر میں یار سے جدا ہوں — بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

خصوصاً جب کہ اس غزل سے ما سبق غزل بھی اس قافیہ و زمین میں ہے۔ اس میں بھی طبیعت کی ”دھوپ چھاؤں یا لے دے راجی“ کا اظہار ہے۔ مگر اصل رنگ طبیعت اس شعر میں ظاہر ہو ہی گیا ہے:

ہنس دوں گا دم میں مثل گل آپ — غنچے کی طرح سے گو خفا ہوں

ناسخ ایک مطمئن دل کے آدمی ہیں ——— زندگی کی ”بے بقائی“ نے بھی انھیں متاثر نہیں کیا۔ طبع ”درتی“ ہوئی۔ سیر مطمئن، زندگی میں انھیں کوئی تضاد نظر نہیں آیا، روح میں کوئی پیاس، کوئی تشنگی نہیں، کسی شے کی کمی انھیں ستا نہیں رہی۔ وہ بقول خود:

بے منت سایۂ ہما ہوں

بلکہ یہ بھی تکلف ہی کیا ——— وہ تو خود ”ہما“ ہیں ——— ہما!

بات دراصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ قدرت نے انھیں غزل کے لئے پیدا نہیں کیا تھا۔

وہ قصیدے کے آدمی تھے۔ زمانے نے انھیں زبردستی غزل گوؤں کی صف میں لا کھڑا کیا
قصیدہ لکھتے بھی تو کس کے لئے ——— ؟ اور اتنی فرصت بھی کہاں سے لاتے۔ قصیدہ زیادہ
فرصت کا متقاضی ہے۔ ان کی زندگی سیاسی جوڑ توڑ کی زندگی تھی۔ اس میں مکمل قصیدوں کی
تعمیر کے لئے وقت کہاں سے نکالتے۔ غزلوں میں ہی قصیدے لکھا کئے۔ زمانہ آتش کی غزل سے
لذتِ درد حاصل کرتا ہے بس ناسخ کو بھی غزل کے نام سے کچھ لکھنے کی مجبوری تھی سو لکھتے رہے۔
لکھتے رہے اور دفتر پریشاں مرتب ہو گیا۔

مگر ایک جواب طلب سوال پھر بھی باقی ہے اور وہ یہ کہ مرزا غالب سے ناسخ کا کیا ذہنی رشتہ
تھا جس کے باعث غالب جیسا "بخود مشتعل" شخص ناسخ کا لوہا مانتا رہا۔ یہ سوال معمولی نہیں،
اہم ہے۔ کیونکہ یہ ناسخ سے زیادہ غالب کی فکر صمیمیت کا سوال ہے جس کی صمیمیت پر شبہ کرنا اب
کسی کے بس کی بات نہیں۔

یہ تو معلوم ہے کہ غالب نے بیدل کو بھی سراہا اور بقول بعض اس کا تتبع بھی کیا۔ اگر یہ صحیح
ہے تو ماننا پڑے گا کہ غالب کی یہ پسندیدگی بیدل کی دردمندی کے کسی رخ کی وجہ سے نہیں۔ نہ غالب
اور بیدل کی غزلیات میں بڑی اور قابل ذکر مماثلیں پائی جاتی ہیں۔ پس بیدل کے لئے پسندیدگی کا
ایک سبب بیدل کا وہ ہیبت افزا اور تعجب انگیز اسلوب بیان ہے جس کی عمارت بڑی رعب دار
ہے اور اس کے لہجے اور آواز میں بڑی مردانگی اور توانائی ہے۔ یہ غالب کے نفس و باطن کا خاصہ
ہے کہ وہ مری ہوئی آوازوں اور ڈھیلی ڈھالی اور سست بنیاد عمارتوں اور تخلیقوں کا کبھی مدّاح
نہیں ہوا۔ درد کا طالب بھی ضرور ہوا مگر تند و تیز اور شدید اور الیم درد کا طالب ہوا معمولی درد و دل
کی گاہکی اس کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ رعب، شدت، اور مردانگی اور جارحانہ فعلیت کا شاعر ہے۔
باطن ہو یا ظاہر اسے زوردار یا استعجاب و حیرت میں ڈالنے والے کوائف سے دلچسپی رہی ہے۔
زندگی کی عام روش میں بھی اور ادب و شعر و تنقید میں بھی!

ناسخ کے پاس اور کچھ ہو یا نہ ہو وہ رعب دار اور حیرت انگیز تصویریں خوب بناتے ہیں جن سے
"ناطقہ سر بگریباں" اور "خامہ انگشت بدنداں" اور مخاطب کا ذہن مبہوت ہو۔ ناسخ پر سودا کی طرح

قدرت نے دو بڑے احسان کئے تھے۔ اوّل انھیں پُرزور تخیل کا مالک بنایا تھا، دوم انھیں ایسا دل دیا تھا جو رونا نہیں جانتا تھا ہنسنا ہی جانتا تھا۔

ہنس دوں گا دم میں مثل گل آپ　　غنچے کی طرح سے گو خفا ہوں

یہ دونوں احسان ناسخ کے کام آئے۔ ان کے پرزور تخیل نے موہوم خیالی تصویروں کا ایک ایسا نگارخانہ بنایا جس کی نظیر کہیں اگر ملے گی تو سودا کے یہاں ہی ملے گی (حقیقی تصویریں نہیں موہوم خیالی تصویریں ہیں جو حقیقتیں منقلب نظر آتی ہیں۔ بالکل نئی دنیا نئی مخلوقیں، نئے گل، نئے شگوفے، نئے خار، سب کچھ نیا، سب کچھ عجیب و غریب —— سب کچھ عجیب و غریب) ان تصویروں سے ہم مانوس نہ ہوں، پھر بھی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اس نگارخانے میں پہنچ کر حیرت اس درجہ غالب آجاتی ہے کہ چشم تماشا دوست کو اپنے اوپر ایک طفل متحیر کا گمان ہونے لگتا ہے جیسے کوئی کسی حیرت آباد میں پہنچ کر یہ نہ سمجھتے ہوئے بھی کہ کیا ہے پھر بھی حیرت میں غرقاب سا ہو جاتا ہے۔ ناسخ کے تصویر خانے میں پہنچ کر ناظر کو کسی ایسی ہی وادی میں پہنچ جانے کا احساس ہوتا ہے۔ حقیقتوں کو منقلب صورتوں میں پیش کرنے والی شاعری صرف ناسخ تک ہی محدود نہیں ہے۔ دبستان عربی فارسی شاعری میں بھی موجود رہے ہیں بلکہ نثر بھی اس سے متاثر ہوئی اور یہ شاعری یا نثر صرف اردو فارسی عربی تک ہی محدود نہیں بلکہ مغربی آرٹ اور فن مصوری کے بعض دبستان بھی اس قسم کے منقلب اور اخفائی اظہار کے تصوریہ قائم ہیں اور پھر یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ اس رجحان کا مالک شاعر یا فن کار لازماً کمزور فن کا مالک ہوتا ہے۔ اس قبیل کے فن کی افادیت پر لاکھ اعتراض وارد ہوتے ہوں تب بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فن وہ فن ہے جس پر کمزور اور حقیر قلم یا "موقلم" کا مالک فن کار کبھی قادر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے توانا اور زبردست خلاقی کی ضرورت ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناسخ بھی ایک زبردست خلاق فن ضرور تھے۔

ناسخ کی خلاقی کی یہ صفت آتش کے مقابلے سے اور بھی واضح ہو سکتی ہے۔ آتش صاف اور قدرے سیدھے انداز میں بات ادا کرتے ہیں اور مقصود کسی حقیقت کا بیان یا کسی حقیقت کا

تصویر کھینچا ہوتا ہے۔ دل کے جذبے اُن کے مضمون میں رنگ بھرتے ہیں اور شاعر اپنے شب و روز کے احساساتی تجربات کے اظہار میں مجبور سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک حکمت، ایک تجربہ ہے جس کا بیان یا جس کی تصویر اس کے مدنظر ہے۔ یوں اپنے دور کے مذاق اور شاعری کی پختہ رسوم کے تحت وہ بھی ادبی بات یعنی "خیال کو منتقل کرنے والی بات" سے بچ نہیں سکا اور خلاقی کا کمال دکھانے پر اتر آتا ہے۔ مگر یہ سب جذبۂ مسابقت اور ادبی زور آزمائی کے خیال سے تھا ورنہ آتش صاف صاف انداز سے حقیقت کا بیان یا حقیقت کی واضح سی مصوری کرنے کے عادی ہیں۔ ناسخ ان کے بالکل برعکس سیدھے انداز میں بات کبھی کبھی کرتے ہیں محیر العقول ایجادات واختراعات کا شوق، پیچیدہ انداز کا شوق، طبیعت کا رنگ اصلی ہے۔ وہ صاف استعاروں کی بجائے مجاز مرسل اور ایہام تناسب کی پیچیدہ اور قیاس مع الفارق صورتوں سے ادبی کوہ قاف سے بھی ادھر کے دیوزاد دل۔ اور جنوں پریوں کی تصویریں بنا کر شاعرانہ شعبدہ گردی کا کمال دکھاتے رہتے ہیں اور اس میں ان کا مقابلہ شاید سودا بھی نہیں کر سکتا۔ اب ملاحظہ فرمایئے دو تین شعروں میں آتش و ناسخ کا فرق خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ آتش کہتے ہیں:

دکھائی حُسن نے قدرت خدا کی، آئے جوبن پر
چراغِ طور کا عالم ہے تیرے رُو ئے روشن پر
نقاب اُلٹے جو تو رخسارِ آتش ناک سے اپنے
پھر پروانے آ رہے جلیں شمعوں کی گردن پر

اسی زمین میں ناسخ نے فرمایا ہے:

نہیں ہے سبزہ خطِ عارضِ محبوب پر فن پر
ہوئے ہیں جمع پروانے یہ آکر شمع روشن پر
بنائے سمن و گل ساق بوریں پائے رنگیں ہوں
کبھی نا ... گزر ہو اس پری کا میرے مدفن پر

آتش کے شعر اول میں چراغِ طور کی تشبیہ نامانوس تو نہیں مگر تندرست بعید ضرور ہے تاہم

سارا شعر جمال محبوب کی دلفریبیوں کا نقش جمیل دل پر بٹھاتا جاتا ہے۔ شاعر کا بے تکلف بیان خود کہتا ہے کہ وہ زندگی کی منتشر جمالیاتی حقیقتوں سے محظوظ ہوتا ہے اور ان کے حسن کا اس پر اتنا اثر ہے کہ ان کی سادہ تصویر کو بھی اثر آفرینی کے لئے کافی سمجھتا ہے یہ سادہ تصویر سادہ بیان وزبان کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

دکھائی جس نے قدرت خدا کی آئے جوبن پر

'قدرت خدا کی دکھائی' میں کھیل کے لئے کیا کچھ نہیں ہے۔ اور پھر 'آئے جوبن پر' میں صرف 'آنے' کے لفظ پر غور کیجئے اور محظوظ ہو جیئے۔ یہ احترام، یہ تقدس، یہ پاکیزگی، یہ ادب، یہ تمکین! اور سچ یہ ہے کہ بقول میر

دور بیٹھا غبار میر ان سے	عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اس تمام پاکیزہ ماحول کے ساتھ چراغ طور کی پاک ومنزہ تجلیات نے روئے روشن کو جمال کی جس تقدیس سے آراستہ کر دیا تھا اس کا بیان نثر میں ممکن ہی نہیں۔ یہ دراصل جمالیاتی جذبے کے خلوص کا نتیجہ ہے۔

ناسخ کا شعر اول یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا جمالیاتی جذبہ یا تو مشکوک ہے یا سرے سے معدوم۔ وہ اپنے قارئین کو کسی جمالیاتی تاثر سے آشنا کرانا نہیں چاہتے۔ وہ اس سے نہ خود حظ حاصل کرتے ہیں نہ کسی فوری نسبی کو محسوس کرنا ان کا مقصد ہے بلکہ وہ اپنی "عمارت گری" کا کمال دکھانے کے لئے اپنی شعری عمارت کی موٹی موٹی اور گراں وزن اینٹوں کے ڈیل ڈول اور وزن وگرانی سے مرعوب کر دینا چاہتے ہیں۔

جس سے سبزۂ خط آ جائیں محبوب پُرفن پر

یہ مصرع کسی جمالیاتی یا جذباتی خلوص کا پتہ نہیں دے رہا۔ لکھنؤ میں رہ کر "سبزۂ خط" کی گفتگو بڑی ہی غیر قدرتی اور محض روایت پسندی ہے۔

لکھنؤ کا یہ 'محبوب پُرفن' صنف نازک سے متعلق ہوتا تو ناسخ کو کم از کم عشق بازی کی داد دی جا سکتی تھی۔ مگر ناسخ کو حقیقت سے ہٹ کر بات کو غیر حقیقی روایتوں اور رسموں اور

غیر قدرتی ہواؤں اور فضاؤں میں لے جانے کا اتنا عشق ہے کہ لکھنؤ کی عورت کو مرد بنا دینے پر تل جاتے ہیں۔

پھر یہ دیکھیے کہ "سبزۂ خط" کو جو شمع روشن کے پروانوں سے تشبیہ دے دی تو یہ نہ سوچا کہ شمع پر پروانے آ کر یوں بیٹھ تو نہیں جاتے۔ وہ تو اسی وقت جل بجھتے ہیں۔ آتے ہیں مر جاتے ہیں جمع نہیں ہوتے اس لئے حقیقت پسند شاعروں نے جب سبزۂ کا ذکر کہیں کیا بھی (ہر چند کہ وہ بھی مکروہ ہے) تو "مور خط" کہہ کر اس صورت کی تصویر کھینچی غرض یہ حقائق کو مسخ کر کے "خیال آشوب" تضاد پر گھڑنے کی عادت اس شعر سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس کی اس سے زیادہ تفصیل بے ضرورت ہوگی مگر زمانہ بھی بڑا جابر ہوتا ہے۔ وہ اپنی رسموں کو بجبر و اکراہ منوا کر ہی چھوڑتا ہے ناسخ سے آتش کے انداز منوائے تو آتش کو ناسخ کے انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ناسخ نے کہا:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

تو آتش بھی اس میدان میں یوں زور آزما ہوئے:

رواں رکھتا ہے خوں آنکھوں سے ہجر کہ مہ تاباں کا
شفق آلودہ رہتا ہے ہلال اپنے گریباں کا

اسی طرح ناسخ نے جب سادہ، صاف اور سچی سچی بات کہنے کا ارادہ کیا تو بڑے مزے کی بلند تاثیر کی باتیں کہہ گئے ؎

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سر زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

دشت غربت میں نگر اپنی جدھر جاتی ہے
نہ ہی کوچہ نہ ہی دیوار نظر آتی ہے

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

کہاں امید ترقی ہے جیتے جی ہم کو
سرشتِ خاک بھی تسخیر ہے بگولوں کی

ان اشعار میں ناسخ کی زبان سے شاید کوئی دل والا، سوچنے والا، محسوس کرنے والا شاعر بول رہا ہے ——— قصہ مختصر، ناسخ ایک خلاق تھے عجیب و غریب، اور حیرت میں ڈال دینے والی تصاویر و اشکال کے، جو حقیقت کی دنیا سے دور، سراب آباد وہم اور تحیر زار موہومات سے نسبت رکھتے ہیں۔ شاعری کو عالمانہ فصاحت اور فاضلانہ انداز بلاغت سے پیوند دینے والے اور زبان کو عربیت اور فارسیت کے معیار سے پاک و صاف کرنے والے، ان سب چیزوں سے گو کہ انھوں نے اپنی شاعری کو شاید سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ مگر اُردو کے دوسرے شاعروں اور انشا پردازوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ انشا پردازی اور شاعری کے لئے جس شدت کی ضرورت ہوتی ہے اور اظہار و بیان کے لئے جو استعداد ضروری ہے اس کے لئے ناسخ سبھی کے کام آئے۔ ان کے شاگردوں نے ان کے دبستان لسانی کو اور بھی فروغ دیا اور اس طرح شاعری اور مخصوص زبان کے رشتوں کی اہمیت اُردو زبان میں ایک تسلیم شدہ اصول بنائی جو مدتوں تک تنقید ادبی کا ایک اہم معیار بنی رہی۔ تا آنکہ جدید مذاق نے آکر زبان پر بیان کو اور بیان پر تجربات کو تقدم بخشا۔

وقار احمد رضوی

غالب

کسی ادیب یا فنکار کی نفسیات، خارجی عوامل کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کی انفرادیت کی قدریں ہی چاہے وہ مثبت ہوں یا منفی سماجی عناصر جھلکتے ہیں، کیونکہ انسانی ماحول فکری انفرادیت کا قدرتی سرچشمہ ہوتا ہے۔ غالب شعر و ادب کا ایک احساس جذبہ رکھتے تھے۔ شمس و قمر اور ستاروں کی یہ دنیا ان کے فن کے اجزائے ترکیبی کا محور ہے۔ ان کے دل گداختہ نے صرف شمع سخن ہی کو فروغ نہیں دیا بلکہ وہ نثرِ اُردو میں بھی ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط سے اُردو نثر کی تاریخ میں ایک اہم باب کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ ایک مشہور حقیقت ہے کہ جو لوگ احساسات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں ان کے لئے ان کی زندگی ٹریجڈی بن جاتی ہے اور سوچنے سمجھنے والوں کے لئے کامیڈی۔ غالب اپنے سینے میں حقیقتاً قوی احساسات رکھتے تھے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے احساس سے ان کا شعور زیادہ قوی تھا۔ انھیں جیسے جیسے زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہی ہوتی گئی۔ وہ اس پر مسکرانے لگے اور یہی ان کی شوخی و ظرافت کا اصلی راز ہے۔

اُن کے نغمہائے سرود کے نقش و نگار محض دلفریبی و شیرینی کے سراب نہیں بلکہ ان کا سینہ دلبرانِ جفا پیشہ کی فرہنگ بیداد و فہرستِ آرزو ہے۔ ان کا نہاں خانۂ دل تجربات زندگی کا آتشکدہ ہے۔ وہ طوفانِ حوادث کو "سیلی استاد" کے مترادف تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زخمِ تمنا عشرتِ پارۂ دل ہے اور لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی ہر آہ مرثیۂ دل اور ہر کراہ دیوانِ درد ہے۔ وہ بجائے خود ایک محشرِ خیال ہیں۔ لیکن ان کا دل حسّی قوتوں کا مرکز ہے۔ ان کے یہی احساسات نظم کی بہ نسبت نثر میں زیادہ واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے ان کے

حق یہ کہنا بالکل درست ہے کہ غالب کا مطالعہ محض اس لئے دلچسپ نہیں کہ انھوں نے دلگداز و پیارے شعر اور شگفتہ و شیریں نثر لکھی مگر اس لئے بھی کہ وہ ہمارے ادب میں قدیم و جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ہر نسل کو محبوب ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر غالب کے اُردو خطوط بھی رقعات سرور اور انشائے مادھورام کے طرز پر لکھے جاتے اور اُردو میں "[illegible] الی متقین"، "[illegible]" اور "دریائے لطافت" کی جو مقفیٰ و مسجع عبارت رائج تھی۔ اس کی بدولت شاید آج تک اُردو نثر غالب کی سادگی و پرکاری کی لذت و شیرینی سے ناآشنا رہتی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج سے چند غیر مقفیٰ و مسجع قسم کی عبارتیں سامنے آئی ہوتیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم کالج سے نہیں بلکہ قلعۂ معلّیٰ سے وابستہ ہے۔ اس وقت دلی میں بھی غلام امام شہید اور "آثار الصنادید" کے باب چہارم کے نثر کا آغاز ہو رہا تھا لیکن اس عہد کی اُردو نثر اور غالب کی طرز تحریر کا سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ غالب کے خطوط خالص اُردوئے معلّیٰ اور دلی کی ٹکسالی زبان کے آئینہ دار ہیں اور اس پر ان کے بیان کی منفرد ظرافت اور شوخیٔ طبع کی وہ گلکاریاں جو انھوں نے اُردو نثر میں کیں۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر غالب کے خطوط کو اُردو نثر کی تاریخ میں بہت اونچا مقام دیا جاتا ہے۔

نثرہائے غالب میں اگرچہ زیادہ تر خطوط اور رقعات، چند تقریظیں، دیباچے اور تین مختصر رسالے "لطائف غیبی"، "تیغ تیز" اور "نامۂ غالب" ہیں جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے گئے تھے لیکن ان سب میں خطوط غالب کو اہم مرتبہ حاصل ہے۔ یہ خطوط ان کی سنجیدہ ظرافت اور وارفتہ مزاجی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ "اُردوئے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" کے علاوہ ان کے باقی خطوط "مکاتیب غالب" اور "نادرات غالب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

ان خطوط کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے القاب و آداب، شکر و شکایت کے قدیم فرسودہ طریقۂ تحریر اور مسجع و مقفیٰ اندازِ بیان کو چھوڑ کر ایک صحت مند، دلکش سادہ مگر شوخ و برجستہ ذہن اُردو نثر کو دیا۔ جس کی شوخیٔ تحریر نے ہر "پیکرِ تصویر" کو کاغذی پیرہن پہنا دیا۔ غالب کا یہی صحت مند ذہن ایسی شگفتہ اور لطیف ظرافت پیدا کرتا ہے۔ جو ان کو ہر دیوار سے

یار اور یہ تدغن سے آگے لے جاسکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شوخیٔ فکر کی ہر تلخی میں کوئی شیرینی اور ہر شیرینی میں کوئی تلخی چھپی ملتی ہے۔ وہ اپنے خطوط کو "جان غالب" "فرزند دلبند" "میرے شفیق" "قبلہ" اور "حضرت" جیسے مختصر الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

غالب نے اپنی شوخیٔ ظرافت سے اُردو نثر کو خشکی و خشونت سے بچا لیا۔ اُردو میں اس سے پہلے اس قسم کی لطیف ظرافت تقریباً ناپید تھی۔ ان کی یہ ظرافت کبھی "تبسم زیرلب" سے آگے نہیں بڑھی لیکن یہ تبسم زیرلب برائے تبسم نہیں ہوتا بلکہ اس تبسم کے پس پردہ کسی' فرزانہ جہاں دیدہ' کی آتشیں آہوں کی لپیٹ ہوتی ہے جس پر سادگی و بے ساختگی کا نقاب پڑا ہوتا ہے اور یہ ان کے فکروشعور اور ہیئت کی پختگی کی بڑی دلیل ہے۔ غالب نے اپنی ظرافت سے سختی و سستی اور رنج و غم کو ہموار کیا۔ چنانچہ ان کی یہ شوخیٔ تعزیت کے موقع پر بھی نہیں جاتی۔ وہ ہجوم غم میں اپنا سکون و توازن نہیں کھوتے۔ اور موضوع دردناک ہونے کے باوجود وہ اپنے شگفتہ انداز بیان کو برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"بھائی صاحب! میں بھی تمھارا ہمدرد ہوگیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ میری پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھے بیٹا سمجھی تھی، مرگئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں گویا میرے نو آدمی مرگئے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا ایک باپ اور ایک دادا اور ایک دادی۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے۔"

غالب کی بڑی خصوصیتیں ہیں۔ وہ اپنے خطوط میں ایسی بات لکھتے ہیں کہ جس سے ان کا مکتوب الیہ محظوظ ہو چنانچہ انھوں نے ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء میں ایک خط لکھا۔ دوست نے اس خط کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو دیا۔ اس خط کے جواب میں غالب نے اپنے دوست کو لکھا :۔

"دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں کہ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں

بیٹھے ہو اور مزا یہ ہے کہ جب کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں نے تو دوسرے ہی دن جواب لکھ دیا تھا۔"

۱۸۶۳ء میں غالب نے اپنی تاریخ وفات "غالب مرد" کہی لیکن اتفاق سے اس سال نہ مر سکے۔ میر مہدی مجروح نے اپنے ایک خط میں وبا کا ذکر کیا تو اس کے جواب میں غالب نے انھیں لکھا:۔

"بھئی کیسی وبا؟ جب ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بریں وبا۔"

طنز اور غصے میں بھی غالب کا یہ رنگ باقی رہتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو بات ان کو ناگوار معلوم ہوتی ہے وہ اس کو بے تکلف کہہ دیتے ہیں لیکن تالیف قلوب کا پھر بھی خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تلخ گوئی میں بھی ایک حسن شوخی اور بانکپن ہے۔

غالب نے ۱۸۵۰ء کے بعد اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے۔ ان خطوط نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خود غالب بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے خطوط میں ہجر و وصال کے مزے اور زبان کے چٹخارے ہیں۔ غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا تو دیا لیکن وہ سوال و جواب کے موقع پر سائل و مجیب کے نام نہیں لیتے، البتہ ادائیگی جواب میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو سوال و جواب میں میز پیدا کر دیتے ہیں۔ مغربی طرز پر لکھے گئے قصوں، ناولوں، ڈراموں اور غالب بغیر نام بتائے اپنا مطلب ادا کر جاتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت اور بھی ہے وہ یہ کہ وہ اپنی تحریر میں کبھی کبھی مکتوب الیہ کو غائب بھی متصور کر لیتے ہیں۔

غالب کے اردو خطوط کا یہ رنگ جس طرح ان کے فارسی خطوط میں نایاب ہے اسی طرح ان کی اردو تقریظوں میں بھی نہیں ملتا۔ ان کی اکثر تقریظیں اس وقت کی مقفیٰ و مسجع نثر ہی میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ "گلزار سرور" اور "سراج المعرفت" کی تقریظیں اس کی شاہد ہیں۔

ان کے خطوط میں تبسم و ترنم، آہ اور آنسو دونوں ہیں۔ طبقاتی حالات، عصری مسائل، پرسکون فلسفۂ زندگی اور انداز تحریر کی شگفتگی نے ان کی تحریر کو حیات جاوید بخشی۔ اس عہد کے

معاشی اثرات، تمدنی رجحانات اور مظاہر زندگی کی روشنی میں بحیثیت حقیقت نگار کے ان کے شعور کا تاریخی اور مادی تجزیہ بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ ان خطوط میں ان کے تجسس پسند ذہن کی انفرادیت اور ذہنی میلانات کی روح بے نقاب دکھائی دیتی ہے۔ جہاں وہ اپنے زمانے کے عدم سے باخبر تھے وہیں بدلتی ہوئی دنیا کی نبض پر بھی ان کا ہاتھ تھا۔ "سخیز بے جا" یعنی غدر اور کلکتہ کے سفر نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ انھیں بنگال میں نشاۃ ثانیہ کی پھوٹتی ہوئی کرن اور نئی زندگی کے ہلکے ہلکے ابھرتے ہوئے نقوش دیکھنے کا موقع ملا اور نیا بنتا ہوا تمدن ابھرتا نظر آیا۔ تاج محل اور لال قلعے کے بعد کلکتے کے نیم فرنگی اور نیم ایشیائی شہر نے ان کے دل شوریدہ پسند پر وہ نقوش چھوڑے جن کا حسین تصور، تیر نیم کش بن کر ان کی یاد کے تاروں کو چھیڑتا اور انھیں کلکتہ کے سبزہ زاروں اور بتانِ خود آرا کی یاد آجاتی۔ بنارس کے مناظر فطرت نے ان کے احساس جمال کو تازہ کردیا اور اس طرح زندگی کے اس موڑ نے ان کو ادراک کی ان سرحدوں تک پہنچا دیا جہاں تک ان کے ہمعصروں کی رسائی نہ ہوسکی۔ غالب کے خطوط نے خلوت کو انجمن بنا دیا۔ اگرچہ وہ عیش امروز کو راحت فردا پر ترجیح دیتے تھے۔ عملی زندگی کی بجائے فکری آسودگی حاصل کرنے کی کوشش بھی انھوں نے کی۔ تاہم ان کی رجائیت میں ایک مضبوط توازن ملتا ہے۔ ان کے جذباتی توازن ہی کی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں ان کا ذہنی ارتقا نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے، جو نہ صرف عارفانہ رواقیت یعنی (STOICISM) بلکہ ان کی پاکیزہ ظرافت وجبلت کے مظاہر ہیں جو دوسروں کو ضیافت طبع اور تسکین ذوق کی دعوت دیتے ہیں۔

غالب کے خطوط خود ان کی زندگی کی تفسیر ہیں۔ ان میں ان کی بیقراری اور رات کی بیخوابی کی داستانیں ہیں۔ زندگی کی منفی قدروں کی بجائے فکر کی توانائی اور تخیل کی رعنائی ہے۔ وہ خوبانِ روزگار کے ستم ہائے بے جا کے نخچیر اور شکست آرزو کے ستم زدہ ہیں۔ ان کی تحریر میں حکایت بادہ و تریاق اور داستانِ کوہ بے ستون و کوہ کن ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کی تنہائیاں موت کی تاریکی سے زیادہ عظیم ہیں۔ کیونکہ زندگی ہر چند جیب دریدہ ہے اور خون آلودہ ہے۔ تاہم وہ فاتح بھی ضرور ہے۔ ان کے خطوط میں دار و رسن کی آزمائش ہے۔ جراحتوں میں ذوق گناہ کی کسک ہے۔

اور ارمانوں کی پکار ہے۔ غالب کی نثر ان کی زندگی کی حکایت خونچکاں کا خزینہ ہے۔

غالب کے بعد ان کے مقلدین و متاخرین نے ان کے رنگ کو بہت اپنانے کی کوشش کی، لیکن کوئی بھی اس وادیٔ پرخار کے آداب کا عرفان تمام حاصل نہ کر سکا۔ یہ درست ہے کہ ان کی علمی عظمت کی بدولت ادبیات نثر اردو معلیٰ تو بن سکی لیکن کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردوے معلیٰ نہ لکھی جا سکی اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب مقلدین کی بہ نسبت اپنے مزاج میں شگفتگی ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ قوت مشاہدہ اور مراسلہ نگاری کے متعلق ایک خاص نگہ انتخاب رکھتے تھے۔

غالب اگرچہ ایک انحطاط پذیر ماحول میں زندہ رہے تاہم ان کی فکر میں توانائی اور تازگی ہے اور ان کا تخیل بلند اور بے باک ہے۔ ان کا ذہن کئی تلخ حقائق سے دوچار ہوا۔ ان کا ماحول یاس پسند تھا لیکن ان کی فطرت رجائی تھی۔ خیال کی اور رنگ نشینی، فکر کی خلاقی اور شوخیٔ طبع نے ان کے شعور کی تشکیل کی۔ ان کی خلاقیٔ فکر، نقش گری، تندی نظر، اسلوب و سلاست منفرد شخصیت، ظرافت و بذلہ سنجی، نفسیاتی گہرائی، شوخیٔ بیان اور ان کے ایگو (EGO) ہی کے بنا پر اردو ادبیات عالیہ میں ان کا مقام ایک صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے بہت ممتاز ہے۔

چاند سے چہرہ پہ مخمور غلافی آنکھیں
سنگ مرمر کی حسیں طاقوں میں جلتے ہیں دیئے

آختر سندیلوی

غزلیں

اخترؔ انصاری اکبر آبادی

نہ غمِ فضا شناسی نہ غمِ خود آگہی ہے
یہ خودی کا مضحکہ ہے کہ جنونِ خود سری ہے

نہ ہے شام میں ملاحت نہ سحر میں تازگی ہے
مگر اب بھی مطمئن ہے یہ عجیب آدمی ہے

ہیں شہیدِ تیشۂ غم ابھی کوہکن ہزاروں
ابھی زندگی پہ طاری وہی جورِ خسروی ہے

جسے دیکھئے وہ بندہ جسے دیکھئے وہ آقا
نہ اصولِ بندگی ہے نہ شعورِ خواجگی ہے

نہ یقینِ شانِ یزداں، نہ ہے اہرمن کا مسلک
نہ سرورِ خود فریبی، نہ غرورِ گمرہی ہے

یہ چراغ زندگی کے ابھی دور تک جلاؤ
ابھی اور تیرگی ہے ابھی اور تیرگی ہے

یہ پیام مل رہا ہے مجھے ہر قدم پہ اخترؔ
اسے راہزن سمجھئے جسے زعمِ رہبری ہے

اختر الایمان

نیشِ غم خوابِ مسرت کا رقیب آج بھی ہے
خالِ رخ زلفِ سیہ میرا نصیب آج بھی ہے

جس کے نشتر سے مرا حال عجیب آج بھی ہے
پھر وہی دشمنِ جاں میرا طبیب آج بھی ہے

شورہ پشتوں کے لئے ویسے بھی دنیا ہے بہشت
بے اماں ویسے ہی بے چارہ نجیب آج بھی ہے

سنگ نوازی وہی شیوہ ہے جہاں سازوں کا
ابنِ مریم تہِ بیداد صلیب آج بھی ہے

اے خدائے مہ و پروین وفا ایک نظر
میرا دل عشق فروزاں کا نصیب آج بھی ہے

پنڈت ہری چند اختر

محبت میں تپاکِ ظاہری سے کچھ نہیں ہوتا
جہاں دل کو لگی ہو دل لگی سے کچھ نہیں ہوتا

یہ ہے برمشیت یا مری تقدیر ہے یا رب
سہارا جس کا لیتا ہوں اُسی سے کچھ نہیں ہوتا

کوئی میری خطا ہے یا تری صنعت کی خامی ہے
فرشتے کہہ رہے ہیں آدمی سے کچھ نہیں ہوتا

ترے احکام کی دنیا مرے اعمال کا محشر
یہاں میری وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

رضا تیری لکھا تقدیر کا، میری زباں کوشی
کسی کی دوستی یا دشمنی سے کچھ نہیں ہوتا

بہر عالم ترا جبرِ خدائی کارفرما ہے
ہمارے اختیارِ بندگی سے کچھ نہیں ہوتا

مرے دستِ طلب کو جرأتِ گستاخی دے یا رب
یہاں دستِ دعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا

اگر تیری خوشی ہے تیرے بندوں کی مسرت میں
تو اے میرے خدا تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

کمالِ آگہی حاصل ہوا تو یہ کھلا اختر
کہ دنیا میں کمالِ آگہی سے کچھ نہیں ہوتا

ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

علاجِ زخمِ دل کے واسطے مرہم نہیں ملتا
جو دو عالم پہ چھا جائے مجھے وہ غم نہیں ملتا

تری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تاروں کو بھی دیکھا
نہیں ملتا جوابِ دیدۂ پُرنم نہیں ملتا

سمندر کا ہو مد و جزر یا ظلمات کی راہیں
کسی سے بھی تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ملتا

نگاہ و دل میں وسعت ہو تو پھر کیا مل نہیں سکتا
وہ خود کم ظرف ہیں جن کو کوئی ہمدم نہیں ملتا

کہاں موقع کہ آسودہ ہو زاہد لذّتِ عصیاں
تری جنّت میں سب کچھ ہے مگر آدم نہیں ملتا

یہاں شامِ جوانی بھی ہے صبحِ زندگانی بھی
ہر اک شے بمبئی میں ہے مگر سنگم نہیں ملتا

کسی کی لن ترانی کا یہ مطلب تھا کہ اے موسیٰ
وہ ملتا ہے مگر قسمت سے اور پیہم نہیں ملتا

غمِ دنیا و عقبیٰ غرق ہیں جامِ سفالیں میں
تو پھر اعجاز کیا غم ہے کہ جامِ جم نہیں ملتا

تحسین الماس

[illegible] کے جلوہ ہائے درخشاں کی دیر ہے
اب ظلمتوں میں جشنِ چراغاں کی دیر ہے

[illegible] اپنا دل بھی کبھی ہر کلی کے ساتھ
تکمیل آرزوئے بہاراں کی دیر ہے

[illegible] رہے ہیں داغِ تمنا بہ طرحِ نو
بزمِ وطن میں جشنِ بہاراں کی دیر ہے

پھر دیکھ لفظ لفظ ہے اک داستانِ شوق
افسانۂ حیات میں عنواں کی دیر ہے

[illegible] زیبِ گلوئے ستم شعار
اعجازِ خاک و خونِ شہیداں کی دیر ہے

اُس محفلِ نشاط میں نغمے لیے ہوئے
الماس تجھ سے ایک غزل خواں کی دیر ہے

مظہر امام

ہونٹوں پہ تبسم ہے الم یوں تو بہت ہے
ہوں صبح بکف ظلمتِ غم یوں تو بہت ہے

اے کاش ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر
آرام ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے

کس کام کی ہے جب دلِ ساقی سے نہ چھلکے؟
ہونے کو مئے ساغرِ جم یوں تو بہت ہے

ہونٹوں تلک افسردہ انگور نہ آیا
ساقی کی نگاہوں کا کرم یوں تو بہت ہے

ہے پیچ و خم راہ صنم خانہ بدستور
آرائش گیسوئے صنم یوں تو بہت ہے

تیری نگہِ لطف بھی کچھ کم تو نہیں ہے
اے دوست! زمانے کا ستم یوں تو بہت ہے

سورج کے نکلنے پہ بھی رہ جائیں تو جانیں!
رشتے کو اندھیروں کا بھرم یوں تو بہت ہے

ہو آئیں امام آج ذرا اُن کی گلی سے
مشہور گلستانِ ارم یوں تو بہت ہے

انجم رُومانی

جس کے بال ہواؤں نے، جس کی چال ہوا
پھرے ہے اسکے کھوج میں کھولے بال ہوا

جگ بیتے اُن کو گئے، لیکن اپنے دھیان
وہی سلگتی شام ہے، وہی نڈھال ہوا

ہمے سُہلانے لد گئے، کہاں وہ پہلی بات
کہے پپیہا "پی کہاں" کھیلے حال ہوا

رنگ برنگی کیاریاں، کھلے نہ کوئی پھول
گیت نئی تانیں ڈالیاں، بے سُرتال ہوا

بھونرا جائے کلی کلی، ملے نہ رس کی بوند
بدلی ایسی باغ کی اب کے سال ہوا

جب دیکھو اٹکھیلیاں، جب دیکھو اک چھیڑ
آئی اور سہلا گئی پھول کے گال ہوا

تجھ میں کس کا رنگ ہے؟ تجھ میں کس کی باس
کلی کلی سے باغ میں کرے سوال ہوا

انجم کے من میں جلیں اُس کے نین کنول
خواب ہے جس کا چاندنی اور خیال ہوا

ابن انشاء

جب دہر کے غم سے اماں نہ ملی ہم لوگوں نے عشق ایجاد کیا
کبھی شہرِ بتاں میں خراب پھرے کبھی دشتِ جنوں آباد کیا

رہے بستیاں بن سبھی اپنے وطن، کہ تھا کتنے دنوں یہی جی کا چلن
جہاں حُسن ملا وہاں بیٹھ گئے، جہاں پیار ملا وہاں صاد کیا

شبِ ماہ میں جب بھی یہ درد اُٹھا، کبھی بیت کہے (لکھی چاند نگر)
کبھی کوہ سے جا سر پھوڑ مرے، کبھی قیس کو جا اُستاد کیا

یہی عشق بھی آخر روگ بنا، (کہ ہے چاہ کے ساتھ بجوگ بنا)
وہی بھول گیا جسے یاد کیا، بڑا من کے نگر میں فساد کیا

اب قربت و صحبتِ یار نہیں، لب و عارض و زلف و کنار نہیں
اب اپنا بھی میر سا عالم ہے، ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا

باقر مہدی

○

کون بھلا یہ کہتا ہے خود آ کے ہم کو منائیں آپ!
ٹوٹا دل اب کیسے جُڑے گا سچّی قسمیں نہ کھائیں آپ!
پتّھر سینے پر رکھ لیں گے، جیتے جی مر جائیں گے
آپ کو قاتل کون کہے گا کیوں ناحق گھبرائیں آپ؟
راہِ وفا پر چلتے چلتے اپنی عظمت بھول گئے تھے
چھوڑ دی ہم نے رسمِ پرستش، اب نہ کرم فرمائیں آپ!
سحر کیا، اعجاز کیا ہے، درد کا شعلہ برف بنا ہے
ترکِ محبت ہم کو مبارک کیوں ناحق پچھتائیں آپ؟
جوشِ جنوں کا دور نہیں ہے، دل کے سکوں کا دور نہیں ہے
غم ہے نیا کیسے کم ہوگا، آئیں آپ نہ آئیں آپ!
تشنہ بی کچھ اور بڑھی ہے، مینخواری کی دھوم مچی ہے
آخر ہم ہے رندِ بلا کش، کیسے پیاس بجھائیں آپ؟

○

بسمل سعیدی

حد بھی کوئی انتظار کی ہے — اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے
یہ عشق کی وضعِ زندگی ہے — دشمن سے بھی اپنی دوستی ہے
کیونکر رہے عشق بے تمنا — خود حسن کا مقتضا یہی ہے
ہم بےخبرِ عدم نہیں صرف — ہستی بھی فریبِ آگہی ہے
اللہ رے ظلمتِ شبِ غم — تاروں کی سیاہ روشنی ہے
دوزخ سے بھی ہے سوا بھیانک — عصیاں جو بہ شکلِ بندگی ہے
اللہ رے تری جفا کے انداز — سانچے میں وفا کے ڈھل گئی ہے
دل اُس سے سوا ہے آرزومند — جتنا اُسے آنکھ دیکھتی ہے
غنچہ دہنی تو کوئی دیکھے — آواز میں اک شگفتگی ہے
معصومیٔ حسن پر بھی کمبخت — یک عشق و ہزار بدظنی ہے
یاد اُنکی ہے دل میں اب بھی لیکن — آواز سی ایک دور کی ہے

الہام نہیں ہے وحیٔ بسمل
کیا شاعری بھی پیمبری ہے

پرویز شاہدی

○

دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بنانا ہے
آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بنانا ہے

ماہ و خور اُگانے ہیں، کہکشاں بنانا ہے
اے زمیں! تجھی کو اب آسماں بنانا ہے

شوق کے تسلسل کو داستاں بنانا ہے
اک جہاں مٹانا ہے اک جہاں بنانا ہے

ہیں مرے تصور میں اُن کے سُرخ رخسارے
اور اُنھیں سے دنیا کو گلستاں بنانا ہے

گل فروش تھا مالی، ہوگیا چمن خالی
آج پتے پتے کو باغباں بنانا ہے

اپنے سُرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں دے دو
بجلیوں کی یورش میں آشیاں بنانا ہے

باندھ کر کفن سر سے یوں کھڑا ہوں مقتل میں
جیسے سرفروشوں کا کارواں بنانا ہے

اپنے حُسن کا دے دو مجھ کو بولتا جادو
عقل کو محبت کا قدرداں بنانا ہے

آج اُن کی آنکھوں سے جھانکتی ہیں تلواریں
دل کی آرزوؤں کو سخت جاں بنانا ہے

تم مری نگاہوں میں ڈال دو نظر اپنی
دل شکن نظاروں کو دلستاں بنانا ہے

میری زندگی میں تم اپنی دلکشی بھر دو
وقت جیسے ظالم کو مہرباں بنانا ہے

○

پریم وار برٹنی

ہو گیا ہوں ہر طرف بدنام تیرے شہر میں
یہ ملا ہے پیار کا انعام تیرے شہر میں

تو نے جب پہلے پہل شرما کے دیکھا تھا مجھے
ہائے کیا رنگین تھی وہ شام تیرے شہر میں

ایک میں ہی تھا کہ اس عالم میں بھی زندہ رہا
مجھ پہ آئے سینکڑوں الزام تیرے شہر میں

اس قدر پابندیاں آخر یہ کیا اندھیر ہے
لے نہیں سکتے ترا ہی نام تیرے شہر میں

اب تو یادوں کے اُفق پر چاند بن کر مسکرا
روتے روتے ہو گئی ہے شام تیرے شہر میں

کب کھلے گا تیرے میخانے کا در میرے لئے
پھر رہا ہوں لے کے خالی جام تیرے شہر میں

کیا کبھی تو نے بھی سوچا ہے کہ دیوانہ ترا
ہو گیا کیوں اس قدر بدنام تیرے شہر میں

تیری عظمت نے کیا آذر کے فن کو شرمسار
یوں تو تھے کچھ اور بھی اصنام تیرے شہر میں

ہم نے دیکھا حُسن کو چھپ کر لہو روتے ہوئے
ہم نے دیکھا عشق کا انجام تیرے شہر میں

تیرے در پر ایک سجدہ کی اجازت بھی نہیں
زندگی ہے موت کا پیغام تیرے شہر میں

جانتا تھا کون مجھ سے شاعرِ گمنام کو
تجھ سے ہی روشن ہے میرا نام تیرے شہر میں

جب سُنہری چوڑیاں بجتی ہیں دل کے ساز پر
ناچتی ہے گردشِ ایام تیرے شہر میں

پھر چلا ہوں میں تری دُھن میں غزل گاتا ہوا
پھر کھلے ہیں گیسوؤں کے دام تیرے شہر میں

معین حسن جذبی

○

وہاں ہے حفظِ کتب معیارِ فضل و کمال — یہاں رسائیِ فکر و نظر کی قیمت کیا
یہاں ہے عقلِ فرومایہ محوِ سنگ زنی — یہاں جنوں کے گراں مایہ سر کی قیمت کیا
یہاں نہ شعر سناؤ، یہاں نہ شعر کہو — خزاں پرستوں میں گل ہائے تر کی قیمت کیا
یہاں دکھاؤ نہ اپنی متاعِ خونِ جگر — خزف پسندوں میں لعل و گہر کی قیمت کیا
یہاں ہے طولِ کلامی ہنر کا سکہ — یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا

زمانہ سازی کے انداز سیکھ لو جذبی
یہاں خلوص و گدازِ ہنر کی قیمت کیا

○

دانائے غم نہ محرمِ رازِ حیات ہم
دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم

ہاں اک نگاہِ لطف کے حقدار تھے ضرور
مانا کہ تھے نہ قابلِ صد التفات ہم

ہم خزاں سے کس کو مفر تھا مگر نسیم
کرتے رہے گلوں سے بکھرنے کی بات ہم

اے شمعِ دلبری! تری محفل سے بارہا
لے کر اٹھے ہیں سوزِ غمِ کائنات ہم

ڈھونڈا کئے ہیں راہِ ہوس رہروانِ شوق
دیکھا کئے ہیں لغزشِ پائے ثبات ہم

ان کے غموں کا ہائے سہارا نہ پوچھئے
کچھ پا گئے ہیں اپنے غموں سے نجات ہم

○

جگر مراد آبادی

آپ ہی حسنِ یقیں تسکینِ جان و دل سہی
مجھ سے وہ غافل نہیں ہے اُس سے میں غافل سہی

پھر بھی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اک سراپا ناز کو
زندگی میں ہر تجلی حسن کی شامل سہی

پھر بھی کتنی دل نشیں ہے پھر بھی کتنی دل فزا
حُسن کی ایک ایک ادا ظالم سہی قاتل سہی

جو بھی مل جائے محبت میں وہی انعامِ دوست
لطفِ محرومی سہی کیفِ شکستِ دل سہی

عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا جواب
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی، منزل سہی

کس کو ملتی ہے جگر یہ دولتِ بیدادِ دوست
لاکھ جامِ جم کے بدلے ایک ٹوٹا دل سہی

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ
موت بھی جرم زندگی بھی گناہ

میں چلا جا رہا تھا اپنی راہ
سامنے آپ آ گئے ناگاہ

کس کا شکوہ، کہاں کا حالِ تباہ
اُف وہ نازک سی زیرِ لب اک آہ

مجھ کو راس آ گیا غمِ جانکاہ
آپ زحمت نہ اب کریں للہ

میں بہر حال ہوں فراق نصیب
تو بہر رنگ ہے مرے ہمراہ

آپ پھولوں سے جھولیاں بھر لیں
ہم نے کانٹوں سے کر لیا ہے نباہ

میکدے میں کہاں جنابِ شیخ
آ ہی نکلے تو خیر بسم اللہ

جمیل مظہری

ترے آنسو ترے شاعر کی تمنا نہ بنے
آکے پلکوں پہ بھی شبنم ہوئے شعلہ نہ بنے

ان ستاروں کی اجالے میں ضرورت کیا ہے
جو اندھیرے میں چراغِ رہِ فرزانہ بنے

یہ وہ قطرے ہیں جو دریا میں ہیں دریا سے الگ
یہ وہ قطرے ہیں جو دریا میں بھی دریا نہ بنے

یہ اضطراب تو خیر اسی کی ہو گی
جو تجلی کی تجلی رہے پروانہ بنے

اب جہاں بھی ہیں مٹ جائیں گے یہ داغِ سیاہ
ان کی شامت تھی کہ خالِ رخِ لیلیٰ نہ بنے

مر تو صحراؤں میں بھی مٹتے رہے قربانِ سراب
ہم تو موجوں سے بھی عاشق لبِ دریا نہ بنے

مظہری وہ نفسِ سرد سے ہم بے مذاق
آنکھ کے پینے سے جو طوفان کا جھونکا نہ بنے

شبِ فراق نے کیا ایک آنے والی رات
ہمارے عالمِ جذبات کی خیالی رات

بنا کرے جو شعاعوں کے جال تیرے لئے
کہاں سے لاؤں تصور کی وہ جمالی رات

سوال یہ ہے کہ اب اور چاہتی کیا ہے
مرے اندھیرے دنوں سے تری اجالی رات

درازیِ شبستاں کی زلف کا سایہ
کسی نے دن کے اجالے میں بھی بلا لی رات

وہ بھیگے بھیگے خیالوں کا ابر دل پہ مرے
وہ اودی اودی گھٹائیں وہ کالی کالی رات

وہ اپنے دن کی سیاہی نہ چاند پر تھوپیں
جنھیں پسند نہیں ہے یہاں اجالی رات

اسی جہاں میں میسر چراغ بھی ہیں جمیل
ہوئی ہے میری سیہ بختیوں سے کالی رات

جلیل حشمی

گلچیں کو مالی کہلاتے دیکھا جب گلشن کے بیچ
رہ نہ سکے ہم شعلہ بجاں، بول اُٹھے ناداں بن کے بیچ

شور مچاتے خاک اُڑاتے کیوں نہ پھریں ہم راہوں میں
تیری محفل میں آئے تو رہ گئی من کی من کے بیچ

پھیلی پھیلی دھند میں جیسے ہو کوئی مینارۂ نور
تیرا بدن ہے یا کوئی مہتاب ہے پیراہن کے بیچ

سُلگ سُلگ اُٹھتا ہے یارو رہ رہ کر کیوں دشتِ خیال
اب کے غزالاں پر کچھ بیت گئی ہے شہرِ ختن کے بیچ

راہِ وفا میں سر کو اُٹھائے چلنا ہے کچھ ایسی بات
شمع جلا کر جیسے کوئی نکلے تیز پون کے بیچ

یا ہم لوگ کسی بے نام کھنڈر میں بستے ہیں حشمی
یا ڈھولک پر تھاپ نہیں پڑتی ہے کسی آنگن کے بیچ

شمس انجم اعظمی

نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں
کچھ بہانے مرے جینے کے لئے اور بھی ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی سی مگر غم سے ہے بھرپور ہوا
کئی بادل مری آنکھوں سے پرے اور بھی ہیں

عشق ہو ترے ہر داغ فروزاں کی قسم
میرے سینے میں کئی زخم ہرے اور بھی ہیں

زندگی آج تلک جیسے گزاری ہے نہ پوچھ
زندگی ہے تو ابھی کتنے مزے اور بھی ہیں

ہجر تو ہجر تھا اب دیکھئے کیا بیتے گی
اُس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں

رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائے گی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں

غم دوراں مرے بازوئے شکستہ سے نہ کھیل
مشغلے میری جوانی کے لئے اور بھی ہیں

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

درّوش صدّیقی

○

وہ اجنبی نگاہ بڑا کام کر گئی
شائستگی سے عمرِ تمنّا گذر گئی

آشفتگانِ عشق کی راہیں کچھ اور ہیں
کچھ دور ساتھ چل کے قیامت ٹھہر گئی

اک دردِ مشترک سے عبارت ہے زندگی
سب پہ گذر رہی ہے جو ہم پر گذر گئی

وہ سادگی کہ لغزشِ آدم کہیں جسے
تصویرِ خیر و شر میں عجب رنگ بھر گئی

اب تک نہیں ہے ہوش عروسِ بہار کو
وہ بوئے پیرہن ادھر آئی اُدھر گئی

ہم خلوتِ خیال سے نکلے تو کیا ہوا
تھا عالمِ خیال جہاں تک نظر گئی

اتنا بھی ہوش کس کو تری جستجو میں تھا
کب سرمُدکا کے گردشِ دوراں گذر گئی

دُنیا نہ اب سُنے گی صدائے شکستِ دل
جب خامشی ہی شرطِ محبّت ٹھہر گئی

کیا حُسنِ اہتمامِ مشیّت ہے اے دَروش
ترتیبِ حادثات سے دُنیا سنور گئی

○

ساجد رضوی

اہلِ جنوں تھے کل بھی پریشاں کل بھی خاک بسر تھے پھول
آج بھی کلیاں زخم بہ دل ہیں، آج بھی اہلِ دل ہیں ملول

ہم نے چمن میں گُل کاری کی، روز نئی راہیں ڈھونڈیں
تم نے تراشے گُل چینی کے، روز نئے آداب واُصول

ہم نے اُگائے جوشِ جنوں میں، صحرا صحرا گُل بوٹے
تم نے اُڑائی زُعمِ خرد میں، گلشن گلشن دُھول ہی دُھول

موسمِ گُل کا حال نہ پُوچھو، اب کے نرالا موسم ہے
شاخوں پہ کھِلتے ہیں شرارے، کھیتوں میں اُگتے ہیں ببول

خون سے سینچیں کیاری کیاری، داغِ جنوں انعام ملے
فصلِ بہاراں تیری خاطر یہ بھی گوارا وہ بھی قبول

ساغر نظامی

رت جگے ہم نے خمستاں میں منائے بھی تو کیا
شعلۂ مے سے چراغ اپنے جلائے بھی تو کیا

مستقل پیاس ہے اک عمر کا حاصل ساقی
رات دن جام و سبو ہم نے لنڈھائے بھی تو کیا

وہی آنسو ہیں اُن آنکھوں میں جو کل رات کو تھے
قہقہے قلقلِ مینا سے چرائے بھی تو کیا

گر پلائی تھی تو جی بھر کے پلائی ہوتی
ایک دو جام مشیت سے پلائے بھی تو کیا

آج بھی تیرے چمن میں ہیں خزاں کے سائے
اے صبا تو نے نئے پھول کھلائے بھی تو کیا

دستِ گلچیں سے نہیں آج بھی گلشن میں نجات
جوششِ رنگ نے کچھ پھول کھلائے بھی تو کیا

مستقل موت ہے جسموں کی مسلسل دوری
زندگی بن کے وہ رگ رگ میں سمائے بھی تو کیا

صبح ہوتے ہی مرے گھر میں اندھیرا ہوگا
چاندنی رات میں دم بھر کو وہ آئے بھی تو کیا

حاصلِ ساز ہیں مطرب وہی ٹوٹے ہوئے تار
ہم نے نغمات کے طوفان اُٹھائے بھی تو کیا

روحِ تخریب پہ قابو نہیں اے میرے ندیم
قصر و ایوان مری حکمت نے سجائے بھی تو کیا

میرے احساس میں پوشیدہ ہے نادیدہ خلیل
کچھ نئے بت مری جودت نے بنائے بھی تو کیا

اس کی تقدیر ہی بجھنا ہے سحر ہونے تک
کچھ دیے تابشِ انجم نے جلائے بھی تو کیا

سو حجابات اُٹھانے کا عمل جاری ہے
کچھ حجابات اگر ہم نے اُٹھائے بھی تو کیا

آئینہ ٹوٹ کے جڑتا ہے کہیں اے ساغر
دل کے ٹکڑے مری وحشت نے سجائے بھی تو کیا

آل احمد سرور

کوئی کانٹا گرچہ دامن سے الجھتا جائے ہے
کچھ چمن بندی کے ارماں پر تو رنگ آجائے ہے

ہر قدم پر خود ہی دیتی ہے بڑھاوا چشمِ دوست
عاشقی کا بار کب تنہا اٹھایا جائے ہے

تازہ تر رنگِ جہاں ہے طرفہ تر حسنِ بتاں
یہ مرا خونِ جگر کچھ کام تو آجائے ہے

اس کی قامت پر ابھی موزوں نہیں ہے یہ لباس
آدمی گو عقل کے سانچے میں ڈھلتا جائے ہے

کچھ نہ کچھ خوابوں کی مستی کا سہارا ہے ضرور
یوں حقائق کا علم کس سے اٹھایا جائے ہے

فکر کی جنت سفر کے پھول داغوں کی بہار
ان کے قدموں میں یہ سرمایہ لٹایا جائے ہے

زندگی کے زخم گویا شاعری کے پھول ہیں
یہ چراغ اکثر لہو سے بھی جلایا جائے ہے

یادِ ماضی کی ترنگیں فکرِ فردا کے طلسم
آدمی اب بھی کھلونوں سے بہلتا جائے ہے

یاد آتا ہے کوئی صحنِ چمن یا بامِ دوست
دیر تک کس سے فضاؤں میں بھی ٹھہرا جائے ہے

یہ ہے داغوں کا کرشمہ یا تصور کا کمال
کچھ نہ کچھ شب کا اندھیرا تو پگھلتا جائے ہے

جام و مینا سے سوا کیا بیدلی عشاق کی
اعتبارِ چشمِ ساقی جب کہ اٹھتا جائے ہے

روز خوابوں اور حقائق میں ہوا کرتی ہے جنگ
آرزو آتش بجاں ہالہ سے بھی ٹکرا جائے ہے

رہ کے دنیا میں کہاں تک پارسائی ہو سرور
میکدے میں کیا کبھی کوئی فرشتہ جائے ہے

شاد عارفی

تجربے جن کو جنوں کے نہ گریبانوں سے
طنز کرتے ہیں وہ حالات پہ دیوانوں کے

کہہ رہے ہیں کہ پڑے پاؤں نگہبانوں کے
آپ ہمدرد ہیں !!! ہم سوختہ سامانوں کے

کھل گئے بھید جو زندوں پہ جہانبانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جگمگھٹے بیچ کے گذرتے ہوئے انسانوں کے
قہقہے اور بڑھا دیتے ہیں دیوانوں کے

دمِ گل سے خزاں نے وہ سیاست کھیلی
گلستانوں کے ہوئے ہم نہ بیابانوں کے

میں نے سمجھا تھا شگوفوں کو دلِ صد پارہ
جب کیا غور تو ٹکڑے تھے گریبانوں کے

وہی اخلاق کو ایماں کو بناتے ہیں سپر
وہ جو اخلاق کے قائل ہیں نہ ایمانوں کے

شرطِ اوّل ہے مسلمان کا انساں ہونا
وہ مسلمان کے دشمن ہیں کہ انسانوں کے

جن کو آہوں کی طرح ضبط کیا جاتا ہے
ترجماں اشک ہی بنتے ہیں ان ارمانوں کے

جس توقع پہ خوشامد میں لگے رہتے ہیں
اختیارات سے باہر ہیں نگہبانوں کے

کہہ رہے ہو جسے تم ابرِ بہاری اے شادؔ
میں سمجھتا ہوں کہ آثار ہیں طوفانوں کے

توصیف کمار شاد

دوستو! جب دوستی کے نام پر ہنستا ہوں میں
عمر بھر کی کاوشِ ناکام پر ہنستا ہوں میں

حیرت یہ ہے کہ دنیا ہی نہیں ہے خندہ زن
خود بھی اپنے دل شکن انجام پر ہنستا ہوں میں

اے مرے ٹوٹے ہوئے دل لاج رکھ لینا مری
آج آوازِ شکستِ جام پر ہنستا ہوں میں

ہم جب گردش میں ہوں خاموش رہنا کفر ہے
کھلکھلا کر گردشِ ایام پر ہنستا ہوں میں

[illegible] دل منت کشِ درماں کہاں
چارہ گر تیری امیدِ خام پر ہنستا ہوں میں

[illegible] کافی ترے عیش و طرب کے واسطے
اے زمانے! اب ترے آلام پر ہنستا ہوں میں

[illegible] ہستی میں میری سادگی کو دیکھ کر
مشکلوں کو دیکھ کر ہر کام پر ہنستا ہوں میں

[illegible] حسینوں سے اُمیدِ وفا
اپنے دل کے دل نشیں اوہام پر ہنستا ہوں میں

[illegible] تک بھی رلا دیتی ہے جس کمبخت کو
اپنے احساسِ غم و آلام پر ہنستا ہوں میں

خندہ رو کہتے ہیں مجھ کو شاد جب شادِ حزیں
دل ہی دل میں اس حسیں الزام پر ہنستا ہوں میں

شاد امرتسری

○

ماند ہوا جب چاند کا چہرہ رات ڈھلی
دل میں کیا کیا تصویریں اُبھریں ڈوبیں
تیری خاطر ہم نے کیا کیا سوانگ بھرے
پھر اُٹھا خاکستر دل سے اور دھواں
ہم غنچوں کو دیکھ دیکھ کے روتے ہیں
آخر کس امید پہ ہم مر مر کے جیئں
مے خواروں کو برا بھلا کہنے والو!

ہم نے تجھ کو ڈھونڈا جا کر گلی گلی
محفل میں جب تیری چھب کی بات چلی
قشقہ کھینچا اور بدن پر راکھ ملی
جب بھی ہم نے دیکھی کوئی شاخ جلی
دیکھ دیکھ کے ہنستی ہے منہ بند کلی
سچ مچ ایسے جینے سے تو موت بھلی
شاد کو دیکھو مے پی پی کے ہوا ولی۔

شبنم نقوی

○

دل میں پھر عہد بہاراں کا خیال آیا ہے
پھر مرے پاؤں کی زنجیر چھنک اُٹھی ہے
چاندنی بن گئی راہوں کی کڑی دھوپ مجھے
یاد آیا ہے کبھی دل کو سکون ساحل
گل و نسریں کو خبر دو کہ بہار آئی ہے
جانے کیا سوچ کے پھر رو نہ سکے دیوانے
"وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے"
یہ اندھیرا، یہ اداسی! کہ تری یاد کے ساتھ

زخم مہکے تو گلستاں کا خیال آیا ہے
پھر شکستِ درِ زنداں کا خیال آیا ہے
جب تری زلف پریشاں کا خیال آیا ہے
اور کبھی شورشِ طوفاں کا خیال آیا ہے
پھر مجھے جیب و گریباں کا خیال آیا ہے
جب اچانک غم انساں کا خیال آیا ہے
آج کس جان بہاراں کا خیال آیا ہے
کتنے ہی خواب پریشاں کا خیال آیا ہے

جب بھی ٹوٹا ہے کوئی جام اچانک شبنم
"شاعرِ شہر نگاراں" کا خیال آیا ہے

ے مجاز

شہاب جعفری

ملا کرو جو ہمیں تم بھلے سجن کی طرح
جہاں میں نام کریں ہم بھی نل دمن کی طرح

نکالو وقت کوئی کارِ انقلاب کے ساتھ
خدا کے واسطے ڈالو کوئی ملن کی طرح

سُنا ہے شہر تھا کوئی اکیلے جا نہ سکے
وہ دل کہ آج ہے تم بن اُجاڑ بَن کی طرح

دبی ہے آگ نہ یاد آ، برس نہ جائیں کہیں
بھری بھری یہ گھٹائیں ترے نین کی طرح

برہ کی آگ میں من اس کا جل رہا ہوگا
گھٹائیں کیوں اُمڈ آئی ہیں میرے من کی طرح

نگاہِ شوق نے کل شب یہ [illegible] دیکھا
کہ کائنات حسیں تھی ترے بدن کی طرح

سدا کی گود بھری ہے سدا سہاگن ہے
نئی نویلی یہ دُنیا کسی دُلہن کی طرح

وہ آن بان وہ سج دھج کہاں سے لائیں گے
حسیں بنے تو ہیں بانکے مرے سجن کی طرح

اب اہلِ غم کو بھی لازم ہے سر اُٹھا کے چلیں
کلاہِ عشق ہو کج اس کے بانکپن کی طرح

چھٹے اسیر تو سُدھ بُدھ نہ تن بدن کی رہی
اِک آن میں وطن اُجڑا بکھرے چمن کی طرح

شہاب پاپ لگے گا کٹھور دل نہ بنو
برہ کی آگ نے پھونکا گھر اسکا بَن کی طرح

عوام کیوں نہ غزل شوق سے پڑھیں گے شہاب
زبان و فن تو ہوں اُنکے زبان و فن کی طرح

ظہیر کاشمیری

عشق بھی آیا نہ تھا اور حسن بھی گزرا نہ تھا
ہم یہاں بستے تھے جب کوئی گلی کوچا نہ تھا

میرا ایماں ہے جلال عشق جب پیدا ہوا
آسماں کی رفعتوں پہ دھوپ تھی سایہ نہ تھا

کس قدر سادہ مگر پُرکار تھا میرا جنوں
میں نے تیرے حسن کو پایا مگر دیکھا نہ تھا

ہجر میں تھی آنسوؤں پر عفت گوہر نثار
ہجر گذرا تو کوئی آنسو گرا تھا یہ نہ تھا

آہ وہ جلوہ کہ جو مائل نہ تھا میری طرف
آہ وہ بجلی نشیمن جس نے گرمایا نہ تھا

تو نے ہنس ہنس کر امیدوں کو جلا بخشی نہ تھی
تو نے ذروں کو لباس نور پہنایا نہ تھا

جب بغیرِ حسن گزرا تھا بہاروں کا جلوس
بے تجلی تھا چمن اک پھول گدرایا نہ تھا

روبرو بھی شوخیٔ شب سے تجھے انکار ہے
تو نے میرا دل کھلونے دے کے بہلایا نہ تھا

عشق کو ہونا ہی تھا اپنی تمنا کا اسیر
حسن والوں نے تو کوئی دام پھیلایا نہ تھا

زلف بکھری تو سکونِ جاں ملا ورنہ ظہیر
زندگی کے دشت میں کوئی گھنا سایہ نہ تھا

عارف عبدالمتین

○

خامشی کے بیاباں میں گم ہو گئی جھیل آواز کی ناگہاں دوستو!
ڈھونڈ کر لاؤ آبِ صدا کا نشاں بہرِ تسکینِ لب تشنگاں دوستو!

کاروانِ تصور بھٹکنے لگا ماہتابِ خیال آبرو کھو چکا
مشعلِ آرزو کو فروزاں کرو تیرگی ہو گئی بیکراں دوستو!

اپنی کہتے رہو میری سنتے رہو، داستاں داستاں سے ملاتے رہو
یونہی جلتے رہیں درد کے قمقمے رات جب تک ہے درمیاں دوستو

روح کے جلتے صحرا کا سنسان پن زیست کا روپ رس چھین لینے کو ہے
ابرِ رقصاں بنو بادِ پیچاں بنو، کچھ بنو بن کے آؤ یہاں دوستو!

تیرہ و تار حالات کی زد میں بھی مسکراتے رہو کسمساتے رہو
سرمگیں بادلوں سے الجھتی ہوئی کہہ رہی ہے یہ برقِ تپاں دوستو

میرے لہجے میں تسکیں بھی ہے درد بھی میری باتوں میں امرت بھی ہے زہر بھی
میں تمھاری محبت سے سرشار ہوں میں زمانے سے ہوں سرگراں دوستو

ارتضیٰ عزمی

جو صبحدم پہنچ گئے ہیں میکدے کے باب تک
وہ تشنہ کام کیا کریں غروبِ آفتاب تک
ابھی تو زندگی کی آرزو میں جی رہے ہیں ہم
ابھی تو ہیں نظر سے دور زندگی کے خواب تک
دل و نظر کو کیا کہوں گل و سمن کا ذکر کیا
اداس ہے ترے بغیر بزم ماہتاب تک
مزاج دل بدل گیا کہ وہ نظر بدل گئی
نہ جانے کیوں ہے ناگوار اب مجھے شراب تک
سکوں کی آرزو بہت حسین و دلفریب ہے
مگر سکوں کی آرزو ہے صرف اضطراب تک
نہ جانے کتنی کروٹیں بدل چکی ہے کائنات
خیالِ انقلاب سے ظہورِ انقلاب تک
ہماری بزم دل میں کیسے کیسے انقلاب آئے
تمہارے التفات سے تمہارے اجتناب تک
وہ نامرادِ شوق اپنے جی سے کیوں گزر نہ جائے
نہ پائے دل کی دھڑکنوں کا جو کہیں جواب تک
ضرورتیں ہیں وقت کو ہزار انقلاب کی
مگر یہاں ہم اہلِ دل ہیں ایک انقلاب تک
بہت سے حادثات سے گزر گئے ہم اہلِ دل
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک

فراق گورکھپوری

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے — ہر بزم کی جان ہو گئی ہے
آنکھیں پڑتی ہیں میکدوں کی — وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے
آئینہ دکھا دیا یہ کس نے — دنیا حیران ہو گئی ہے
[illegible] جو بات — شاعر کی زبان ہو گئی ہے
[illegible] — ایمان کی جان ہو گئی ہے
[illegible] زیست — کتنی آسان ہو گئی ہے
تصویر بشر ہے نقش آفاق — فطرت انسان ہو گئی ہے
[illegible] نگاہ [illegible] — اب ایک جہان ہو گئی ہے
سنتے ہیں کہ اب نوائے شاعر — صحرا کی اذان ہو گئی ہے
[illegible] کی زندگی آج — تیرا احسان ہو گئی ہے
[illegible] امان ہو کہ دنیا — کتنی ہلکان ہو گئی ہے
[illegible] کی جڑیں [illegible] ہیں — [illegible] ہو گئی ہے
انساں کو خریدتا ہے انساں — دنیا بھی دکان ہو گئی ہے
کہانی نہیں بات زندگی کی — عاشق کی زبان ہو گئی ہے
اب رات کی رات ہجر کی رات — میری مہمان ہو گئی ہے
یہ ہجر کی رات دل کی مہمان — اب مان نہ مان ہو گئی ہے
ہر بات کو جان کے بھی اکثر — وہ آنکھ انجان ہو گئی ہے
جو شوخ نظر تھی دشمنِ جاں — وہ جان کی جان ہو گئی ہے

ہر بیت فراق اس غزل کی
ابرو کی کمان ہو گئی ہے

فُضیل جعفری

○

دل نشیں نظارے ہیں، رقص میں ستارے ہیں، چاند مسکراتا ہے
کیا کسی حسینہ نے آنچلوں کو لہرا کر، کوئی گیت گایا ہے
انگلیوں کو چٹخا کر، چوڑیوں کو چھنکا کر، تم ہی کچھ سہارا دو
اجنبی مسافر ہوں، کیا کروں کدھر جاؤں، ہر طرف اندھیرا ہے
تلخیِ حوادث کے تند و تیز دھاروں نے چور کر دیا لیکن
زندگی کی راہوں میں، تیری یاد کا دیپک اب بھی جھلملاتا ہے
وقت کے دریچوں سے کتنے لوگ گزرے ہیں، کتنے لوگ گزریں گے
وقت اک طوائف ہے سب کا ساتھ دیتا ہے، سب سے جی چراتا ہے
تھاپ جب ستاروں کی سازِ شب پہ پڑتی ہے، آرزو کی دنیا میں
پائلیں کھنکتی ہیں، خواب مسکراتے ہیں، حسن یاد آتا ہے
اے مری حسیں غزلو! میری مہ جبیں نظمو! مجھ کو بھول مت جانا
میں نے اپنے جیون کا رس تمھیں پلایا ہے، خون سے سنوارا ہے

فنا نظامی

صحنِ حرم و کوئے صنم چھوڑ دیا ہے — ہر در کو ترے در کی قسم چھوڑ دیا ہے

وہ رند ہوں میں جس کے لئے شیخِ حرم نے — راتوں کو کھلا بابِ حرم چھوڑ دیا ہے

ہر دور سے گذرا ہوں مسرت ہو کہ غم ہو — ہر راہ میں اک نقشِ قدم چھوڑ دیا ہے

کرتے ہیں توبہ کا یقیں حضرتِ واعظ — میخانہ کو ساقی کی قسم چھوڑ دیا ہے

غفلت مری جانب سے کہ یا ان کی طرف سے — یہ فیصلہ تجھ پر شبِ غم چھوڑ دیا ہے

ظالم تجھے یہ راز بتانا ہی پڑے گا — کیوں مشغلۂ مشقِ ستم چھوڑ دیا ہے

روداد وفا ان کو سنا دی ہے مکمل — ہاں تھوڑا اب افسانۂ غم چھوڑ دیا ہے

کچھ اس نے بھی دی مجھ کو تسلی شبِ غم — کچھ میں نے خیالِ شبِ غم چھوڑ دیا ہے

بیگانے تو بیگانے ہیں کیا بات ہے ساقی — اپنوں نے بھی بھرنا ترا دم چھوڑ دیا ہے

اس دور کا ہر شاعرِ نازک ہے سپاہی — تلوار اٹھا لی ہے قلم چھوڑ دیا ہے

کافی ہے فنا مجھ کو مرا جامِ شکستہ
دنیا کے لئے ساغرِ جم چھوڑ دیا ہے

فیض احمد فیض

گرمیِ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو پند گرو راہ گذر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائیگی اُلفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح سے جھلکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیض تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

قتیل شفائی ○

آسودگیٔ دیدۂ پُرنم ہی بہت ہے
ہم خاک نشینوں کو ترا غم ہی بہت ہے

وعدوں سے عبارت ہو تو دریا بھی ہے شبنم
حاصل ہو تو اِک قطرۂ شبنم ہی بہت ہے

چھلکیں گے سبو اب کوئی آئے کہ نہ آئے
رندوں کو یہ بہکا ہوا موسم ہی بہت ہے

خوابوں سے بہلنا ہو تو بکھرے ہیں ستارے
اُڑنا ہو تو پھر وسعتِ عالم ہی بہت ہے

ہم تیرگیٔ شب سے گریزاں ہیں وگرنہ
چاہیں تو ہمیں کاکلِ برہم ہی بہت ہے

پلکوں پہ نہ روکیں گے ہم اشکوں کے جنازے
ہم کو دلِ رسوا ترا ماتم ہی بہت ہے

کرتے ہیں قتیلؔ آج بھی ہم جن پہ بھروسہ
لُٹنے کی ہوس ہو تو وہ ہمدم ہی بہت ہے

ماہرالقادری

میں کیا کروں مرے دل کی عجیب حالت ہے
تری نوازشِ پیہم سے بھی شکایت ہے

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

کبھی گلہ تری بیگانگی سے تھا مجھ کو
جواب ہوئی ہے توجہ تو اک قیامت ہے

غروب شام کے منظر کو دیکھنے والو!
اسی طرح سے مسافر کی شام غربت ہے

ترے جمال کی آئینہ داد کیا دے گا
کہ آئینہ کو تو خود اعترافِ حیرت ہے

یہ خواب ہے وہ تماشا یہ وہم ہے وہ طلسم
مجاز اپنی جگہ پھر بھی اک حقیقت ہے

میں اس کے ناز اٹھاؤں کہ دو صلائے نیاز
وہ حسن جو مری تقدیر سے محبت ہے

نگاہِ ناز ترے حسن التفات کے بعد
مری طرف سے تغافل کی بھی اجازت ہے

رہِ طلب میں قدم رکھ دیا ہے اے ماہر
اب اس کے بعد مری کوششوں کی قسمت ہے

مشفق خواجہ

اس قدر حیرتیِ جلوہ تھے دیوانے ترے
کچھ نہ کہنے پہ بھی کہتے رہے افسانے ترے

کائناتِ دلِ ویراں فقط اک ذوقِ طلب
وادیاں تیری، گلستاں ترے، ویرانے ترے

جانے کیا رنگ ہو پھر جلوہ گہِ ناز ترا
ہم سے منسوب اگر ہو گئے افسانے ترے

تیرے ملنے کی جہاں کوئی بھی امید نہیں
اب وہاں ڈھونڈ رہے ہیں تجھے دیوانے ترے

کاش ہم وقت سے اس طور ہم آغوش رہیں
ہم کو ہر لمحہ سناتا رہے افسانے ترے

ہم نے ہر شے کو تجھے دیکھ کے دیکھا اکثر
ہم نے ہر روپ میں سو روپ ہیں پہچانے ترے

اُجڑی راہوں پہ سدا صورتِ نقشِ کفِ پا
جانے کیا سوچ کے بیٹھے رہے دیوانے ترے

اب وہ پہلی سی پرستاریٔ اوہام کہاں
یاد ہیں پھر بھی غمِ دوست کچھ افسانے ترے

کاش تو جان سکے اے نگہِ سیدوساز
تشنگی آ کے بڑھا دیتے ہیں پیمانے ترے

تجربہ ہے کہ پسِ پردۂ ہر قہقہۂ غم
ہم نے مشفق سُنے لے دیکے بس افسانے ترے

آنند نرائن ملاؔ

○

اجنبیت سی نگاہِ دوست میں پاتے ہوئے
اُٹھ گئے محفل سے ہم نظروں کو کتراتے ہوئے

ابتدائے عشق میں نظروں کا عالم اس سے پوچھ
جس نے دیکھی صبح دم کرنوں میں تاب آتے ہوئے

شیخ شاید میں بھی کل ہو جاؤں تجھ سا پاکباز
دیر کچھ لگتی نہیں نیت بگڑ جاتے ہوئے

کر رہا ہوں موت بھی تیری نگاہوں سے قبول
اور دل میں زندگی ہی زندگی پاتے ہوئے

یادگارِ زندگیٔ عشق ہیں کیا؟ چند داغ
ہاں مگر فردوس کے پھولوں کو شرماتے ہوئے

ایک کیفِ مشترک لڑتی ہوئی نظروں میں ہے
رند جیسے مَے پئیں پیالوں کو کھنکاتے ہوئے

عشق کی راہوں میں ہیں یوں رسمِ دنیا کے اسیر
ہر قدم پر اپنے سایے تک سے گھبراتے ہوئے

اک سلام، اک مسکراہٹ، اک سوال، اک شکریہ
وہ بھی یوں ہی راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے

ہم نے بھی ملاؔ کو سمجھانے کو سمجھایا مگر
چوٹ سی لگتی ہے دل میں اُس کو سمجھاتے ہوئے

احمد ندیم قاسمی

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں
ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار
چند یادوں کے دریچے ہیں جو کام آئے ہیں
کون کہتا ہے محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اُٹھا لائے ہیں
ایک پل کے لئے وہ زینتِ آغوش رہے
کتنے برسوں کے مگر زخم نکھر آئے ہیں
گونج گونج اُٹھی ہے آوازِ شکستِ دل کی
جب بھی تارا کوئی ٹوٹا ہے وہ یاد آئے ہیں
داستانِ غمِ دنیا ہو کہ افسانۂ عشق
وہی قصے ہیں جو ہر دور نے دُہرائے ہیں
سینۂ دَور میں بیدار ہے احساسِ جمال
جب سے فنکار ستاروں سے اُتر آئے ہیں
اے سحر آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اُڑا !
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

نذیر بنارسی

○

ہم نے تو نہیں جانا تنکے کا سہارا بھی　　طوفاں نے ڈبویا تھا طوفاں نے اُبھارا بھی

ہے ایک زمانے پر احسان ہمارا بھی　　بگڑے جو محبت میں کتنوں کو سنوارا بھی

جب وہ تھے تو رات اپنی ہر طرح سے تھی روشن　　چمکے تھے اگر جگنو ٹوٹا تھا ستارا بھی

خود آؤں گا ساحل تک آواز نہ دے کوئی　　توہین جوانی ہے تنکے کا سہارا بھی

اُبھرے کوئی یا ڈوبے اِک لہر تو پیدا ہو　　خاموش ہے طوفاں بھی گُم سُم ہے کنارا بھی

جو اپنے اُبھرنے کی کرتا نہیں خود کوشش　　اس ڈوبنے والے پر ہنستا ہے کنارا بھی

کل کس کی کشش تم کو کھینچے لئے جاتی تھی　　مُڑ کر بھی نہیں دیکھا میں نے تو پکارا بھی

جاؤ گے کہاں بچ کر بدنام محبت سے　　دنیا کی زباں پر ہے اب نام تمہارا بھی

کچھ حال سُنا ان کا کچھ حال کہا اپنا　　کچھ بوجھ لیا سر پر کچھ سر سے اُتارا بھی

چہرے پہ نذیر ان کے ہے رنگِ شکست اب تک

جیتی ہوئی بازی کو میں جان کے ہارا بھی

واقف راشد بریلوی

○

کچھ اس ادا سے اداسی میں تیری یاد آئی
گزر گئی ہے دبے پاؤں شامِ تنہائی

خیالِ رسمِ جہاں ہے نہ وہمِ رسوائی
اسے بھی میری محبت کہاں پہ لے آئی

تری نظر سے دلوں کے چراغ جل اٹھے
انھیں چراغوں سے دنیا نے روشنی پائی

ترے سکوت پہ تجھیں بدگمانیاں کیا کیا
تجھے قریب سے دیکھا تو آنکھ بھر آئی

شراب کہتے رہے آنسوؤں کو اہلِ ہوس
کوئی سمجھ نہ سکا چشمِ نم کی گہرائی

جہاں بھی چھاؤں ملی جی بہت اداس ہوا
جہاں سکون ملا اور تیری یاد آئی

ہم اہلِ درد کہاں جائیں تیرے کوچے سے
وہیں مریں گے جہاں ہم نے زندگی پائی

یہ میکدہ بھی نہ ہوتا تو سوچیے واقف
کہاں گزارتے ہم زندگی کی تنہائی

طنز و مزاح

ابراہیم جلیس

کرسی

ایک دن میں اپنے ایک نہایت عزیز دوست چودھری سراج دین سے ملنے اس کے گھر گیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہنے والا چودھری سراج دین اپنے دیوان خانے میں ایک کرسی پر سر نیوڑھائے، اداس و محزون بیٹھا ہے۔ میں نے سراج دین کو اپنی پچھلی اٹھارہ سالہ دوستی میں کبھی ایک دن بھی غمگین نہیں دیکھا تھا اس لئے میرا حیران ہونا لازمی اور اس کا اداس ہونا ایک معمہ تھا اس لئے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یعنی مشوش لہجے میں اس سے یوں گویا ہوا :-

"اے میرے پیارے ساجھے! بتادے مجھے کہ کیا ہوا ہے تجھے؟"

سراج دین عرف ساجھے جیسے اونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ ملے اپنا ماجرا لے کر یوں بیان کیا۔

"اے میرے پیارے دوست معراج دین عرف ماجھے، سن اور غور سے سن کہ میری وجہ افسردگیٔ خاطر اگر کچھ ہے تو صرف "ایک کرسی" ہے!"

یہ جواب سن کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ساجھے نے ماجھے کو یعنی مجھے بے خبری کے عالم میں دریائے حیرت میں دھکیل دیا ہو۔ میں نے جیسے ہی دریائے حیرت کی سطح سے منہ باہر نکالا، فوراً ہی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ چودھری سراج دین نے شاید کرسی سازی اور کرسی فروشی کے کاروبار میں سخت نقصان اٹھایا ہے اور شاید دیوالیہ بھی ہو گیا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ چودھری سراج دین لاہور شہر کا سب سے مشہور کرسی ساز اور کرسی فروش ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کرسیاں نہ صرف سارے مغربی پاکستان میں مشہور ہیں بلکہ بحوالہ

مرتب جغرافیۂ عالم حصہ اول و دوم دساور بھی بھیجی جاتی ہیں۔ مغربی پاکستان اور دساور جہاں چلے جائیے ہر گھر میں آپ کو چودھری کی بنائی ہوئی کرسی ضرور نظر آئے گی۔ کرسی کے ساتھ چودھری سراج دین کا نام ایک عمدہ اور پائیدار کرسی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

میں سوچنے لگا کہ جب کرسی سازی نہ کرسی فروشی ہی چودھری ساجھے کے کسب معاش کا واحد ذریعہ ہے تو پھر یہ کیا راز ہے کہ کرسی یعنی اس کا ذریعۂ رزق ہی اس کے غم کا باعث بن گیا ہے اور آج وہ بے چارہ پریشانی خاطر سے اس قدر قریں ہو گیا ہے۔

میں نے آغاز جستجو کے لیے زنان خانے سے حقہ تازہ کروا کر منگوایا اور آپ پیتے چودھری کو پلاتے اسے طرح طرح سے کریدنا شروع کر دیا۔ چودھری پہاڑ جسم آدمی تھا چنانچہ اس پہاڑ کو کھود کھود کر میں نے جو چوہا نکالا وہ یہ تھا کہ چودھری کی بیٹی کو چودھری کے داماد چودھری چراغ دین نے طلاق دے دی ہے۔ اور طلاق کی وجہ صرف کرسی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس زمانے میں چودھری ساجھے کی دختر بد اختر (کیونکہ اسے شادی کے دوسرے ہی سال طلاق مل گئی) کی شادی چودھری چراغ دین سے ہوئی تھی۔ ان دنوں چودھری چراغ دین ملک کی سرکاری سیاسی جماعت "مومن لیگ" کا ایک درمیانہ لیڈر تھا یعنی مومن لیگ کے سب سے بڑے لیڈر اور ملک کے عوام کے درمیان ایک پائی ہوئی کڑی (کھوئی ہوئی کڑی کا الٹ) تھا۔ اس کی تعلیم واجبی واجبی سی تھی، بدن کسرتی تھا۔ دنگا فساد سے بڑی رغبت رکھتا تھا۔ بادۂ ناب اور شاہدان بازاری کا والہ و شیفتہ تھا۔ لاہور شہر کے تمام ملی ٹنٹ (MILITANT) لڑاکو محلوں، مزنگ، بیڈن روڈ، موچی دروازہ، بھاٹی دروازہ، یکی دروازہ، مستی دروازہ اور علاقہ تھانہ ہٹی کے سارے دس نمبری اور علاقہ بند غنڈوں کا ہم پیالہ ہم نوالہ اور ہم دوشالہ یار تھا۔ اس کے ایک اشارے پر جہاں چاہتا جم غفیر اکٹھا ہو جاتا۔ وہ جب چاہتا پستولیں، چاقو، چھری چلوا دیتا۔ گھونسہ بازی، گھسن بازی اور چھترباز[ی] اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یعنی مار پیٹ کے ایسے ادنیٰ طریقوں کے لیے وہ بالعموم اپنا بایاں ہاتھ استعمال کیا کرتا تھا۔

ان خصوصیاتِ ادنیٰ وارزل کی بدولت مومن لیگ کے سب سے بڑے سردار کی نگاہِ جوہر شناس اس پر پڑی اور لاہور کے عوام سے واسطہ و رشتہ پیدا کرنے کے لئے بڑے لیڈر نے چودھری چراغ کو مومن لیگ کی شاخ لاہور شہر کا لیڈر بنا دیا۔ مومن لیگ کا لیڈر بنتے ہی چودھری چراغ کا نام بستہ سب سے کٹ گیا اور حکومت کے اعلیٰ حلقوں میں بڑی بڑی زبان پر آنے اور چلنے لگا۔ مومن لیگ کا لیڈر بننے کے معنی یہ تھے کہ چودھری چراغ دین دونوں ہاتھوں سے کمانے لگا۔ اس [illegible] متروکہ شدہ [illegible] کی کرمکانات، دھوبیوں نے [illegible] کے پلاٹ الاٹ کروا لیے۔ برف خانہ، جدید فیکٹری، سینٹ مل، فیکٹری، رائس مل، سا مل الا بلا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اتنی دولت سمیٹی کہ بڑے بڑے نوابوں کے چشم و چراغ اپنی اپنی بیٹیوں کے رشتے لے لے کر کترے کترے اس کی طرف جانے لگے۔ سارے لاہور شہر میں عرصہ دراز تک ہر گھر میں یہی سوال زیرِ غور رہا کہ دیکھیں تو سہی کہ وہ کس ماں کی جائی ہے جسے چودھری چراغ اپنی ساس بنانا منظور کرے گا ـــــــ اور پھر ایک دن لوگوں نے بڑی حیرت کے ساتھ یہ سنا کہ اکلوتی [illegible] چودھری سراج دین کی بیوی چودھری چراغ دین کی ساس بننے والی ہے۔ لوگوں کو اس لئے حیرت نہیں ہوئی کہ چودھری سراج دین شہر کا [illegible] کرسی سازی و کرسی فروشی کے کاروبار میں اس نے لاکھوں روپیہ کمایا تھا۔

چودھری چراغ دین کی شادی کے بعد ان سارے لوگوں نے [illegible] جو دو یا [illegible] اور چودھری سراج کے اس جملے پر کہ "میری وجہ افسردگی خاطر کا سبب صرف ایک کرسی ہے۔" میں اچھی طرح سمجھ گیا چودھری چراغ دین نے ایک کرسی ساز کی بیٹی کو کرسی کی وجہ سے کیوں طلاق دی ہے۔

یہ کوئی معمہ یا پہیلی نہیں تھی بلکہ سیدھی سادی سی بات تھی کہ چودھری چراغ کو ملک کی برسر اقتدار سیاسی جماعت نے خدمات ناہنجار کے عوض لیڈری کی کرسی پر سے اٹھا کر وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا تھا

اب اپنے اپنے مشاہدات کے نتائج پر نظر ثانی کیجئے تو یہ حقیقت قیس کی طرح تصویر کے پردے میں کیسی عریاں نکلتی ہے کہ جب زندگی قید وزارت میں آ بنتی ہے تو پہلو کثرت [illegible] ذکر باقی

ہے۔ پتہ نہیں کون فرماتا ہے لیکن فرماتا ضرور ہے کہ دریں موقع ایک بیوی پر قناعت نہ کرنا یہ وزیروں کی ایک روایت ہے۔ سب وزیروں نے ایسا کیا تو اسے میرے چودھری چراغ دین تم بھی ایسا کرو ـــــ یہ کچھ چودھری چراغ دین نے اس ہی کیا۔ اب شہر کا مشہور کرسی ساز اپنی ہی بنائی ہوئی کرسی پر بیٹھ رو رہا ہے کہ اس کے داماد نے کرسی وزارت پر بیٹھتے ہی اپنی بیوی کو زندگی بھر رونے کے لیے پلنگ پر دھکیل دیا ہے۔ اب دن رات وہ پلنگ پر لیٹی آنسو بہاتی رہتی ہے۔ اس کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ دن اور آج کا دن وہ کبھی کرسی پر نہیں بیٹھی۔

صرف ایک چودھری سراج دین کی دختر بد اختر کی داستان الم کیا، ہماری اور آپ کی آنکھیں اگر آپ اندھے نہ ہوں، تو ہر روز یہ دیکھتی رہتی ہیں کہ دور حاضر میں کرسی نے دنیا کو کتنا بڑا المناک بنا رکھا ہے۔ ویسے دیکھئے تو کرسی کیا چیز ہے ـــ یہ لکڑی کا ایک چوپایہ ـــ جو دنیا کے ہر گھر میں موجود ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جس نے گھر میں کرسی نہ دیکھی ہو اور وہ اس پر نہ بیٹھا ہو۔ لیکن کرسی کرسی میں بھی فرق ہے۔ کرسی جب تک گھر میں ہو یا ہوٹل میں ہو ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی مگر جب کبھی آپ گھر میں یا کسی ہوٹل میں جاتے ہیں تو کرسی کو غور سے دیکھتے تک نہیں صرف اسے کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتے ہیں مگر جب کرسی گھر یا ہوٹل کے بجائے کسی سرکاری دفتر کی چار دیواری میں رکھی جاتی ہے تو ساری دنیا کی نگاہیں اس پر لگ جاتی ہیں ہر شخص کے دل میں یہ خواہش ایک دم تڑپ اٹھتی ہے کہ کاش میں اس کرسی پر بیٹھ سکوں!

میں جب کبھی حکومت کی کرسی کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے اسکول کے زمانے کا ایک کھیل بہت یاد آتا ہے جس کا نام غالباً "میوزیکل چیئر" ہے۔ وہ کھیل کچھ اس قسم کا تھا۔

چونے کی لکیر سے ایک دائرہ بنایا جاتا تھا۔ اس دائرے کے بیچوں بیچ تین کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ اسکاؤٹ کا ہیڈ ماسٹر قریب ہی ایک ڈھول لے بیٹھا ہوتا اور چار لڑکے چونے کی لکیر کے دائرے کے باہر کھڑے ہوتے۔ جب اسکاؤٹ ہیڈ ماسٹر ڈھول پیٹنے لگتا تو چار لڑکے چونے کی لکیر کے دائرے کے گرداگرد دوڑنے لگتے اور جیسے ہی ہیڈ ماسٹر اچانک ڈھول بجانا بند

کر دیتا ہے تو چاروں لڑکے دوڑتے ہوئے کرسیوں کی طرف جاتے۔ کرسیاں تین اور لڑکے چار ـــــــ ظاہر ہے کہ ایک لڑ کا کرسی پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح آخر میں صرف ایک کرسی رہ جاتی اور دو لڑکے اس کے گرد دوڑتے اور ہیڈ ماسٹر جیسے ہی ڈھول پیٹنا بند کر دیتا دونوں لڑکے اکیلی کرسی کی طرف دوڑتے ـــــــ دونوں میں سے ایک لڑکا کرسی پر بیٹھ جاتا اور دوسرا لڑکا شرمندہ و محجوب لوٹ جاتا۔

جب تک میں کالج کی دنیا سے عملی دنیا میں نہیں آیا تھا، کرسیوں کے اس کھیل کو محض بچوں کا کھیل سمجھتا تھا لیکن عملی دنیا میں آنے کے بعد پتہ چلا ہے کہ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں بلکہ انسان بوڑھا ہو جائے تو بھی وہ اس کھیل سے باز نہیں رہ سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بڑا ہو کر انسان اس کھیل کو اس طریقے سے نہ کھیل سکے جس طرح اسکول میں کھیلا جاتا ہے۔ لیکن ایمان سے ایک بات بتائیے کہ کیا آپ ہر روز اس کھیل کو اخباروں کے صفحات کی آڑ سے جھانک جھانک کر نہیں دیکھتے ہیں؟

مثال کے طور پر اپنے ملک کی وزارت عظمیٰ کی کرسی کو دیکھئے۔ اس کرسی کو دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے ارد گرد چونے کی لکیر کا ایک دائرہ بنا ہوا ہے اور کانوں میں ڈھول پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگتی ہے اور تصوّر کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اس وزارت عظمیٰ کی کرسی کے گرد اگرد چونے کی مدوّر لکیر پر بڑی بڑی عمر کے آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینکیں لگائے ہوئے موٹے موٹے گنجے گنجے لوگ بالکل اسکول کے بچوں کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ جیسے ہی وقت کے ڈھول کی آواز رُکتی ہے یہ سن رسیدہ بچے دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کو دھکیلتے گراتے اس کرسی کی طرف دوڑتے ہیں۔ بالآخر کوئی محمد علی اس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور دوسرے محمد علی اگلی دوڑ کے لئے دوبارہ چونے کی مدوّر لکیر پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور وزارت عظمیٰ کی کرسی پر نظریں جمائے قوالی کی طرز میں گانے لگتے ہیں

ع تجھ پہ بیٹھ ہی لیں گے کبھی نہ کبھی

اب تک تو آپ یہ سنتے آئے ہیں کہ زمان و مکان کا انسان کے کردار پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

بلونت سنگھ

ایڈیٹر لوگ

پہلے میرا خیال تھا کہ ایک 'ہدایت نامۂ ایڈیٹران' لکھا جائے آخر جب 'ہدایت نامہ خاوند' 'ہدایت نامہ بیوی'، 'ہدایت نامہ والدین' وغیرہ لکھے جا چکے ہیں تو 'ہدایت نامۂ ایڈیٹران' لکھے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ لیکن پھر کچھ یوں محسوس ہوا کہ بات ذرا سخن گسترانہ سی ہو جائے گی۔ خود بھی ایڈیٹر رہ چکا ہوں، ایڈیٹروں سے واسطہ بھی زندگی بھر پڑنا ہے۔ اس لئے ایسی شوخ ادائی سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا نہایت معتدل، مسکین اور غریب نواز عنوان قائم کر دیا۔ اب اس مضمون کو ہدایت سے خیال سے نہیں لکھا جا رہا بلکہ مقصود امر واقعہ کا اظہار کرنا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ ایڈیٹر لوگ لیکھکوں کے خطوط کے حوالے دے کر اکثر چہلیں اور کلیلیں کیا کرتے ہیں۔ بے شک لیکھکوں کے نام صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں، پھر بھی بے چارے لیکھک دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان بے مہار اُونٹوں (ایڈیٹروں) کی ناک میں نکیل ڈالنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔

اس قسم کی دُم بازی (FLIRTATION) کرنے والوں میں بڑے بڑے سنجیدہ اور فرشتہ طینت بزرگ بھی شامل ہیں۔ مثلاً ہمارے ایک مولانا صاحب تھے نہایت معقول سنجیدہ اور انسان دوست۔ تقسیم ہند سے پہلے بیڈن روڈ پر آپ کا دفتر تھا۔ میرا فلیٹ بھی اسی سڑک پر تھا۔ اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مولانا بھی مندرجہ بالا قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ایک ادیب کے بارے میں مجھے بتایا کرتے تھے کہ جب وہ صاحب نئی کہانی لکھ چکتے ہیں تو آکر مسودہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔ "لیجئے مولانا! اب کے میں نے کمال کر دیا ہے۔"

اس وقت ان کی برش نما مونچھوں تلے دم بدم پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے شوخی بلکہ شرارت ٹپکتی تھی۔ یہ اشارہ ایک دو دھاری تلوار کا کام کرتا تھا۔ یعنی اپنی تحریر کو خود ہی کمال کا درجہ دینا اور پھر کمال کو کومال کہنا۔

یہ سب درست، لیکن پھر بھی میری ہمدردی تو ادیب کے ساتھ ہی رہے گی کم از کم اس وقت تک جب تک میں بھی کسی سرکاری رسالے کا ایڈیٹر نہیں بن جاتا۔

ہر بشر خاص وعام (آم نہیں ــــ یہ ہدایت اس لئے کہ وہ صاحب کومال ابھی زندہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں 'وہ مرے نہیں) کو معلوم ہونا چاہئے کہ لفظ ایڈیٹر میں اس کا آخری حصہ یعنی 'ٹر' بہت اہم ہے۔ یوں تو ایڈیٹر میں بہت سے اوصاف ہونے لازمی ہیں جو کبھی ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔ لیکن ہر ایڈیٹر میں 'ٹر' ضرور ہوتی ہے ــــ یہ انکشاف طبع زاد نہیں ہے۔ جو بزرگ اس کے موجد تھے یا ہیں ان کا نام یاد نہیں آرہا۔ بہرکیف میں نے انھیں کی خوشہ چینی کی ہے۔ چاہیں تو سرقہ یا چوری بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ــــ سینہ زوری نہیں۔

جیسا کہ ہم رسّی کے بارے میں کہتے ہیں کہ رسّی جل گئی پر بل نہیں گیا۔ اسی طرح ایڈیٹر کی 'ٹر' گل جائے سڑ جائے لیکن جاتی نہیں۔ گزرنے کو تو ہر کیفیت اس 'ٹر' پر گزرتی ہے لیکن یہ پھر بھی قائم رہتی ہے۔ مر مر کے زندہ ہوجاتی ہے

محفوظ ترین 'ٹر' ایک سرکاری رسالے کے ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ مثلاً سرکاری ایڈیٹر مضمون کے لئے پرانے لیکھک سے یوں تقاضا کرے گا:

"برادرِ مکرم

تسلیم۔ اب تو افسانہ لے دیر ہوگئی۔ ذرا جلد التفات فرمائیں۔

مخلص

. . . .

بڑے سائز کے کاغذ پر چند الفاظ .... یہ دو فقرے، باقی سارا کاغذ خالی۔ خالی نہیں۔ اس میں ایڈیٹر کی 'ٹر' ہے۔ لیکن اس 'ٹر' کی بلائیں لے لینے کو جی چاہتا ہے کیونکہ ان کے وہاں سے

سیلینک کو معقول (یا نا معقول بہر حال) معاوضہ ملتا ہے۔ سرکاری ایڈیٹر اگرچہ مندرجہ بالا قسم کا گرگ باراں دیدہ نہ بھی ہو تو بھی اس کی چھٹی خاص حدود سے تجاوز نہیں کرنے پاتی۔ مثلاً ایک ادیب صاحب لکھتے ہیں:

محترمی تسلیم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا خط کے ہمراہ ...... کا ایک شمارہ ارسال خدمت ہے امید ہے کہ رسالہ آپ کو پسند آئے گا۔ ادارہ ...... آپ کا ممنون ہوگا اگر آپ پہلی فرصت میں ہمارے لئے اپنی کوئی غیر مطبوعہ کہانی بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں۔

براہ کرم مطلع فرمائیں

زیادہ آداب

نیاز مند

"......... .."

آپ کو مندرجہ بالا خطوط بالکل معقول نظر آئیں گے۔ میں آپ سے متفق ہوں لیکن غیر سرکاری ایڈیٹروں کی APPROACH ذرا مختلف ہوتی ہے۔

یہ ایڈیٹر ڈاکوؤں اور پولیس کی مدد لینے کے سوا باقی سب ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ علم و ادب کا واسطہ دیں گے، تحریک کو بڑھانے اور گرم تر کرنے کے لئے اُبھاریں گے، پبلک کے گرد ہوتے ہوئے اخلاق کو بلند کرنے کے تلقین کریں گے۔ ادیب کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔ دیگر ادیبوں سے سفارشی خطوط لکھوا کر بھجوائیں گے، دھمکیاں دیں گے صرف آپ کی خاطر سالہا سال یا دو سال تک رکے رہیں گے، شاعری کریں گے۔ دور ہی دور سے مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں گے، چھوٹی بڑی بے تکلفیاں کریں گے ـــــ غرض کہاں تک گنوایا جائے ....

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے وہ یہ کہ سرکاری ایڈیٹر کو محض ایڈٹ کرنا پڑتا ہے یعنی جو ایڈیٹ

کا کام ہے وہی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے ایڈیٹروں کو ایڈیٹنگ کم کرنی پڑتی ہے باقی سب کام بہت زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ پہلی قسم کے ایڈیٹروں کی تعداد بہت کم ہے جیسے آٹے میں نمک، بلکہ انھیں ایڈیٹر کہنا ہی بے کار ہے۔ اصل ایڈیٹر تو دوسری قسم کے ہوتے ہیں۔ انھیں وہ وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن سے خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ کاغذ، کتابت، بلاک، چھپائی، بیسیوں ٹنٹے اور ۔۔۔ گویا ایک انار کو سو بیماریاں لگی ہوتی ہیں۔ بے چارے دن رات بڑی بڑی ٹیڑھی کھیریں پکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی لیے میری ہمدردی ہمیشہ دوسری قسم کے ایڈیٹروں پر سایہ فگن رہتی ہے۔ بالخصوص ایسے ایڈیٹروں سے جو رسالے کے اخراجات کے سلسلے میں کاغذ، کتابت، بلاک، چھپائی، سلائی، سیاہی، نب، قلم ۔۔۔ غرض ہر الم غلم چیز کا بجٹ بناتے ہیں لیکن لیکھک کے لئے معاوضے کی بات صاف بھول جاتے ہیں۔ مجھے اس کی اس بھول پر بہت پیار آتا ہے۔ کیونکہ میں ان مجبوریوں کو خوب سمجھتا ہوں لیکن جب وہ میری مجبوریوں کا خیال نہ کرتے ہوئے میرے پیار اور ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور مفت مضمون طلب کرتے ہیں تو مجھے ان کی اس طوطا چشمی پر بڑا دکھ ہوتا ہے

ان گشتی مراسلوں کو پڑھ کر میں خوش ہوتا ہوں جن میں چند پرستارانِ ادب و فدایانِ فنونِ لطیفہ و شریفہ بالا اسی عظیم اور بھاری ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اقدارِ نو کو جنم دینے، ابھارنے نیز نوجوانانِ وطن کی رگِ حمیت اور جذبۂ حریت کو ابھارنے کے لئے ادب کے اکھاڑے میں اُتر آتے ہیں اور آپ کو آفتابِ ادب سمجھ کر آپ سے ازراہِ مولا ایک عدد تازہ بتازہ طبع زاد مضمون کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اصحاب سے ذرا سی بے فکری رہتی ہے خواہ وہ قریب کے کسی قصبے کے رہنے والے ہی ہوں۔ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ڈیڑھ روپیہ خرچ کر کے بہ نفسِ نفیس آ دبوچیں گے۔ ان مالی مجبوریوں کا نہایت خوش گوار نتیجہ نکلتا ہے، پرستارانِ ادب محلے کے پنواڑی کی دکان کے ہیر پھیر میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور آفتابِ ادب اپنی ڈھیلی چارپائی پر پڑے پڑے غروب ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا قسم کے ایڈیٹران کی خوش نوائیوں کا جوابی بول تو بس ایک 'چپ' ہے۔

لیکن جو ایڈیٹر لطیف حملے کرتے ہیں وہ ذرا مشکلات بھی پیدا کر دیتے ہیں خود بھی ادیب ہوتے ہیں
یہ بھی جانتے ہیں کہ ادھر بھی ان کے قدردان ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

" بھائی سونت سنگھ

میں جانتا ہوں کہ آپ کسی کو خط نہیں لکھتے۔ لیکن اپنی فطرت کا کیا کروں۔
مجھے یہ ضد ہے کہ میں آپ سے کوئی نہ کوئی کہانی لے کر رہوں گا۔ ہو سکتا ہے جیت
آپ ہی کی ہو، مگر مجھے اتنا اطمینان تو رہے گا کہ (آگے وہ ' دل ناتواں' والا
مصرع ہے)
'گمراہ' کے افسانہ نمبر کے لئے کوئی کہانی دیجئے۔ پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں۔

آپ کا

....

'آپ' میرے دوست ہیں۔ میرے دل میں ان کے لئے پیار ہی پیار بھرا ہے۔ لیکن کلجگ میں
دل کو کون دیکھتا ہے۔ تاہم صبر کرتا ہوں کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں اور میں اپنی عادت سے مجبور۔
ایک اور صاحب کا بیان سنیئے :

" بھائی جان ! اتنا ظلم نہ کیجئے گا۔ پرچہ رکا پڑا ہے اور جب تک آپ کا افسانہ
نہیں ملے گا پرچہ پریس کو نہیں جائے گا ــــــ "

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر چلا بھی جائے تو کیا پریس چھپائی وصول نہیں کرے گا ــ 'منیجر آپ کا
پرچہ ہے' بہت خوب ! آنے دیجئے منیجر کو، میں اسے سر ماتھے پر جگہ دوں گا۔ اتنی سی بات
ہے تو میں اسے سینے سے لگائے لگائے پھروں گا ــــــ آخر میں خفا ہو کر لکھتے ہیں :

" برادرم تسلیم !
اتنی بھی بے نیازی کس کام کی کہ ہمیں مجبوراً یہ لکھنا پڑے :
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی "

اب وہ دیدہ و دانستہ غلط کو صحیح و جہ سمجھ رہے ہیں۔ صاحب! بے نیاز ہوتے تو نیاز میں مضامین بانٹا کرتے۔

ایک اور دوست جو خود بھی لکھتے ہیں۔ بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ ایڈیٹر بھی ہیں اور ایڈیٹروں والی متعدد قدیم یعنی مزمن بیماریوں کے مریض بھی۔ لکھتے ہیں:

" ..... خدا کے لئے دوسرے شمارے کے لئے جلد از جلد کوئی کاپی بھیجو ورنہ میں مر جاؤں گا اور میرے کفن دفن کا انتظام تمہارے ذمہ ہوگا (بھائی میں آج کل آدم خور ہو رہا ہوں۔ مرتا کیا نہ کرتا)۔ اگر تم کہانی نہیں بھیجو گے یعنی جب تک نہیں بھیجو گے اس وقت تک دوسرا شمارہ شائع نہیں ہوگا۔" (اگر یہ خوش خبری صحیح ثابت ہو تو ایک رات بھوکا رہ کر بھی پانچ پیسے کے بتاشے ہنومان جی یعنی بجرنگ بلی کے مندر میں چڑھاؤں گا) "یہ میرے مرنے مارنے پر اتر آنے کا ثبوت ہے ـــــ" (ہم تو پہلے ہی قبر کے اندر سے بول رہے ہیں۔ آپ ہی تکلف میں پڑے ہیں۔)

ایک اور صاحب کا طریق یہ ہے کہ خط پہ خط داغتے چلے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے۔ میں ان کے خطوط بڑے پیار سے فائل میں رکھتا ہوں۔ ان کے انداز سے معصومیت ٹپکتی ہے۔ یوں بھی ایک خط میں دو تین الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتے، اس لئے وقت ضائع نہیں ہوتا۔ ایک خط حاضر ہے:

" پیارے!

کہانی لاؤ

تمہارا

.... ـــ ـــ ـــ "

بمبئی سے ہندی کے ایک سمپادک (ایڈیٹر) صاحب نے بڑے اونچے دار لفظوں میں چٹھی لکھ کر مجھے آگاہ کیا کہ وہ ہندی کا ایک رسالہ نکالنے والے ہیں۔ اس کے لئے میری کہانی کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے اکفیس پورا کرنے کی بجائے صرف یہ لکھا کہ وہ کہانی کا

معاوضہ تو میں منظور ہوں لیکن لطیفہ وہی ہے رسالہ کہانی جیت گئی ۔۔ اس پر آپ سے چڑ چڑا کر واپسی ڈاک سے جواب لکھئے اور مندرجہ ذیل نکات میرے ذہن نشین کر دیئے :

(۱) رسالہ چھ ماہ یا ایک سال ضرور لیجئے گا (۲) مضمون ٹائپ کیا ہوا ہونا چاہیئے ۔
(۳) ہر مضمون کی نقل اپنے پاس رکھیں (۴) مضمون کی واپسی کے لئے ٹکٹ روانہ کریں ۔
(۵) کسی مضمون کا اول و مدار رشتہ نہیں دیا جا سکتا (۶) اگر رد کیا گیا تو مضمون جانچ کر ۔
(۷) بھگوان کے لئے کوئی بی کسی صورت میں بھی رد ۔ ۔ کریں

۔ ۔ یہ کہ میں ڈاک صاحب سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کے رسالے میں لکھا لکھاک کر کے سات نقش ای بی ۔۔۔ سن ا عظیم کا کام ۔۔۔ گا لیکن یہ بات لکھ کر میں نے ان کے کومل من کو ۔۔۔ ٹھیس ۔۔۔ نہیں سمجھا اس لئے ۔۔۔ دیا ۔

نوسہ سمیا ڈاک جی !

آپ نے جو میرا مضمون بھیجا ہے وہ واقعی بڑے سندر ہیں آپ کو ۔۔۔ بھی بنا ہوگا ۔ اگر نکلا تو ۔۔۔۔۔۔ اس لئے اس کے تو میں آپ کی سیوا ۔۔۔ ۔۔۔ ہی پیش کر سکتا ہوں ۔

آپ ہی کا

. . . . . .

۔۔۔ آپ کے دل آزار ۔۔۔ کر دیا ہے ۔۔۔ میں کہتا ہوں مضمون ہتھیانے ۔۔۔
۔۔۔ کہ ایڈیٹر صاحب نے ۔۔۔ مطلوب ہوں ۔۔۔ ...... کے دوسرے ۔۔۔ ۔۔۔
۔۔۔ ماں کے لئے کہوں ، یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ۔ واہگورو جی کو ۔۔۔ ۔۔۔
۔۔۔ ۔۔۔ قسم دیتا ۔ بیوی بچوں کی قسم دیا اور کھانا کر زودتی ہوگی ...... اس صورت میں ۔۔۔
۔۔۔ کہ انھیں کس طرح رام کیا جا سکتا ہے ۔

میلوڈرامیٹک اپروچ (MELODRAMATIC APPROACH) کے ۔۔۔
۔۔۔ ہوں ـــــ " پیارے بھائی میں ضدی ہرگز نہیں ہوں ۔ لیکن اس چیز کا ۔۔۔

افسوس رہتا ہے کہ

"گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی"

دوسرا نمونہ

"گرامی نامہ ملا۔ آنکھوں سے لگایا، بار بار پڑھا، خدا کا شکر ادا کیا......"

ایک ایڈیٹر صاحب کی ڈانٹ ملاحظہ ہو:

"پیارے بلونت!

آخر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ خود ہی خط لکھ کر مطلع کیا کہ افسانہ دو چار روز تک مل جائے گا — اور کئی ہفتے گزر گئے۔ تار کھینچا، جواب ندارد۔"

ایک اور ایڈیٹر صاحب کا بھولا پن ملاحظہ ہو:

"جس طرح بھی ہو جلدی سے کچھ کیجئے۔ اب اتنے انتظار کے بعد کچھ تو ملنا چاہئے۔ اور میرے لئے اس سے بڑا کوئی انعام نہیں کہ آپ کا افسانہ افسانہ نمبر میں شامل ہو ..."

غرض جتنے ایڈیٹر اتنی ہی باتیں!

نہ جانے کیسے ایک بار ایک غیر ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب نے ایک کہانی بصیغہ وی۔ پی منگائی۔ پسند نہیں آئی۔ لکھا مجھے ہو بہو آپ کی فلاں کہانی کی سی کہانی درکار ہے تامل کیا۔ سوچا کہ ایسی سوجھے تو لکھ کر بھیج دوں۔ اسی اثنا میں ان کا ایک اور خط آیا — "پیسے رکھ لئے کہانی بھی نہیں بھیجی — اچھا خدا آپ کا بھلا کرے —" میں نے جیسا کہ شریف آدمیوں کا قاعدہ ہے حسب توفیق شرمندگی کا احساس کیا۔ لیکن ان کی قلندرانہ شان بے نیازی سے دل پر وجد طاری ہو گیا۔ چنانچہ مشدومد سے طے کیا کہ ان کی من پسند کہانی ضرور بھیجیں گے۔ لیکن چوتھے ہی روز ان کا ایک اور خط آیا جس میں وہ قریب قریب گرا ہوا اٹھے تھے: "..... تو سچ مچ ہمارے روپے ہضم کر جاؤ گے اور ڈکار بھی نہیں لو گے؟"

میں ڈکار تو کیا لیتا۔ بھیگی بلی بن کر روپے واپس کر دیئے۔

ممکن ہے کہ ایک آدھ ایڈیٹر ایسے بھی نکل آئیں جو اعتراض کریں کہ صاحب آپ کے پاس تو سال بھر تک پیسے پڑے رہتے ہیں۔ آپ کہانی نہیں بھیجتے۔

تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اعتراض سولھوں آنے ٹھیک ہے۔ قائل کرنے والی دلیل سے میں فوراً قائل ہو جاتا ہوں ...... لیکن میرا المیہ TRAGEDY ملاحظہ فرمائیں۔ جو ایڈیٹر پیشگی روپے بھیج دیتے ہیں میں ان کی شرافت کا اس حد تک قائل ہو جاتا ہوں کہ تہیہ کر لیتا ہوں کہ انھیں شاہکار افسانہ بھیجوں گا۔ پھر جو افسانہ لکھتا ہوں وہ شاہکار نہیں دکھائی دیتا۔ اس لئے انھیں ارسال نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ان کی بھیجی ہوئی رقم کی پائی پائی خرچ ہو جاتی ہے ـــــ ان کی عنایت کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا ـــــ اور وہ پھر بھی تقاضے جاری رکھتے ہیں تو دل کھولنے لگتا ہے...... رفتہ رفتہ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے بیگار لینا چاہتے ہیں۔ بالآخر انھیں کچھ بھیجنا بالکل مفت کے برابر محسوس ہونے لگتا ہے۔

ایڈیٹروں کے حلیے، عادات و خصائل دیگر اوصاف اگرچہ مزیدار ہوتے ہیں لیکن انھیں بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ مشتے از خروارے کے بمصداق ایک اچھے خاصے ایڈیٹر صاحب کی حرکت ملاحظہ ہو۔

پچھلے سال لاہور (پاکستان) کے ایک مشہور ادبی رسالے کے مشہور ایڈیٹر الآباد تشریف لائے۔ غریب خانہ پر قیام کیا، طعام کیا ہر معقول نامعقول کلام کیا ـــــ دبی دبی مسکراہٹیں جھکی جھکی نظریں، بڑے اہتمام سے رخصت ہو کر جب بخیر و خوبی لاہور پہنچ گئے تو بقول منٹو (مرحوم، مغفور بھی) وہاں سے ایک "ہیپ ٹلا" چٹھی لکھی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

" بلونت جی!

بخیر و عافیت لاہور پہنچ گیا ہوں۔ ممکن ہے اس اطلاع سے آپ کو خوشی ہوئی ہو... .."

جیسے میں بارگاہ الٰہی سے دیارِ غیر میں ان کے اللہ کے پیارے ہو جانے کی دعائیں مانگتا رہا ہوں......

شوکت تھانوی

غنڈہ کون ــــــ؟

مرزا صاحب کے متعلق وثوق سے شاید کوئی بھی نہ کہہ سکے کہ وہ "مفکر" زیادہ ہیں یا "متفکر" زیادہ۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ جس قسم کے غور و فکر میں وہ عموماً غرق نظر آتے ہیں، وہ باتیں زندگی کے حقیقی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں یا بکری خرید کر غم میں مبتلا ہو جانے والے زبردستی کے افکار ہوتے ہیں۔ بہرحال کچھ بھی ہو، نظر آتے ہیں وہ ہر وقت کسی نہ کسی ذہنی گتھی کو سلجھانے میں الجھے ہوئے۔ خیر اگر وہ خود ہی الجھے رہیں اور سلجھاتے رہیں یہ بیہودہ گتھیاں تو بھی کوئی شکایت نہیں ہے مگر قیامت تو یہ ہے کہ وہ اپنے اسی گورکھ دھندے میں اپنے نیازمندوں کو بھی پھنسا دینا چاہتے ہیں اور اگر کوئی سرکش قسم کا نیازمند نہ پھنسنا چاہے تو اس سے ان کو ہر قسم کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور سماجی اختلاف اور مرزا صاحب اس سے باپ مارے کا بیر پیدا کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ بیر میں ان سے پیدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا میرے لئے میرے یہ محب محترم عذاب کا فرشتہ بن کر رہ گئے ہیں جب دیکھئے چلے آ رہے ہیں ایک نئی ذہنی الجھن لئے ہوئے اور چاہتے ہیں کہ مکڑی کے اس جالے میں خواہ مخواہ میں بھی پھنس کر بھنبھنانا شروع کر دوں۔

اب آج ہی کا قصہ سن لیجئے، اتوار کا دن تھا نہ جانے کیا کیا پروگرام بنے ہوئے تھے کہ بال کٹوائیں گے ذرا تفصیل سے نہائیں گے۔ جوتوں پر اطمینان سے پالش کرائیں گے۔ لکھنے کی میز جو کباڑیئے کی دوکان بنی ہوئی ہے اس کو ذرا صاف کریں گے۔ دھوبی کو بلا کر کپڑوں پر استری کرائیں گے اور اسی قسم کے بے شمار کام جن کے لئے ہفتے میں صرف ایک دن ملتا ہے کہ دیکھتے کیا ہیں مرزا صاحب ماتھے پر سینکڑوں شکنیں لئے نتھنے پھلائے چلے آ رہے ہیں اور آتے ہی نہ سلام نہ دعا۔ دے ماری

اپنے ذہن کی الجھن میں سے ذہن پر۔

"کیوں حضرت آپ نے کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ شرافت سے بڑا بھی دنیا میں کوئی عذاب ہے؟"

میں نے اوکھلی میں سر دے کر بیٹھتے ہوئے عرض کیا "جی نہیں کیا اس مسئلہ پر"۔

نہایت سنجیدہ اصرار سے بولے "تو کیجئے نا غور۔ میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہایت بداعمال ہوتی ہیں وہ روحیں جو سزا کے طور پر کسی شریف جسم میں داخل کر دی جاتی ہیں"۔

میں نے احمقانہ انداز سے عرض کیا "نہیں سمجھا اب تک میں"۔

۲ جھنجھلا کر بولے "بھئی سمجھنے کی اس میں بات ہی کیا ہے۔ دنیا کا مظلوم ترین انسان وہ ہے جو اپنے کو شریف آدمی کہتا ہے جیسے ہم اور آپ۔ چونکہ ہم شریف ہیں لہٰذا ہم پر ہر قسم کی زیادتی ہر ایک کر سکتا ہے اور اس امید پر کر سکتا ہے کہ ہم اس کو جواب نہ دے سکیں گے اس لئے کہ ہم شریف ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ دنیا کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے جس کو ہم اور آپ شرافت کہتے ہیں۔ بزدلی کی بدترین قسم یہی ہے جس کو ہم اور آپ اپنی زبان میں شرافت کہتے ہیں"۔

رفع شر کے لئے عرض کیا "جی ہاں یہ تو ہے"۔

تو یہ کیجئے وہ بھلا چپ ہونے والے اسامی ہیں گرج کر بولے "مگر کیوں ہے یہ۔ اس اعتبار میں ہم آخر کیوں مبتلا ہیں؟"

۱ عرض کیا "اس لئے کہ شریف ہیں"۔

وہ بپھر کر بولے "جی نہیں شریف نہیں ہیں بے حیا ہیں، کمزور ہیں، بزدل ہیں۔ بے حصہ ہیں اور ہم نے اپنی اسی بیچارگی کا نام شرافت رکھ چھوڑا ہے۔ سبحان اللہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ کوئی ہم کو دس گالیاں دے جائے اور ہم شربت کا گھونٹ بنا کر ان کو پی جائیں کہ صاحب وہ تو کمینہ ہے جس نے گالی دی ہم شریف ہیں ہم گالی کا جواب سوائے خاموشی کے کیا دے سکتے ہیں"۔

عرض کیا "اور واقعہ بھی یہی ہے"۔

وہ تاؤ کھا کر بولے "جی نہیں واقعہ یہ نہیں ہے۔ یہ صرف مصلحت ہے اور اس مصلحت میں بزدلی، کم ہمتی، بے حیائی سب ہی کچھ شامل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم نے گالی کا جواب

بھی گالی ہی سے دیا تو اس تُو تُو مَیں مَیں کے بعد نوبت یہ پہنچے گی ہاتھاپائی تک جس کی ہم میں تاب نہیں ہم مارنے کے بجائے مار کھا جائیں گے اس بڑی ذلت سے اپنے کو بچانے کے لیے یہ چھوٹی ذلت برداشت کر لیتے ہیں۔"

عرض کیا "مرزا صاحب بات تو آپ کسی حد تک درست ہی کہہ رہے ہیں مگر اس خاموشی کی ایک وجہ اور بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ایک غیر شریف کی گالی آپ کے لیے تو گالی ہے مگر آپ کی گالی سے اس کی بے عزتی نہیں ہو سکتی۔"

وہ بات کاٹ کر بولے "برادرم ہم تو گالی دے ہی نہیں سکتے اس لیے کہ غیر شریف نہیں۔ یہ ٹھیک ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ گالی سن کر چپ رہ جانا آخر یہ شرافت کیوں ہے۔"

میں نے اب ایک غیر متعلق سا سوال کیا "مرزا صاحب معاف کیجئے گا میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا ہے کہ آخر آج آپ کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہونے کی تحریک کس واقعہ سے ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی بات تو ہوئی ہوگی۔"

مرزا صاحب نے غور سے مجھ کو دیکھ کر کہا "بیشک ہوئی ہے بات اور ایسی بات ہوئی ہے کہ خون کھول رہا ہے، اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہوں مگر ماسوائے مجبوری شرافت کے کر کچھ نہیں سکتا۔ بات اگر زبان پر لاتا ہوں تو خاندانی عزت نیلام پر چڑھتی ہے، چپ رہتا ہوں تو اپنی اس بےبسی کا احساس چین نہیں لینے دیتا۔ بلکہ ہم آپ شرافت کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں ——"

میں نے بے صبری سے پوچھا "آخر ہوا کیا۔ غالباً مجھے بتانے میں تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔"

مرزا صاحب نے ذرا قریب کھسک کر گویا نہایت رازداری کے ساتھ کہا "آپ نے میرا گھر تو دیکھا ہی ہے جس میں جاڑے کے موسم میں دھوپ آنے کا راستہ صرف دو کھڑکیاں ہیں جو سڑک کی طرف کھلتی ہیں، سڑک کی دوسری جانب پہلوان کا مکان ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ غنڈہ گردی میں ان کو کیا مراتب حاصل ہیں۔ ہوا یہ کہ آج آپ کی بھابی صاحبہ غسل کرنے کے بعد بال سکھانے اسی دھوپ میں کھڑی ہو گئیں جو کھڑکی کو چھنتے سے آتی ہے چنانچہ ایک منٹ

پہلوان کے مکان کے بالاخانہ پر جو نگاہ گئی تو دیکھتی کیا ہیں کہ پہلوان صاحب کے صاحبزادے کھڑے جھوم رہے ہیں اور نہایت حریص نگاہوں سے ان کو گھور رہے ہیں۔ اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا ان کو اگر کھڑکی کھول کر اپنے گھر میں کھڑے ہونے کا حق حاصل ہے تو اس کو بھی اپنے بالاخانہ پر جھومنے اور سیر کرنے کا حق ہے مگر اس سر پھرے لڑکے نے تو حد ہی کر دی کہ آنکھ چار ہوتے ہی سلامِ شوق جھاڑ دیا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔" یعنی بھابی صاحبہ کو۔ جو اُن صاحبزادے کی والدہ محترمہ کی عمر کی ہوں گی۔"

مرزا صاحب نے غالباً اس بات کو بھی پسند نہ کیا اور عمر کا ذکر ٹال کر بولے۔" بہرحال آپ کی بھابی نے اس گستاخی پر کھڑکی بند کر دی اور مجھ کو آکر سارا ماجرا سنایا۔ آپ اندازہ کیجئے کہ میں نے یہ واقعہ کس دل سے سنا ہوگا مگر آپ کو معلوم ہے میں نے کیا جواب دیا؟ میں نے یہی کہا کہ اب اس بات کا ذکر کسی اور سے نہ کرنا ورنہ یہی بات جنگل کی آگ کی طرح سارے محلے میں پھیل جائے گی' تمہارا اور اس غنڈہ زادے کا نام ساتھ لیا جائے گا۔ لوگ اس پر حاشیئے لگائیں گے۔ کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ لہٰذا شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ چپ ہو رہو۔"

میں نے کہا۔" کمال کیا آپ نے بھی، اگر اسی طرح ان بیباکیوں پر چپ رہنے کا سلسلہ جاری رہا تو ان مجرمانہ حوصلوں کی تو کوئی حد ہی نہ رہے گی۔ بھابی صاحبہ کے علاوہ اس محلہ میں دوسری مائیں' بہنیں اور بیٹیاں بھی ہیں، اگر آج اس بیہودگی پر آپ چپ ہو رہے تو کل کسی اور کو اسی شہدپن کا شکار ہونا پڑے گا۔"

مرزا صاحب نے کہا۔" بہرحال میری غیرت تو گوارا کرتی نہیں کہ میں اس واقعہ کو اُچھالوں اور نہ میں آپ کو اجازت دے سکتا ہوں کہ آپ یہ بات کسی اور تک پہنچائیں۔ میں جانتا ہوں کہ خاموشی شرافت سے زیادہ بے حیائی اور بے حیائی سے زیادہ بزدلی ہے مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سارے محلے میں یہ چرچا شروع ہو جائے کہ پہلوان کے لڑکے نے مرزا صاحب کی بیوی کو سلام کر دیا۔"

میں نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔" اگر آپ کی غیرت اس کو گوارا نہیں کرتی تو اس کی دوسری

ترکیب یہ ہے کہ میں اہل محلہ سے یہ شکایت کروں کہ میری بیوی مرزا صاحب کے گھر مہمان گئی ہوئی تھیں جہاں یہ واقعہ پیش آیا ہے اور میری بیوی کو اس اوباش نے اس طرح سلام کیا ہے "

مرزا صاحب کے پاس اب اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ دیر تک مجھ کو سمجھاتے رہے کہ میں آپ کے لئے بھی یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ نالی میں اینٹ ڈال کر چھینٹ کھائیں مگر جب میں نے ان کو یقین دلایا کہ مجھ کو یہ چھینٹ کھانے کا کچھ ذاتی طور پر شوق بھی ہے اور میں ایسے شریفانہ طریقے بھی جانتا ہوں جو اس قسم کی غنڈہ گردی کے مقابلہ میں استعمال ہو سکتے ہیں تو مرزا صاحب نے گفتگو کا رخ پھر اسی طرف موڑ دیا جہاں سے وہ اس واقعہ کی طرف مڑ آئے تھے :

"خیر آپ جانیں اور آپ کا کام مگر میرے بھائی خدا کے لئے یہ سمجھائیے کہ آخر اعتبارات ہیں کیا اور شرافت کو ہم نے اس قدر چھوٹی موئی اور ایسی کمزور چیز کیوں بنا رکھا ہے کہ ہماری شرافت کمینگی سے آنکھ بھی چار نہیں کر سکتی ــــ"

میں نے کہا "مرزا صاحب اس کا سبب یہی ہے کہ مثلاً آپ ــــ"

وہ بات کاٹ کر بولے "میرا ذکر اور اس واقعہ کا تذکرہ جانے دیجئے میں تو ایک عام اصولی بات کر رہا ہوں، اب مثلاً ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک تانگے والے نے مجھ سے انارکلی کا ایک روپیہ مانگا، میں نے بارہ آنے کہے تو اس نے نہایت بدتمیزی سے کہا کہ پہلے بھی بیٹھے تھے کبھی تانگے پر۔ ظاہر ہے کہ اس کا اگر میں جواب دیتا تو وہ تانگے والا میرا مدمقابل بن کر سامنے آجاتا سڑک پر ایک مجمع لگ جاتا اور خدانخواستہ اگر اس اجتماع کے سامنے وہ میرے متعلق کوئی بیہودہ بات کہہ دیتا تو میری عزت سر بازار اتر جاتی اور اس کے جواب میں اگر میں سخت سے سخت بات بھی کہتا تو اس تانگہ والے کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔"

اب میں نے بھی ہمت کر کے مرزا صاحب کو ذرا تفصیلات سمجھانے کی کوشش کی کہ دراصل یہ قصور نہ شرافت کا ہے نہ اس طبقہ کا جو شرفاء کی پگڑی کو ہر وقت اچھلنے کے خطرے میں مبتلا رکھتا ہے بلکہ غلطی ہے خود ہماری کہ ہم نے چند مفروضہ حد بندیاں کر رکھی ہیں کچھ نشیب و فراز بنا رکھے ہیں

اور شرافت جو قطعاً ذاتی اور مزاجی شے ہے اس کو خاندانی اور نسلی امتیاز سمجھ رکھا ہے گویا ایک [illegible] خاندان میں پیدا ہونے والا اپنی پست ذہنیت کے باوجود اونچا ہی ہے اور [illegible] خاندان میں اونچی سے اونچی ذہنیت لے کر پیدا ہونے والا محض اس لئے پست ہے کہ وہ [illegible] خاندان کا فرد نہیں ہے۔

[illegible] مرزا صاحب اس قسم کی باتوں پر ہمیشہ راہ فرار اختیار کرتے ہیں، چنانچہ آج بھی وہ میری ناسمجھی [illegible] آنسو بہاتے ہوئے روانہ ہو گئے اور میں نے [illegible] اس ناسمجھی پر فخر کیا؟ مجھ کو مرزا صاحب [illegible] کامیاب ہوئی۔

مرزا صاحب کے جانے کے بعد میں نے چند معتبر اہل محلہ کو جمع کیا اور جیسا کہ مرزا صاحب سے [illegible] بابا [illegible] واقعہ سب کے سامنے اسی طرح [illegible] کیا کہ گویا میری بیوی مرزا صاحب کے گھر [illegible] پہلوان کے لڑکے نے ان کو بدتمیزی کے ساتھ سلام کیا۔ ظاہر ہے کہ تمام اہل محلہ [illegible] اور بڑے بابا [illegible] پہلوان کے پاس جائیں اور ان کو بتا دیں کہ اگر [illegible] اجڑا [illegible] تو اس محلہ میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی اور یہ غنڈہ گردی اس محلہ میں نہیں چل سکے گی بلکہ [illegible] اہل محلہ تو اس قدر بپھرے ہوئے تھے کہ اگر ان کو سمجھا [illegible] جاتا تو براہ راست فوجداری [illegible] شروع ہو جاتی۔

[illegible] ایک وفد کی صورت [illegible] پہلوان کے گھر پہنچے وہ ورزش کرنے کے بعد بالٹی [illegible] لگائے دودھ [illegible] اپنے دروازے پر دیکھ کر اسی حالت میں باہر آگئے اور [illegible] ہاتھ لئے [illegible] وہ چاہتے تھے کہ ہم سب بھی دودھ ضرور پئیں مگر [illegible] دوسری ہی [illegible] اس وفد کے قائد حکیم صاحب نے اس خاطر تواضع [illegible] کر اس حاضری کا اصل مقصد نہایت مناسب الفاظ میں ان کو سنا دیا۔ میں دیکھ [illegible] پہلوان کا چہرہ پہلے حیرت سے پریدہ رنگ نظر آیا پھر غصہ سے اس حد تک لال ہوا کہ گویا ابھی [illegible] پڑے گا اور یہ پورا واقعہ سن کر وہ ایک شیر کی طرح دھاڑے۔

" فضلو او فضلو کے بچے۔ ادھر آ حرامزادے۔ ابھی مجھ میں اتنا کس بل ہے کہ اپنے

ہاتھوں سے تیری پسلیاں توڑ کر وہ بدگوشت کا ٹکڑا دل نکال کر تلوؤں سے روند ڈالوں جس نے آج میرے سر پہ ٹھکوایا ہے۔ مگر کہاں گیا آیا کیوں نہیں؟"

اسی وقت ایک دروازہ کھلا اور پہلوان کا لڑکا نہایت متانت سے داخل ہوا اور پہلوان نے پھر دس پانچ اعزازات کے ساتھ اس سے کہا:۔

"[illegible] اپنے کرتوت اور دل دے مجھے سنبھیا [illegible] تیری [illegible] ان کی بیگم کی طرف آنکھ اٹھائی۔"

وہ حیرت سے [illegible] بیگم؟ اللہ جانتا ہے [illegible] سمجھا تھا مرزا صاحب [illegible] پہلوان نے پھر کھا جانے [illegible] نظارت سے کہا "مرزا صاحب کی بیگم [illegible] ماں کے برابر ہیں۔ تو [illegible] سے بدتمیزی کرتے ہوئے؟"

[illegible] ابا جی پہلے میری بات [illegible] بات سن لیں [illegible] پانی کو پانی ابھی ہوا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اندر گیا [illegible] تیرہ سال کی لڑکی کو [illegible] لاکر [illegible] کو دیکھ لیجئے یہ میری بہن ہے [illegible] مرزا صاحب کو [illegible] اس کے اور میرے دادا کی [illegible] اب آپ لوگ یہیں بیٹھیں [illegible] سے [illegible] کرتوت [illegible] بھیجتا ہوں۔"

ہم سب نقش حیرت بنے [illegible] تھے اور [illegible] ایک فقرہ نے کہا "وہ دیکھئے کھڑکی کھلی [illegible] وہ دیکھئے آ گئے مرزا صاحب۔"

واقعی مرزا صاحب کھڑکی [illegible] قریب آ چکے تھے اور [illegible] سوار رہے تھے جن پر وہ نہایت پابندی کے ساتھ ہفتہ وار خضاب لگایا کرتے ہیں۔ [illegible] انہوں نے کچھ تبسم فرمایا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کھلنڈرے لڑکوں کی طرح سگریٹ کے دھوئیں سے چھلے بنانے لگے۔ کبھی ایک ادائے دلبری کے ساتھ ہنستے کبھی [illegible] چھلے۔ کبھی کلائی کی گھڑی کی بے ہودہ نمائش کرتے۔ کبھی سر پر ہاتھ پھیرتے [illegible] سگریٹ

کی راکھ جھاڑتے اور ہاتھ فضا میں بلند کرتے۔ آخر حکیم صاحب نے نہایت بیزاری سے کہا:۔

"استغفراللہ۔ لعنت ہے اس گھونٹ پر"

شکیلہ صاحب نے کہا "یہ کلجگ ہے کلجگ، بخدا خود اپنا اعتبار اٹھ گیا۔"

میں نے کہا۔ "بخدا اپنی نگاہوں پر اعتبار نہیں ہوتا۔"

فضلو نے کہا۔ "میں نے تو صرف مرزا صاحب کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ تو کچھ کر رہے مگر خود اُن پر آنچ آجائے تو وہ کس قدر تلملائیں۔ اللہ جانتا ہے میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ وہ آپ کی بیگم صاحبہ ہوں گی وہ میری آپا ہیں اور میں ان کا جنم جنم کا بھائی۔"

اور آخری چوٹ پہلوان نے مسکرا کر لگائی "اب آپ ہی دیکھ لیجئے کہ غنڈوں میں مرزا صاحب کی جگہ نام لکھا ہے ہمارا۔ شکر ہے کہ وہ شریف ہیں اور ہم غنڈے"

اور یہ کہہ کر اس نے ہم سب کا نام غنڈوں میں لکھ دیا۔

فکر تونسوی

سنجیدہ لوگ

اس دنیا کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ یہاں سنجیدہ لوگ پیدا ہو گئے ہیں اور جب تک دنیا میں سنجیدہ لوگ موجود ہیں۔ یہ ٹریجڈی قائم رہے گی اور ٹریجڈی کے ساتھ یہی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ سنجیدہ لوگ اچانک کہیں سے نمودار ہو جاتے ہیں اور اگر آپ رو رہے ہیں تو آپ کو ہنسنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور ہنس رہے ہیں تو رونے کی ہدایت فرماتے ہیں۔ حالاں کہ رونے اور ہنسنے کے دو بالکل الگ الگ اسٹائل ہیں۔ کئی آدمی نہایت خوبصورتی سے رو سکتے ہیں مگر ہنستے وقت نہایت بھونڈے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر سنجیدہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خوبصورت رونا بھونڈی ہنسی میں بدل جائے اور میرا خیال ہے کہ اگر سنجیدہ لوگوں کی خواہشوں پر مسلسل عمل کیا جائے تو دنیا میں خوبصورتی سے کوئی رو ہی نہ سکے۔

سنجیدہ لوگوں کی پہچان نہایت آسان ہے۔ ان کا چہرہ زرد ہوتا ہے کبھی کبھی سیاہ بھی ہو جاتا ہے۔ مگر صرف اس وقت جب سنجیدگی اپنی آخری منزل میں داخل ہو رہی ہو یعنی آنکھوں میں ایک آخری ویرانی اور تھکن، جیسے باغ اجڑ گیا ہو اور صرف مالی باقی رہ گیا ہو۔

سر کے بال قریب قریب پرواز کر چکے ہوتے ہیں اور کنپٹیاں کے صرف چند ہی تنکے باقی رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ بال اور سنجیدگی میں ازلی بیر ہے۔ یہ دو تلواریں ایک میان میں کبھی نہیں رہ سکتیں۔ جس شخص کے سر پر بالوں کے گچھے ہوں، آپ اس کے قریب جا کر بلا تکلف لاؤڈ اسپیکر تک لگا سکتے ہیں مگر اڑے ہوئے بالوں والے کے قریب جا کر آپ اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ جناب "گڈ مارننگ" کیونکہ وہ فوراً اعتراض کرے گا کہ مارننگ کو گزرے ہوئے تو پورا ایک منٹ گزر چکا ہے۔

سنجیدہ لوگوں کی پشت پر صدیوں کا کوئی پُراسرار بوجھ ہوتا ہے۔ ہر صدی میں انسان جو بوجھ اپنے سر سے اتار کر پھینک دیتا ہے، یہ اسے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لاد لیتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذہنی کمر ہمیشہ جھکی رہتی ہے اور چونکہ ہم جھکی ہوئی کمر کا احترام کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اس لئے ہم ہر سنجیدہ آدمی کو دیکھتے ہی عادتاً یعنی احتراماً کرسی پیش کر دیتے ہیں اور ان کو کرسی پر بٹھاتے ہی پہلی کوشش یہ کرتے ہیں کہ آنکھ بچا کر بھاگ جائیں۔ لیکن سنجیدہ لوگوں کی آنکھ چونکہ متعین قسم کی آنکھ ہوتی ہے اور اس سے بچ کر کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ اس لئے ہم اپنے ہی حلق کا تھوک خود ہی نگلتے ہوئے عاجزی سے عرض کرتے ہیں۔ " جناب عالی! یہ گناہ گار حاضر ہے۔ جلدی جلدی سزا تجویز کیجئے۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے جانا ہے۔"

مشکل یہ ہے کہ سنجیدہ آدمی کے سامنے آتے ہی ہمیں اپنے سبھی جرم یاد آنے لگتے ہیں۔ جرم کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں، جیسے روز حشر قبروں سے ادھر ادھر مُردے اُٹھ اُٹھ کر آ رہے ہوں۔ فرض کیجئے آپ کسی محفل میں ایک حسین جھرمٹ میں گھرے ہوئے ہیں کلیلیں کر رہے ہیں کہ اچانک ایک سنجیدہ آدمی اپنے سر اندر داخل کرتا ہے۔ اس کا چہرہ بالکل "ہینڈز اپ" بنا ہوا ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتا مگر اس کے باوجود حسینائیں بھاگ جاتی ہیں اور آپ سنجیدہ آدمی کی جانب یوں دیکھتے ہیں جیسے کہنا چاہتے ہوں۔ ع

اے آمدنت باعث آبادی ما

یہ عجیب بات ہے کہ سنجیدہ آدمی ہمیشہ سماج کی ترقی چاہتا ہے مگر پھر بھی ان سے خوف آتا رہتا ہے۔ وہ جب بھی سڑکوں یا بازاروں میں چلتے ہیں تو خطرے کی گھنٹی کی طرح بجتے ہوئے چلتے ہیں۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیجئے کہ چاندنی رات نہایت دلآویز ہوتی ہے تو وہ فوراً چاندنی رات کے نقصانات گنوانا شروع کر دیں گے اور کچھ نہیں کہہ سکیں گے تو اتنی وارننگ ضرور دے دیں گے کہ چاندنی رات میں مت گھوما کیجئے اس سے زکام ہو جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے بھی اُصول و قوانین بنے ہوئے ہیں وہ سبھی سنجیدہ لوگوں نے بنائے ہیں۔ حتیٰ کہ سڑکوں پر " دائیں چلو، بائیں چلو" کے بورڈ بھی انھوں نے ہی لٹکائے ہیں

اگر کسی سنجیدہ آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ آج آپ صرف ایک بار بھی دائیں سے بجائے بائیں چلتے رہے ہیں، تو وہ آپ کے گھر میں مظاہرین لے کر پہنچ جائے گا۔ مظاہرین کے نعرے یہ ہوں گے۔

"بائیں چلنے والے ــ مردہ باد!"

دائیں چلو! دائیں چلو! ورنہ گدی چھوڑ دو۔

"جو بائیں چلتے ہیں ان کو دائیں چلا دو

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو!"

سنجیدہ آدمی ہر ملک، ہر طبقہ اور ہر گلی کوچہ میں مل جاتے ہیں۔ یہ لوگ کچھ اس تنظیم اور تناسب سے دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ایک لاکھ انسانوں کے پیچھے ایک سنجیدہ آدمی ضرور موجود ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی شک ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی پوشیدہ سسٹم کے ماتحت ایک جگہ سے دوسری جگہ سپلائی بھی ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے محلہ میں ایک مشہور و معروف سنجیدہ انسان سری سنجوتا نندجی بے ساختہ سورگ سدھار گئے۔ تو میں نے دیکھا کہ ایک ہی ہفتہ کے بعد ایک اور سنجیدہ آدمی ہمارے محلہ میں نمودار ہو گیا اور ایک مکان میں کرایہ دار بن کر رہنے لگا۔ اب آتے جاتے ہر آدمی کو یہ کہتے سنائی دینے لگا کہ دیکھو بھائی ہمارے محلہ میں بلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اس مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنا چاہیئے۔

یعنی بلیوں سے لے کر نیم کی چھال تک سبھی چیزوں کو وہ ایک مسئلہ بنا دیں گے اور کوشش کریں گے کہ اسے کسی فلسفہ یا منطق کے فارمولے کی بنا پر حل کیا جائے۔ مگر کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلیاں اپنی ضد سے باز نہیں آتیں اور وہ چوہوں پر جھپٹنا اپنا طبعی حق سمجھتی ہیں تو اس پر سنجیدہ لوگ نہایت غمگین ہو جاتے ہیں۔ وہ بلیوں کی کم عقلی پر آنسو بہاتے ہیں اور آخرکار ایک دن خود ہی ایک آنسو بن کر زندگی کی آنکھ سے ڈھلک جاتے ہیں، مگر بلیاں بدستور چوہوں پر جھپٹتی رہتی ہیں۔

سنجیدہ لوگوں میں بچے جوان اور بوڑھے سبھی شامل ہوتے ہیں۔ سنجیدگی کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ دو سال کا ایک ننھا سا بچہ بھی سنجیدگی کے عذاب میں مبتلا ہو جائے تو وہ بھی آپ کے گھر میں صف ماتم بن کر بچھا رہتا ہے۔ عالم شباب میں بھی کئی حسن اتنے سنجیدہ نکل آتے ہیں کہ

انھیں دیکھ کر فوراً خدا سے تعلق بگاڑ لینے کو جی چاہتا ہے۔ البتہ بوڑھوں کی سنجیدگی سب سے زیادہ کارآمد قسم کی ہوتی ہے۔ کیونکہ انھیں دیکھ کر اس حکیم حاذق یا ڈاکٹر کا خیال آتا ہے جس کی دوکان کے بورڈ پر یہ لکھا ہوتا ہے۔

"میرے سالہا سال کے تجربات سے فائدہ اُٹھائیے!"

چاہے وہ حکیم بچوں کی کھانسی تک دور نہ کر سکتا ہو۔ لیکن اس کا بورڈ پڑھ لینے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ بورڈ پڑھا، تھوڑا سا مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔

ویسے ذاتی طور پر میں سنجیدہ آدمیوں کے کچھ اتنا زیادہ خلاف نہیں ہوں۔ کیونکہ عام افواہ یہ ہے کہ وہ گائے ہیں جس کے سینگوں پر یہ دھرتی کھڑی ہے اور اگر ہمیں اس دھرتی پر رہنا ہے تو اس گائے کے ساتھ تعلقات بہت خوشگوار رکھنا پڑیں گے ورنہ اس نے سینگ بدل دیا تو زلزلہ آجائے گا اور نہ ہم باقی رہیں گے اور نہ یہ گائے۔ یہ بات میں نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کیونکہ ہمیں سنجیدہ آدمیوں کے چہرے کے نقوش متقضی ہونے پر تو اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمیں ان کے لہجے کے ٹھہراؤ ــــــ پر تو اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمیں ان کی رکی کی پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن ہم ان کی روح کی ساخت پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کی آنکھ کے چشمے خانے ہیں۔ وہ جیومیٹری اور الجبرا کے حساب سے بنائے گئے ہیں۔ وہ ناپ اور تول کا ایک ایسا پیمانہ ہیں جنھیں ہمارے بچے اور نانا سکولوں میں رٹا کرتے ہیں اور پھر عمر بھر انھیں پیمانوں سے اپنے آپ کو ناپتے رہتے ہیں۔ ہم جب روتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ زیادہ تعداد میں رو گئے ہیں اور جب ہنستے ہیں تو یہ نہیں سوچتے کہ ہنسی کا دائرہ اپنے قطر سے آگے بڑھ گیا ہے لہٰذا ہماری یہ حالت دیکھ کر سنجیدہ آدمی اپنے ہاتھ میں جیومیٹری کا بکس لئے ہوئے نمودار ہوتا ہے ــــــ اور "ہینڈز اَپ" بولتے ہوئے آرڈر دیتا ہے۔

رونا ــــ چھ انچ چوڑا۔ چار انچ لمبا

ہنسنا ــــــ پینتالیس درجہ کا زاویہ بناتے ہوئے ہنسی کا دائرہ کھینچو

نتیجہ

(۱)۔ بچو! سنجیدہ لوگوں کے اس سبق سے تمھیں کیا سبق ملا۔ کیا یہ سبق پڑھنے کے باوجود تم سنجیدہ آدمی بننا پسند کروگے ؟

(۲)۔ سنجیدہ لوگ دھرتی کا بوجھ ہوتے ہیں یا دھرتی ان پر بوجھ ہوتی ہے ۔۔۔ سنجیدگی سے اس کا موازنہ کرو۔

(۳)۔ کیا کنکوے اڑانا ایک سنجیدہ شغل ہے یا چھچھورا پن ؟

کنھیا لال کپور

یہ بھی ایک فن ہے

دو کو لڑانا

دو مرغوں یا بٹیروں کو لڑانا شغل ہو سکتا ہے فن نہیں البتہ دو آدمیوں کو لڑانا خاص کر جب کہ وہ ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوں، دانت کاٹی روٹی کھاتے ہوں یقیناً فن ہے۔ اس فن کے موجد تو نارد منی ہیں کیونکہ ان کا پسندیدہ شغل دیوتاؤں اور انسانوں کو آپس میں لڑانا ہے لیکن نارد منی کے علاوہ ایک اور ہستی کو بھی اس فن کا امام مانا جا سکتا ہے اور وہ ہے بی جمالو۔ یہ وہی جانی پہچانی بی جمالو ہے جو اکثر گھاس پھوس میں چنگاری ڈال کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے اور جب گھاس پھوس میں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں تو بغلیں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتی ہے۔

اس فن کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت ہے۔ جب تک ان تمام حربوں کا غور سے مطالعہ نہ کیا جائے جو نارد منی یا بی جمالو دو کو لڑانے میں استعمال کرتے ہیں کوئی شخص اس فن میں مشاقی حاصل نہیں کر سکتا۔ سب سے پہلا حربہ یہ ہے کہ جن دو اشخاص کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں انھیں علیحدہ علیحدہ یقین دلا دیں کہ آپ سے بڑھ کر ان دونوں کا دنیا میں کوئی بہی خواہ نہیں اور آپ جو کہہ رہے ہیں بڑے خلوص سے کہہ رہے ہیں۔ دوسرا حربہ یہ ہے کہ آپ ان دونوں کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑنے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں یاد رکھیں کہ ہر شخص کی دکھتی ہوئی رگ ضرور ہوتی ہے۔ کسی کی یہ کہ جس عزت کا وہ مستحق ہے اس سے اسے محروم رکھا جا رہا ہے کسی اور کی یہ کہ اس کے سب احباب احسان فراموش واقع ہوئے ہیں اور کسی کی یہ کہ لوگ اس سے بلا وجہ حسد کرتے ہیں۔ تیسرا حربہ ہے کہ جب وہ دونوں لڑنے پر آمیں تو آپ چپکے سے یہ کہہ کر کھسک جائیں کہ آپ کو یک لخت کوئی ضروری کام یاد آگیا ہے اس لئے آپ اجازت چاہتے ہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دو اشخاص کو لڑانے میں نارد جی یا بی جمالو کا ضرور ہاتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گھوش بابو اور گپتا بابو ایک دفتر میں کلرک ہیں، دونوں پکے دوست ہیں یعنی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسی دفتر میں بھٹا چاریہ بھی کام کرتا ہے کہ جو نارد منی کی نمائندگی کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ ایک دن بھٹا چاریہ گھوش بابو کے کمرے میں آتا ہے۔ کہتا ہے۔

"اپنا سمجھ کے ایک بات کہنا چاہتا ہوں بُرا تو نہیں مانوگے؟"

"نہیں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ شوق سے کہئے۔"

"پہلے یہ بتایئے کہ گپتا بابو سے کچھ نا چاقی تو نہیں ہوگئی؟"

"بالکل نہیں۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے تو پھر معاملہ کیا ہے؟"

"بات کیا ہے ذرا کھل کر کہیئے۔"

"کچھ نہیں کچھ نہیں میرا خیال ہے۔ مجھے خاموش ہی رہنا اچھا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ فعی بھٹا چاریہ خاموش ہو جاتا ہے۔ ادھر گھوش بابو سوچتا ہے کہ ضرور کوئی بات ہے اس لئے اصرار کرتا ہے۔

"بھٹا چاریہ بھی بتاؤ نا بات کیا ہے؟"

"بات ہے بھی اور کچھ بھی نہیں، میرا مطلب ہے کم از کم گپتا بابو....."

"ہاں ہاں گپتا بابو"

"نہیں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

اب گھوش بابو بھٹا چاریہ کو پرماتما کا واسطہ دے کر کہتا ہے کہ اسے وہ بات ضرور بتانا پڑے گی۔ ایک بار انکار کرنے کے بعد بھٹا چاریہ رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے۔ "ذرا گپتا سے بچ کر رہنا۔ وہ آپ کے خلاف صاحب کے کان بھر رہا ہے۔ پرسوں میں نے اسے یہ کہتے سنا کہ گھوش ہر روز پندرہ منٹ لیٹ آتا ہے اور کام کرنے کی بجائے سارا دن اخبار پڑھتا رہتا ہے اور ہاں لیکن میرا خیال ہے مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے۔"

"نہیں نہیں۔ رک کیوں گئے، اب بتانے لگے ہو تو چھپاتے کیوں ہو؟"

"یعنی تم دونوں میں خواہ مخواہ جھگڑا ہو جائے گا اور میں جھگڑے کو بالکل پسند نہیں کرتا۔"

"نہیں آپ کو ضرور بتانا پڑے گا۔"

"بتا تو دیتا ہوں لیکن یار اس سے یونہی جھگڑا نہ مول لے لینا۔"

"اچھا وہ بات بتایئے۔"

"ہاں تو وہ صاحب سے کہہ رہا تھا کہ آیندہ جب گھوش بابو لیٹ آیا تو میں آپ کو خبر کر دوں گا۔ بیٹھا چپ چاپ جس میں جنگ دی رکھ کر رخصت ہوتا ہے اور گھوش بابو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگتا ہے کہ یہ کیپٹ بابو تو دوست کے پردے میں دشمن نکلا۔

اب شامت اعمال سے ایک دن گھوش بابو دفتر کے لئے لیٹ ہو جاتا ہے۔ شاید اُسے بس نہیں ملی یا اس کی سائیکل پنکچر ہو گئی۔ ادھر صاحب کو کسی فائل کی جو گھوش بابو کے قبضے میں ہے ضرورت پڑ جاتی ہے۔ گھوش بابو کو اپنے کمرے میں نہ پاکر صاحب چپراسی سے کہتا ہے کہ جب وہ آئے اسے صاحب کے کمرے میں حاضر ہونے کے لئے کہا جائے۔

گھوش بابو جب آتا ہے تو صاحب اُسے سخت سست کہتے ہیں وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ معاملہ کیا ہے۔ صاحب کے دفتر سے نکل کر وہ سیدھا کیپٹ کے کمرے میں پہنچتا ہے۔

"آؤ بھئی گھوش بابو" کیپٹ مسکرا کر کہتا ہے۔

"رہنے دو یہ بناوٹی مسکراہٹیں مجھے آج پتہ چلا کہ تم مار آستین ہو۔"

"بات کیا ہے اتنے ناراض کیوں ہو رہے ہو؟"

"ناراض نہ ہوں تو اور کیا کروں یہ اچھی شرافت ہے۔ دوست بن کر پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہو۔"

"ارے بھائی کس نے چھرا گھونپا ہے؟"

"مجھے سب معلوم ہے شرم آنی چاہئے تمہیں۔"

خیر چند دنوں میں نوبت تو تو میں میں ہوتی ہے کہ دفتر کے تمام کلرک اکٹھے ہو جاتے ہیں آخر کچھ لوگ بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیتے ہیں۔ جب سب کلرک اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں

تو بیٹا چارہ یہ کہتے ہوئے سُنا جاتا ہے "کیا زمانہ آگیا ہے صاحب دوست ہی دوست کے درپئے آزار ہوگیا، اب کس پر اعتبار کیا جائے"

یہ تو تھا نارو منی کا کارنامہ اب ذرا بی جالو کی کارستانی ملاحظہ فرمائیے۔

بی جالو کتھا سن کر مندر سے چلی آرہی ہے کہ راستے میں اس کی ملاقات مالتی سے ہوتی ہے۔ مالتی کی شادی ہوئے سات آٹھ مہینے ہوئے ہیں۔ بی جالو مالتی پر ایک جھلملتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہتی ہے۔

"کتنی کمزور ہوگئی ہو تم مالتی۔ پہچانی بھی نہیں جاتیں"

"نہیں تو" مالتی حیران ہوتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

"اری نہیں، سچ کہہ رہی ہوں، تمھارا تو رنگ روپ ہی جیسے اڑ گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بہت کام کرنا پڑتا ہے"

"ہاں کام تو کافی کرتی ہوں"

"یہی بات ہے جب ہی کیوں ہوگیا تمھیں، معلوم ہوتا ہے جیٹھانی جی خوب کام کرواتی ہیں"

"بڑی جو ہوئیں"

"بڑے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ خود تو سارا دن سیر سپاٹا کرے اور تم داسیوں کی طرح کام کرو۔ تم گھر میں کیا آئیں اس کی تو پنشن لگ گئی"

"نہیں کام کاج میں وہ بھی ہاتھ بٹاتی ہیں"

"وہ کیا ہوا جو ذرا سبزی چھیل دی یا پھل کاٹ دیئے۔ یہ کام تھوڑا ہی ہے"

"پھر بھی بڑی بہو ٹھہری"

"بڑی بہو ہوا کرے لیکن کام اُسے آدھا ضرور کرنا چاہیئے۔ تمھارے سیدھے پن کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہی ہے"

"نہیں یہ بات تو نہیں"

"آپ تو اس کو موافق ہی نہیں بلکہ نقصان دہ سمجھتیں۔ میں نے تو سنا ہے دکان کا
دھندا تمہارا آگھر والا کر رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے سوچ رہا ہے ہوگا۔ کبھی تاش کھیل رہا ہے کبھی
... کبھی سینما دیکھ رہا ہے۔"

"گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے ماسی!"

"لیکن ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ آخر برابر کا حصہ دار ہے وہ کام کیوں نہ کرے، دیکھو میری مانو
بہت آگے مت جاؤ نہیں تو پچھتاؤ گی۔ تمہارا جیٹھ اور تمہاری جٹھانی دونوں بڑے چالاک
ہیں۔ تم دونوں ہو بھولے بھالے شرافت میں مارے جاؤ گے۔ دیکھو اپنا سمجھ کر کہہ رہی ہوں
ورنہ میری یہ عادت نہیں کہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑاؤں اچھا، رام رام۔"

بی جمالو پھوٹ کا بیج بونے کے بعد چلی جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد پھوٹ وہ رنگ لاتی ہے
... اور جٹھانی میں جوتیوں میں دال بٹنے لگتی ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ نارمتی ناوند اور بہو کو آپس میں کس طرح لڑاتے ہیں۔ راجیش اور بملا
ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں لیکن نارمتی کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ایک دن راجیش
کی غیر حاضری میں نارمتی ایک چھوٹے سے لڑکے کے ہاتھ راجیش کے نام ایک خط بھجواتے
ہیں۔ لڑکا یہ خط بملا کو دیتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتی ہے۔

"تمھیں کس نے بھیجا ہے؟"

"جی کملا دیوی نے۔"

"وہ کون ہے؟"

"جی وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے، ایم۔اے میں پڑھتی ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"جی میں اس کا نوکر ہوں۔"

"اس نے تمھیں یہ خط راجیش بابو کو دینے کے لئے کہا تھا۔"

"جی ہاں اور ساتھ ہی۔ کہا تھا کہ یہ خط کسی اور کے ہاتھ میں مت دینا۔"

"کیوں؟"

"جی مجھے کیا معلوم!"

"پھر یہ خط مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

آپ کو نہ دوں تو پھر مجھے آنا پڑے گا۔ آپ انھیں دے دیجیے گا۔"

لڑکے کے چلے جانے کے بعد نیلما سوچتی ہے کہ وہ خط پڑھے یا نہ پڑھے، کافی سوچ بچار کے بعد وہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے خط پڑھ لینا چاہئے۔ خط کو پڑھنے کے بعد اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے، کیونکہ یہ ایک نہایت جذباتی قسم کا پریم پتر ہے۔ شام کو جب راجیش بابو گھر لوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ شریمتی جی انگاروں پر لوٹ رہی ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں بات کیا ہے لیکن روٹھی رانی جواب تک نہیں دیتی آخر جب حد سے زیادہ اصرار کرتے ہیں تو بھنا کر کملا دیوی کا پریم پتر ان کے سامنے پٹک دیتی ہے۔ خط پڑھنے کے بعد راجیش بابو بڑی سنجیدگی سے کہتے ہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ میں کسی کملا دیوی کو نہیں جانتا۔ نیلما غصہ سے جواب دیتی ہے "مجھے بہکانے کی کوشش مت کیجئے" راجیش اپنی صفائی میں بار بار قسمیں کھاتا ہے لیکن نیلما کو یقین ہی نہیں آتا۔ وہ ایک ہی فقرہ دہرائے جاتی ہے "مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے" اس تہمت کی تاب نہ لاکر راجیش کبھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور عورتوں میں جتنی خامیاں ہوتی ہیں انھیں گنوانے لگتا ہے۔ یہ تکرار دو ایک گھنٹے رہتی ہے اور جب ختم ہوتی ہے تو دونوں منہ پھلائے سونے کے لئے اپنے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔

کبھی کبھی دو کو لڑانے میں بڑے شرارت آمیز حربے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ کیسے؟ یہ بھی سُن لیجئے۔ ہمسائے میں لڑکی کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ لڑکے والے لڑکی سے ملنے آتے ہیں بس لخت رام گوپال اپنی بیوی سے بلند آواز میں لڑنے لگتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ "اگر لڑکی میں نقص ہے تو تمھیں کیا، لڑکے کی قسمت پھوٹے گی۔ تم کیوں خواہ مخواہ دوسروں کی باتوں میں دخل دیتی ہو، ایک آنکھ سے کانی ہے تو کانی سہی۔ آخر اس کی شادی لڑکے سے تو ہو نہیں رہی اگر لڑکے والوں کو پسند ہے تو تمھیں کیا؟"

۳۰۰

دو ایک منٹ چپ رہنے کے بعد وہ پھر کہتا ہے۔" تم چپ رہو لڑکا اگر ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے تو ہوا کرے ہمیں کیا۔ اگر لڑکی والے جان بوجھ کر لڑکی کو اندھے کنوئیں میں دھکا دے رہے ہیں تو دیا کریں، ان کی لڑکی ہے جو چاہے سلوک کریں۔" تھوڑی اور دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے سُنا جاتا ہے۔" میں کیوں لڑکی والوں سے جا کر کہوں، مجھے کیا لینا دینا۔ اگر وہ اپنے لڑکے کی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو کیا کر سکتا ہوں؟"

جب یہ باتیں لڑکے اور لڑکی والے سنتے ہیں تو ایک دوسرے کی طرف گھور گھور کر دیکھتے کہتے ہیں" یہ ہم کیا سُن رہے ہیں:"

"تو اس کا مطلب ہے آپ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔"

"آپ تو کہتے تھے لڑکی میں کوئی نقص نہیں۔"

"آپ بھی تو کہتے تھے لڑکے میں کوئی نقص نہیں۔"

"دیکھئے یہ رشتہ نہیں ہوگا۔"

"آپ تشریف لے جائیے۔"

اور جب لڑکے والے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے لڑکی والوں کے گھر سے نکلتے ہیں رام گوپال سرگوشی کے انداز میں اپنی بیوی سے کہتا ہے۔" کیوں کیسا اُلّو بنایا دونوں کو۔"

دو کو لڑانا فن ضرور ہے لیکن خطرے سے خالی نہیں اس کے لئے بڑی مشق کی ضرورت۔ اگر تھوڑی سی چوک ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے جب آپ دو کو لڑانے کوشش کریں تو اس بات کا خیال رکھیں کہ [illegible] اوزا یا بی جمالو کی طرح خود صاف بچ کر نکل جائیو

حبیب اللہ جائسی منیجر شاسی پریس الہ آباد۔۳ سے
شائع کیا۔